علمی نگارشات

''علم ایک طاقت ہے اور طاقت سے شجاعت پیدا ہوتی ہے''

(ملفوظات جلد ۴ صفحہ ۳۶۱)

مصنفہ

خواجہ عبدالحمید انصاری

مہدی پٹنم، حیدرآباد دکن

الناشر

انصاری برادران حیدرآباد دکن

نام کتاب	:	علمی نگارشات
مصنف	:	خواجہ عبدالحمید انصاری حیدرآباد دکن
اشاعت اول (انڈیا)	:	2019ء
تعداد اشاعت	:	500
ناشر	:	انصاری برادران، حیدرآباد دکن، مہدی پٹنم، ضلع: حیدرآباد، تلنگانہ (انڈیا) 500028
زیر اہتمام	:	نظارت نشر و اشاعت قادیان
منظوری نمبر نظارت نشر و اشاعت	:	1197/14-08-2018
مطبع	:	پرنٹ ویل، امرتسر، پنجاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	جدھر خیال گیا	VII
2	پیش لفظ	VIII
3	کچھ مصنف کے بارہ میں	IX
4	تبصرہ	XII
5	مکتوب	XIV
6	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سِیاسی شَعور اور آپ کا عَدل واِنصاف	1
7	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلقِ عظیم	9
8	عِلم الکلام اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام	23
9	یقینِ کامل	36
10	حقوق اللہ اور حقوق العباد	57
11	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشاۃ ثانیہ	76
12	یُحی الدّین ویقیم الشریعۃ (حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)	98

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
125	سیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام (۱)	13
127	سیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام (۲)	14
129	سراپائے اقدسؑ	15
137	حضرت الحاج سیٹھ محمد معین الدین صاحب (چنتہ کنٹہ)	16
145	غلامی	17
160	اسلام میں لونڈی کی حیثیت اور مقام	18
174	اسلام میں عورت کا مقام	19
191	پردہ اور اِسلام	20
208	تُو تنہا داری	21
219	برکاتِ خلافت	22
223	خلافت کی برکات	23
232	خلافتِ راشدہ ہی اصل اسلام کی نمائندہ ہے	24
236	حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اُسلوبِ جہاد	25
240	رحمۃٌ لِّلعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم (۱)	26
245	رحمۃٌ لِّلعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم (۲)	27
250	تنظیم کی برکات	28
257	اسلام میں اجتماعیت کا تصور	29

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
266	طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ	30
271	حضرت نبیءکریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی	31
281	مسئلہ تعددِ ازدواج	32
291	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معمولات کے آئینہ میں	33
302	عُلَمَآءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ	34
316	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا	35
325	سیرت حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ	36
327	سات آسمان اور سات زمین سے کیا مُراد ہے؟	37
330	رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک	38
332	اطاعتِ والدین	39
334	تبلیغ اسلام اور خواتین کی ذمہ داریاں	40
336	وقت کی پابندی	41
338	سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	42
341	خطبہ حجۃ الوداع	43
346	اجتہاد فی الدین	44
349	تحریکِ جدید	45
353	تصویر اور اِسلام	46

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
356	قادیان کی حسین یادیں	47
364	وقت	48
368	فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ	49
373	عِلم	**50**
376	اخلاقِ حسنہ	51
379	اِسلام اور امنِ عالَم	52
382	رُسومات کے متعلق اسلامی تعلیم	53
385	احمدیت اور امنِ عالَم	54
408	حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ	55
415	حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ	56
426	عِلم دولت ہے	57
432	تبلیغ	58
436	تربیتِ اولاد	59
439	الفاظ کا صحیح استعمال	60
441	مکرم سید جہانگیر علی صاحب، فلک نما	61

❀❀❀

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جدھر خیال گیا!

دل کی طرح، زندگی کے موسم بھی بڑے نیارے ہوتے ہیں۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے، ساتھ ہی بارش بھی ہورہی ہے۔ یہ نیرنگیاں، یہ بوقلمونی، یہ جادونگاری، حیرت ناکیاں، خیالات کو کن کن نئے جہانوں کی سیر کرواتی ہیں؟ غالب نے کہا تھا۔

ہستی	کے	مت	فریب	میں	آجائیو اسدؔ
عالَم	تمام	حلقۂ	دامِ	خیال	ہے

مگر انہوں نے خیال کو ایک کلیہ میں ڈھال دیا تھا۔ ایک آفاقیت اُسے دے دی تھی۔
میرے مضامین کا یہ مجموعہ، ایک ایک نشست میں لکھا گیا ہے۔ اکثر اُن میں سے نامکمل تھے لیکن انہیں دوبارہ دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ یونہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ بعض مضامین، بچوں اور بچیوں کے دو دو، تین تین، چار چار منٹ کے تقریر بھی تھے، انھیں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔

والسلام

خواجہ عبدالحمید انصاری

حیدرآباد دکن، تلنگانہ، بھارت

پیش لفظ

محترم خواجہ عبدالحمید انصاری صاحب آف حیدرآباد دکن کی کتاب 'علمی نگارشات' خاکسار کے سامنے ہے۔ مَیں نے چیدہ چیدہ مضامین کا مطالعہ بھی کیا ہے۔محترم عبد الحمید انصاری صاحب اگرچہ کسی دینی اِدارہ کے طالبِ علم نہیں رہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے عظام کی کتب او خطابات کے مطالعہ نے اُن میں اچھی علمی صلاحیت پیدا کی ہے۔ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا ہے اُس پر اُن کی مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی موضوع سے انصاف کرتے ہوئے برمحل دلائل، فلسفیانہ نکات اور موزوں اشعار سے اپنے مضامین کو سنوارا ہے۔ ان مضامین کا مطالعہ خصوصاً نوجوانوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔اور ناصرات الاحمدیہ کیلئے بھی مختصر تقاریر جماعتی تقاریب میں پیش کرنے کیلئے مُمِدّ ومعاوِن ہوگا۔اگر یہ کہا جائے کہ بعض مضامین میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

محترم خواجہ عبدالحمید انصاری صاحب مرحوم کا ذاتی اور قریبی تعلق خاکسار سے ہمیشہ رہا ہے۔جب بھی خاکسار حیدرآباد جاتا یا وہ جلسہ سالانہ قادیان پر آتے تو اُن کے ساتھ علمی اور ادبی نشست رہتی۔ بڑے ہی نیک، خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔اُمید ہے اُنکی یہ علمی کاوِش اُن کیلئے اور اُن کی اولاد کیلئے صدقہء جاریہ کا موجب ہوگی۔ ؎

دُنیا میں یوں تو جلوہ نما تھے ہزاروں لوگ
تیرا جدا تھا رنگ، جہاں تک نظر گئی

محمد کریم الدین شاہدؔ
صدر قضاء بورڈ قادیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ   وَعَلٰی عَبۡدِہِ الۡمَسِیۡحِ الۡمَوۡعُوۡد

کچھ مصنف کے بارہ میں

میرے برادر حقیقی محترم خواجہ عبدالحمید انصاری صاحب مرحوم ولد مکرم خواجہ عبدالواجد انصاری صاحب مرحوم مورخہ 2 جنوری 1937ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ پیدائشی احمدی تھے۔ ہمارے والد صاحب مرحوم سہارنپور یوپی کے رہنے والے تھے۔ فوج میں ملازمت کرتے تھے اور اسی سلسلے میں حیدرآباد دکن آ گئے تھے۔ آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں بیعت کی اور سلسلہ عالیہ احمدیہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

ہماری والدہ محترمہ شہزادی بیگم صاحبہ مرحومہ کا تعلق افغانستان سے تھا آپ بھی اپنے والدین کے ساتھ حیدرآباد آئی تھیں۔ آپ نے شادی کے بعد بیعت کی۔ آپ اپنے خاندان میں اکیلی احمدی تھیں۔ میرے برادر مرحوم ہم پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ آپ کی شادی محمودہ بیگم صاحبہ مرحومہ بنت محترم سیٹھ محمد معین الدین صاحب مرحوم سابق امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد دکن سے ہوئی۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ آپ اپنی اولاد کے لیے ایک شفیق باپ تھے۔

آپ نے بچپن میں کچھ عرصہ قادیان میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ آپ کے استاد مولانا حکیم محمد دین صاحب درویش مرحوم تھے۔ آپ اپنے استاد کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اللہ

تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی۔ آپکی طبیعت میں ٹھہراؤ اور سکون تھا، آپ کے انداز گفتگو میں محبت، نرمی اور پیار بھرا لہجہ پایا جاتا تھا۔ آپ کے اِس انداز سے لوگ بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ آپ کے مشورے عملی تجربات کے حامل اور مفید ہوتے تھے۔ جن میں اصلاح کا پہلو شامل رہتا تھا۔ آپ لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا رویہ رکھتے تھے۔

آپ رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفاء رکھی تھی۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کے ہاتھ سے شفاء ہوئی تھی۔ آپ نمازوں کے سخت پابند اور بہت دعا گو انسان تھے۔ آپ تحقیقی صلاحیت کے حامل تھے۔ آپ کا جماعتی کتب کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔

آپکو حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء سلسلہ عالیہ احمدیہ کے بہت سے ارشادات حفظ تھے۔ آپ ایک لمبے عرصہ تک احباب جماعت کو قرآنی تعلیمات کا درس دیتے رہے اور آخری بیماری کے ایام تک بھی درس کا اہتمام اپنے گھر پر ہی کرتے رہے۔ آپ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے آپ کی کوشش رہتی کہ جمعہ کے روز مسجد میں وقت سے پہلے پہنچ جائیں۔

آپکے روابط غیر از جماعت لوگوں میں بہت وسیع تھے۔ اور آپ ہمیشہ ان لوگوں کو تبلیغ کرتے اور دلائل کے ذریعے ان لوگوں کو جماعتی عقائد و تعلیمات کا پیغام پہنچاتے۔ آپ اُردو ادب اور شاعری سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ اُردو کے علاوہ انگریزی اور عربی زبان بھی جانتے تھے۔

آپ طویل عرصہ تک قطر اور سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم رہے اور وہاں بھی نظام جماعت سے جڑے رہے اور جماعتی خدمات بجالاتے رہے، اسی دوران آپکو

حج بیت اللہ کی سعادت ملی۔آپ سعودی عرب سے شائع ہونے والے رسالہ الضحی کے ایڈیٹر تھے۔آپ کو جماعتی کتب و رسائل کے مطالعہ کا اس حد تک شوق تھا کہ اپنے گھر میں اخبار الفضل، ہفت روزہ اخبار بدر اور کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور دیگر کتب سلسلہ عالیہ احمدیہ پر مشتمل ایک لائبریری قائم کردی۔

آپ موصی تھے اور صوم وصلوٰۃ و احکام دینیہ پر مضبوطی سے قائم تھے۔اپنے چندہ جات باقاعدگی کے ساتھ باشرح ادا کرتے تھے۔آخری ایام زندگی میں چندروزہ علالت کی بعد مورخہ 10 نومبر 2016ء کو اپنے مولا حقیقی سے جا ملے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے اور آپ کے درجات بلند فرمائے۔آمین۔اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو بھی اپنے والد صاحب کی نیکیاں اپنانے اور آپس میں بھی محبت اور پیار سے رہنے نیز خلافت احمدیہ سے ہمیشہ وابستہ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

خاکسار

ڈاکٹر خواجہ سعید احمد انصاری

حیدرآباد دکن

تبصرہ

حیدرآباددکن کی ایک زبان وہ ہے جو روزمرّہ کی بول چال میں استعمال ہوتی ہے۔ اُس کا ایک الگ مزہ ہے۔لیکن اس پر شمالی ہند کے لوگ ہنستے ہیں۔مگر جو علمی زبان ہے اور ادبی مجالس کی تقریروں اور تصانیف کی تحریروں میں استعمال ہوتی ہے اُس کی چاشنی اور لطافت میں ایسی انفرادیت ہے کہ تقریر اور تحریر خود بولتی ہے کہ یہ اردو زبان حیدرآباددکن کی ہے۔

مکرم خواجہ عبدالحمید انصاریؔ صاحب مرحوم، حیدرآباد کی ایک ایسے علم دوست شخصیت تھے جنہوں نے گویا اُردو ادب کے گہوارہ میں پرورش پائی اور پھر امام الزّمان حضرت مسیح موعودعلیہ السلام اور خلفائے عظام کے علم کلام نے اُن کے زرخیز ذہن کو خوب روشن کیا۔

خاکسار نے مختلف جماعتی جلسوں میں اُن کی تقاریر بھی سنی ہیں اور جو مضامین لکھتے رہے اور اخبار بدر کی زینت بنتے رہے، وہ بھی مطالعہ میں آتے رہے۔اور اب موصوف کے ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا جو مجموعہ ''علمی نگارشات'' کے نام سے زیورطبع سے آراستہ ہونے کیلئے تیار ہے یہ بھی بہت خوب ہے۔

جہاں موصوف نے سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سیرت حضرت مسیح موعودعلیہ السلام اور سیرت خلفائے عظام پر لکھا ہے وہاں حقوق اللہ اور اور حقوق العباد، خلافت کی برکات، اسلام میں عورتوں کے حقوق، اسلام میں غلام اور لونڈی کی حیثیت اور تنظیم کی برکات جیسے (56) عناوین پر مختصر مگر مؤثر اور دلنشین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

سکول وکالج کے طلباء وطالبات سے لیکر علمی ذوق رکھنے والوں کیلئے بھی یقیناً یہ مجموعہ

سُودمند ثابت ہوگا۔انشاءاللہ!

اللہ تعالیٰ مرحوم کی اس علمی اور دینی خدمت کی بہترین جزاء عطا فرمائے اور ان کی اولاد کو بھی مرحوم کی نیکیوں کو جاری رکھنے کی توفیق بخشے۔آمین!

خاکسار

دستخط

(محمد انعام غوری)

ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ قادیان

مکتوب

بخدمت محترم خواجہ واصف احمد انصاری صاحب لندن، یو۔ کے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بخیر وعافیت رکھے۔ آمین۔

آپ کے مکتوب گرامی کے مطابق خاکسار نے محترم خواجہ عبدالحمید انصاری صاحب کی تصنیف کردہ کتاب بنام ''علمی نگارشات'' کا مطالعہ کرلیا ہے۔ ماشاء اللہ یہ تصنیف بہت سے علمی اور معیاری مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہر مضمون اپنے اندر جداگانہ اثر رکھتا ہے۔ ان مضامین میں یہ خوبی ہے کہ ہر مضمون تربیت اور نفع رسانی سے مزین ہے۔ مضامین اور تحریر کا یہ تنوع ایک حسین گلدستہ ہے۔ جس میں رنگارنگ خوشبودار پھول نہایت ہی سلیقے سے سجائے گئے ہیں۔

موصوف نے گھروں کے امن وسکون اورخوشیوں کو برباد کرنے والی بدعات اور معاشرتی خرابیوں کونمایاں کر کے قرآن، حدیث اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء کرام کی تحریرات اورفرمودات کی روشنی میں ان سے بچنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح عصر حاضر میں اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا بھی مدلل جواب دیا گیا ہے۔ جیسے اسلام میں لونڈی کی حیثیت اور مقام، پردہ، مسئلہ تعدّدِ ازدواج، رسومات کے متعلق اسلامی تعلیمات بڑے عمدہ رنگ میں بیان کی گئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جامع اور مدلل مضامین بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کیلئے بہت مفید ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ کیونکہ آپ ہی کی توجہ وکوششوں کی بدولت مصنف کا فیض بہتوں تک پہنچے گا۔ اوران شاء اللہ تعالیٰ ان کیلئے بہت ہی مفید اور نفع رسائی ثابت ہوگا۔

والسلام

خاکسار

دستخط (محمد حمید کوثر)

ناظر دعوت اللہ مرکزیہ شمالی ہند

(1)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سِیاسی شَعور اور آپ کا عدل وِ انصاف

ہمارے پیارے آقا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تدوین اور تحریری شکل میں جمع کا کام آپ کے وصال کے تقریباً اسی پچاسی سال بعد شروع کیا گیا تھا اور آٹھویں صدی ہجری تک جاری رہا تھا۔ اِس کی ایک الگ تاریخ ہے۔ لیکن حالات وواقعات اور آپ کے سیاسی کردار کے بارہ میں جو کام ضبط میں لایا گیا، اور جسے ہم تاریخ سے تعبیر کرتے ہیں، وہ آپ کی وفات کے تقریباً پونے دوسوسال بعد شروع ہوا۔ احادیث کے جمع کرنے میں، ان کی چھان پھٹک اور جانچ پڑتال اور اِن کے صحیح یا موضوع ہونے کا فیصلہ دِقّتِ نظری کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس لئے محدثین نے ایسے علوم مثلاً علمِ روایت، علمِ درایت اور علم اَسماء الرّجال وغیرہ ایجاد کئے جن کی مدد سے انہوں نے خودبھی، اور آنے والی صدیوں میں تمام محدثین اور محققین نے بہت بڑے بڑے کام لئے اور فائدہ اٹھایا۔ احادیث کے جمع کرنے میں جس احتیاط، کاوِش اور جانفشانی کوملحوظ رکھا گیا، وہ سعی وکاوش مؤرخین کے پیشِ نظر نہیں رہی۔ وہ مؤرخین مسلمان ہی تھے۔ انہوں نے جس سہل طریق سے تاریخی واقعات کو منضبط کرنے کا کام شروع کیا وہ بے شمار نقائص سے پُر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیھم اجمعین کا جو کردار ترتیبِ تاریخ سے پہلے یعنی ابتدائے اسلام سے دوسوسالوں تک ہمارے سامنے ہے۔ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین تربیت اور بے داغ کردار وعمل کا غماز ہے۔

(مذکورہ دو سو سال تک صحابہ رضوان اللہ علیہم تو زندہ نہیں رہے تھے، لیکن ان کے کارنامے، ان کے اپنی نسلوں کی تربیت کے کام، ان کا اخلاق و کردار اور ان کے ایمان کی پختگی کے نظارے ہم واقعات میں دیکھ سکتے ہیں)۔

مدینہ منورہ ہجرت کے چھ ماہ بعد سے جو سرایہ اور مغازی پیش ہوئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی زِیرکی اور سیاسی بصیرت پر دال ہیں۔ ناسمجھ مؤرخین نے، انہیں لوٹ مار، اور مال و دولت کے لالچ سے تعبیر کیا ہے۔ اور انہی حوالوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مستشرقین مغرب نے انہیں ڈاکہ زنی کا عنوان دے دیا۔ اُس وقت کے حالات اور اطراف کے دیہاتوں اور شہروں میں رونما ہونے والے واقعات پرغور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ہجرت کر جانے سے کفارِ مکہ کے جذبہء اشتعال اور انتقام کو کس حد تک بڑھاوا ملا تو بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ مغربی مستشرقین نے جو کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لکھی ہیں۔ ان پر اکثر علمائے اسلام بڑا تکیہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور کردار کو خوب روشن کیا ہے اور اس طرح اسلام کی خدمت کی ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کا اولین مقصد اسلام دشمنی میں ہمارے پیارے رسول اور ان کے اصحاب کی کردار کُشی اور مسلمانوں کو ایک راہزن ٹولہ ثابت کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ گو اِس میں اسلام کے ابتدائی مؤرخین کا بھی قصور ہے جنہوں نے حزم و احتیاط کا وہ معیار پیش نظر نہیں رکھا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول کی شخصیتوں کے معیار کے مطابق ہوتا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی جو اندرونی سیاست تھی اور اُس سیاست کے پیچھے ان کی قبائلی فطرت، سینکڑوں سالوں کے رسم و رواج اور شرک کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے دوری اور بتوں سے شدید محبت،

لگاؤ اور انحصار کا جو رویہ تھا، وہ سب پیشِ نظر رکھا جانا چاہئے تھا۔ ساتھ ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار و عمل اور آپ کے پاکیزہ، خیالات اور انسانیت کے فروغ کے لئے آپ کے دل میں جو منصوبے جوش مار رہے تھے، آپ کا عدل و اِنصاف اور آپ کے امین و صدیق ہونے کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے تھا۔ قبل از نبوت آپ کا کردار ایک عظیم انسان کا کردار ہے کہ وہ اس دنیا کا آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ دنیا جو آپ کے اطراف و اکناف پھیلی ہوئی تھی، پھر اعلانِ نبوت کے بعد تیرہ سال کا وہ عرصہ جو آپ نے مکہ مکرمہ میں گزارا اور جس میں جوش و انتقام اور انسانیت کی تذلیل کا کوئی طور آپ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، آپ کے بے داغ اور پاکیزہ کردار کا بین ثبوت ہے۔ مدینہ پہونچ جانے کے بعد حالات ہی کچھ اور ہو چکے تھے۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مدینہ میں مسلمانوں کو پورا پورا تحفظ حاصل ہو اور انہیں پھر وہ دن نہ دیکھنے پڑیں جو انہوں نے تیرہ سالوں میں مکہ میں تجربہ اور مشاہدہ کئے تھے۔ اس کے علاوہ اب یہاں مسلمانوں کی ایک الگ تشخیص قائم کرنی تھی۔ مدینہ وارد ہوتے ہی آپ نے جو معاہدے یہودیوں اور مشرکوں کے ساتھ کئے، وہ آپ کی سیاسی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ آپ کی سیاسی عظمت کو چار چاند لگا دیتا ہے کہ وہاں بڑے بڑے صحابہ کی سوچ اور ان کے ذہن بھی آپ کی فکر و ارادے سے بہت نیچے تھے۔

گزشتہ بارہ تیرہ سو سالوں میں مسلمانوں نے مختلف بحثوں میں زندگیاں صرف کر دیں۔ زندگی کیا ہے۔ انسان کا دنیا کے ساتھ ربط باہمی، خواہشاتِ زندگی، وجودِ باری تعالیٰ، وحدت وجودی، وجود، نفی وجود، خلقِ قرآن، مختار و مجبور، حور و غلمان اور نعماء جنت وغیرہ مسائل پر منطق و فلسفہ کے دریا بہا دئے۔ عقل و حکمت کی یہ استعدادیں جو بنو عباس کے دور سے آج تک مصروفِ عمل ہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات آپ کے اُسوۂ اور آپ کے اخلاقِ

فاضلہ کے افادی پہلوؤں پر صرف ہوئی ہوتیں تو آج دنیا کا نقشہ ہی اور ہوتا۔ مغرب بھی مشرق سے پیچھے نہیں رہا، سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک انہوں نے بھی بے معنی مسائل کے حل کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں داؤ پر لگا دیں۔ علم اپنی جگہ حیران و پریشان آج بھی مشرقیوں اور مغربیوں کا منہ تکے جا رہا ہے کہ میری ذات کو جو انسانی عظمت و رفعت کا موجب ہونی چاہئے تھی۔ کن لایعنی عُقدوں میں اُلجھ کر تنہا اور لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ انسان اور اس کے خالق کے درمیان باہمی مضبوط اور اٹوٹ ربط میں مضمر ہے۔ انسانی عقل و شعور خواہ کس قدر ترقی کر جائیں۔ غیب کے علم اور سہارے کے وہ ہمیشہ محتاج رہیں گے۔ غیب کا علم، عالم الغیب ہی کے ذریعہ سے میسر آ سکتا ہے۔ اس وقت اِسلام اور صرف اِسلام ایک ایسا مذہب اور ذریعہ ہے جس نے اس رابطے پر سب سے زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کے بغیر محض عقل و فہم اور ادراک و شعور کے بل پر ترقی اور کامرانی کی توقع رکھنے کو ہمیشہ مسترد کیا ہے۔ ابتدائے اسلام کا زریں اور دور مذکورہ رابطہء باہمی کا بین ثبوت ہے۔ اور ہم اِسے زریں دور اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسانیت کے شرف و مجد اور احترام انسانیت کے جذبات سے تابندہ تھا۔ ان کا علم محض علمی موشگافیوں کا نام نہیں تھا بلکہ وہ عمل سے مشروط تھا۔ وحدانیت کے عقیدے کی مثبت قوت ان کے ایمان کا خصوصی عنصر تھی اور شرک کی ہر قسم کی نفی اُس کا اِدّعا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ وارد ہوتے ہی جو معاہدے یہودیوں اور مشرکوں کے ساتھ کئے، ان میں تمام اقتدارِ اعلیٰ حضور کے ہاتھ میں تھا۔ جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے مدینہ کا جو وسطی حصہ تھا وہیں مسجد نبوی تعمیر ہوئی تھی۔ اور اسی میں حضور کے رہائشی کمرے تھے۔ جنوب میں گنجان باغ تھے اور جنوب مشرق میں قبا اور عوالی کی بستیاں تھیں۔ اور ان کے گھنے باغات تھے۔ مشرق میں قبا سے احد تک یہودی محلے تھے۔ جو شرقاً غرباً پھیلے ہوئے تھے۔

جنوب مغرب میں بھی آبادیوں اور باغوں کا چھدرا سلسلہ تھا۔قدیم فصیل مدینہ کے باب الشافی کے پاس بنوساعدہ رہتے تھے اور ان سے آگے جبلِ سلع پر بنوحرام کی آبادی تھی۔شمالِ مغرب میں وادی العقیق کے کنارے بئر اومہ تک کثرت سے باغوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔جنوب میں بلند پہاڑیاں تھیں جو دور تک وسیع ہوگئی تھیں۔وادیوں اور گھاٹیوں میں سے جو راستہ گزرتا تھا وہ دُشوار گزار اور کٹھن تھا۔مغرب اور جنوب میں لاوے کے پتھریلے اور چٹیل میدان تھے جو فوجوں کے قیام اور نقل و حرکت میں سخت مزاحم تھے۔صرف شمال کی جانب سے راستہ کھلا تھا۔چنانچہ بدر اور اُحد کی جنگوں کیلئے قریش اسی سمت سے حملہ آور ہوئے تھے۔مدینہ کے محلِ وقوع اور اس کی ترتیب سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری تھا کہ تمام آبادی کو، بشمول یہود ومشرکین، ایک نظم میں پرو دیا جائے۔حضور نے یہ کارنامہ یوں انجام دیا کہ معاہدہ کے ذریعہ ساری آبادی کو باوجود ان کے مذہبی اور تمدنی افتراق کے، ایک سِلک میں پُرو دیا۔یہ بھی آپ کی سوجھ بوجھ کا کمال ہے کہ آپ نے بالکل اجنبی ہوتے ہوئے چند ہی مہینوں میں متضاد عناصر کو ایک سیاسی وحدت اور اکائی بنا دیا۔سیاسی وحدت کے اس تحریری دستور میں واضح طور پر تمام عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اختیارات، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں دے دئے گئے تھے۔اور یہ تمام نوشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت کی اصولی روح سے آراستہ اور لبریز تھا۔اس تحریر میں یہ منوالیا گیا تھا کہ عربی قبائل میں جو مشرک اور یہود شامل ہوں۔وہ مسلمانوں کے تابع اور صورت جنگ میں ان کے معاون ہوں گے۔وہ قریشِ مکہ کے جان و مال کو نہ کوئی امان دیں گے اور نہ مسلمانوں کی راہ میں اُس وقت کوئی رکاوٹ پیدا کریں گے۔جبکہ وہ قریشِ مکہ پر حملہ آور ہوں۔اِس منشور کی ایک شق یہ بھی تھی کہ کوئی بھی جنگ سب کے لئے جنگ ہوگی۔فوجی خدمت لازمی اور جبری ہوگی اور جملہ حریف اپنے اپنے حصہ کے مصارفِ جنگ خود

برداشت کریں گے۔ یہودیوں کے ساتھ یہ امر طے پا گیا تھا کہ وہ اُن سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں گے اور اُن سب سے صلح کے پابند ہوں گے جن سے مسلمان صلح کریں گے۔ اگر مسلمانوں پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے اور اگر کوئی یہودیوں پر حملہ کرے گا تو مسلمان یہودیوں کے مددگار رہوں گے۔ اِس دستور سے یہ بات وضاحت سے ثابت ہو جاتی ہے کہ حضور کو قریش مکہ کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا اور آپ نے اسی کے تدارک کے لئے مناسب اور ضروری پیش بندیاں کر لی تھیں۔ ایک نہایت اہم اقدام جو آپ نے کیا وہ مدینہ کو حرم کا درجہ دینا تھا یعنی اِسے امن کا شہر قرار دلوایا۔ اِس اقدام کا منشاء یہ تھا کہ مدینہ کے پورے ماحول کو تقدس کا درجہ حاصل رہے اور اس کا احترام ہر اہلِ مدینہ پر فرض قرار پائے۔ سیاسی مصلحت یہ تھی کہ جس طرح قریش ایک حرم میں محفوظ تھے اسی طرح مدینہ کو بھی دوسرے حرم کی نسبت سے تحفظ حاصل ہو جائے۔ اہلِ مکہ کے لئے یہ چیلنج تھا کہ اگر تم نے اہلِ مدینہ کے احترام کو توڑا تو تم بھی اپنے حرم میں محفوظ نہیں رہ سکو گے۔ پھر آپ نے کئی بار بحرِ احمر کے ساحلی علاقے کا دورہ کیا۔ آپ سب سے پہلے وُدّان کے مقام پر گئے جو مکہ کے راستے پر ابوا سے صرف سات میل کی دوری پر واقع تھا۔ وہاں بنی حمزہ سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا۔ پھر ینبوع کے اطراف میں بسے قبائل سے بھی معاہدانہ تعلقات قائم کر لئے۔ سن ۱۰ ہجری میں جہینہ کا تعاون بھی آپ کو حاصل ہو گیا۔ ۰۲ سنہ ہجری کے اوائل میں بنوضمرہ، بنوزرعہ اور بنوالربعہ کا۔ سن ۰۲ ہجری کے اواخر میں بنو مدلج کا تعاون بھی آپ کو مل گیا بعض قبائل کے ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدے طے پا گئے اور بعض کے ساتھ غیر جانبداری کی شرط پر معاہدے ہوئے۔ اِن معاہدوں سے جہاں سیاسی طور پر اہلِ مدینہ طاقتور ہو گئے۔ وہیں اسلامی تبلیغ کے راستے بھی کھل گئے۔ یہ سب تو تھیں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاعی تدبیریں، ان کے مقابلے

میں مشرکین مکہ کی طرف سے کیا اقدامات کئے گئے۔ اور ان کا سیلِ غضب کس سُرعت سے اپنے راستے بناتا رہا اور کس کس طرح انہوں نے اپنے جارحانہ عزائم کا بار بار اور مسلسل اظہار کیا، اس کا ثبوت وہ تین بڑی جنگیں ہیں جو مدینہ یا اس کے قرب و جوار میں لڑی گئیں، یعنی بدر، اُحد اور خندق۔ بیعتِ عقبٰی ثانیہ کے فوری بعد جب مدینہ سے آنے والے زائرین اپنے شہر روانہ ہوئے اور ان کی مسلمانوں کے ساتھ کسی خفیہ معاہدے کی بات کُھل گئی تو فوراً ان کی گرفتاری کے لئے آدمی بھجوائے گئے جنہوں نے حضرت سعد بن عُبادہ اور منذر بن عمرو کو پکڑ کے اپنے سرداروں کے آگے پیش کر دیا۔

حفاظتی دستوں کا گشت جو مدینہ وارد ہونے کے ساتھ چھ ماہ بعد شروع کیا گیا وہ اس لئے بھی ضروری سمجھا گیا تھا کہ مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد بھی، کفارِ مکہ کو جب بھی موقعہ ملا وہ مہاجرین کے تعاقب سے باز نہ آئے۔ مکہ میں رہائش کے وقت کفار کے ظلم سے تنگ آ کر جب بعض مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے تھے، تو اہلِ مکہ نے ان کے تعاقب کے لئے اپنے خصوصی آدمی پیچھے دوڑائے تھے۔ اہلِ مکہ کا طریق تھا کہ وہ مدینہ کے یہود اور مشرکین و منافقین سے ساز باز رکھتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف انہیں انگیخت کرتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اہلِ مکہ گاہے گاہے اپنے مدینہ حملہ آور ہونے کی جھوٹی افواہیں اُڑاتے رہتے تھے۔ اِن حالات میں یہ ضروری تھا کہ مدینہ میں فوجی گشتی دستوں کا انتظام کیا جاتا۔ مؤرخین اور مستشرقین کا یہ کہنا اور سمجھنا کہ مدینہ پہنچتے ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب، اہلِ مکہ سے انتقام لینے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ سراسر غلط ہے۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مہاجرین نے مدینہ پہنچتے ہی اہلِ مکہ سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن اپنے مستحکم ہو جانے تک اُسے ملتوی کر دیا۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ بیعتِ عقبٰی ثانیہ میں اہلِ مدینہ نے

اسلام کی خاطر ہر قوم سے لڑنے کا عہد کیا تھا۔ حالانکہ وہ عہد دفاعی تھا نہ کہ جارحانہ۔ ہماری دلیل کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ بدر کے معرکہ سے قبل وادیٔ ذفران پہنچ کر آپ نے جو مشاورت طلب فرمائی، اُس میں بار بار احباب سے مشورہ مانگا۔ مہاجرین نے اپنا خلوص اور اپنا تعاون سامنے رکھ دیا۔ لیکن پھر بھی آپ اپنی بات دہراتے اور مشورہ طلب فرماتے تھے۔ اہلِ مدینہ یعنی انصار نے آپ کا عندیہ جان لیا اور کہا کہ حضور کا بار بار مشورہ طلب فرمانا شائد ہم سے متعلق ہے اور وہ اس لئے ہے کہ ہم نے بیعتِ عقبٰی میں یہ عہد کیا تھا کہ اگر کوئی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو اور مدینہ میں گھس آنے کی کوشش کرے تو ہم حضور کا ساتھ دیں گے اور دشمنوں کیلئے ہماری تلوار، نیام سے باہر ہوگی۔ حضور نے جب یہ اشارہ دیا کہ ہاں! میرا انتخاطب آپ سے ہے۔ تو انہوں نے اپنے اُس عزمِ مصمم کا اظہار کیا تھا کہ ہم حضور کے آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی، اور دائیں بھی اور بائیں بھی اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکے گا جب تک کہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے۔

قارئین نے بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ اُس وقت تک بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کے عہد کا پاس تھا اور آپ انہیں جنگ میں شامل نہیں سمجھتے تھے اور اپنی طرف سے اُن پر دباؤ ڈالنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ یہ تھا اُس نبی معصوم واُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل۔ کیا آپ نے غزوہءِ خیبر کے وقت نہیں دیکھا کہ یہودیوں کا ایک گلہ بان جو قلعہ سے باہر تھا، مسلمان ہو گیا تو حضور نے اسے حکم دیا کہ وہ ساری بکریاں قلعہ کے دروازے کی طرف ہانک دے تا کہ یہودی انہیں قلعہ کے اندر کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ وہ تو چند بکریوں کا ریوڑ تھا اور بہت زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ یہاں گفتگو اُس نبی عظیم کے خُلقِ عظیم اور عدل و اِنصاف کا دامن ہمیشہ تھامے رہنے کی ہے۔ خواہ موقعہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو۔

(2)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلقِ عظیم

خُلق انسانیت کا جوہر ایک ایسا تعمیری حربہ ہے، جو تمدن کے تمام شعبوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔تمدن کی کوئی بھی شق اس سے بے اعتنائی برت کر تعمیر کے میدان میں کارگر نہیں ہوسکتی۔کسی بھی شخصیت کو انسانوں کے لئے مایہءراحت بنانے میں خُلق یا اخلاق کا غلبہ ہی ایک ذریعہ ہے۔خُلق یا اخلاق سے معرا کوئی بھی شخصیت انسانوں کے معیار پر قدآور نہیں قرار دی جاسکتی۔اقوامِ عالم نے جن محسنوں کو اپنی تاریخ یا ذہن کے گوشوں میں محفوظ رکھا ہے وہ اپنے اخلاق ہی کی وجہ سے معروف ہیں۔سکندر اگرچہ ایک عظیم الشان فاتح تھا، جس کے ساتھ بہت سی خونریزیاں اور حق تلفیاں وابستہ ہیں، لیکن اہلِ یونان کے لئے وہ ایک عظیم محسن تھا، کیونکہ اُس نے اپنے وطن سے پیار کرکے اُس کے غلبہ اور اقتدار کو دنیا پر جاری کرنے کی سعی کی اور اس طرح ایک عظیم خُلق یعنی حب الوطنی کا ثبوت دیا۔لیکن محسنانِ عالم کی اِس فہرست میں انبیاءِ کرام کا کردار ایک الگ اور بسیط باب ہے۔انبیاءِ کرام کے ذریعہ جس خُلق یا اخلاق کا اظہار ہوا، وہ محض تعمیری تھے، تخریب سے (اگر اُنہیں تخریب قرار دیا جائے) اُن کا صرف اس قدر علاقہ تھا کہ انہوں نے دشمنِ انسانیت عقائد واعمال اور توہمات کی مسماری میں سرگرم حصہ لیا۔انبیاءِ کرام کے اِن واضح اور روشن تعمیری پہلوؤں کی درجہ بندی کی جائے تو مختلف انبیاء مختلف درجوں سے حصہ لیں گے، لیکن میرے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اِس جدول میں سرِ فہرست، نمایاں اور روشن ترین ہوگا۔آپ نے تمام انبیاء کے مقابلہ میں ایک خاص الخاص

خُلقِ عظیم واعلیٰ سے حصہ پایا ہے۔ بلکہ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ خُلق کی درجہ بندی میں خُلقِ عظیم و اعلیٰ کا کوئی معیار قرار دیا جائے تو اُس کی مستحق صرف اور صرف میرے محبوب اور میرے محسن آقا (فداہ نفسی) ہی کی ذات بابرکات ہوسکتی ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی شخصیت گزری ہے، جس نے خُلقِ عظیم واعلیٰ سے حصہ لیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اُس کی نظیر اگر تلاش کی جائے تو اُس کے خدام کی فہرست میں تو مل سکتی ہے۔ مگر اُن سے باہر نہیں۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے خُلق یا اخلاق کی یہ تعریف نہیں ہے کہ بس نرمی برتی جائے، عفو اور درگزر سے کام لیا جائے، سزا دہی اور انتقام سے نفرت ہو اور ہر قسم کی انفعالی قوتوں کو جمع کرنے میں ہی فخر محسوس کیا جائے۔ اور نہ ہی اسلامی تعلیمات کی رو سے غصہ، انتقام، نفرت اور سزا وغیرہ معروف جذبات، بد خُلقی میں شامل ہیں۔ اسلام نے جن اخلاق کو پیش کیا اُس کی تعریف یہ ہے کہ ہر طبعی جذبے کو عقل کے ماتحت کیا جائے اور موقعہ بینی و محل شناسی کے لحاظ سے اُسے بروئے کار لایا جائے۔

میرے پیارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ نفسی) کی زندگی کا ایک ایک پہلو بلکہ ہر ایک لمحہ اپنی رحمت، اپنی انسانیت، اپنی حکمت بارانی، اپنی صلہ رحمی، اپنے عفو و درگزر، اپنے جذبہء احسان و شکر، اپنی امانت اور اپنی حلاوت ورأفت کے لئے بے مثال اور لازوال ہے۔ اُن تمام جذبات و احسانات کا جو ہر آن اور ہر دم آپ کے مصفا سینے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے موجزن رہتے تھے، احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں آپ کی پاک اور عالی ذات پر بہت لکھا گیا اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا، تاہم حق یہی ہے کہ انسانی عقل وفہم اور اِدراکات اُن تمام محسوسات کی کُنہ کو کبھی نہیں پاسکیں گے جو اُس پاک اور عالی وجود کا حصہ رہے ہیں۔ آپ کی زندگی کے بے شمار اور اَن گنت پہلوؤں میں سے صرف

چند ایک پہلو جن کا تعلق انسان اور انسانیت کی برتری کے جذبے سے ہے، یہاں پیش کئے جاتے ہیں تا کہ اُن پر فکر اور غور کر کے اُنہیں اپنانے اور سعی و عمل میں انہیں اپنی منزل بنانے میں ہمیں سہولت اور آسانی رہے۔

۱) تعلق زن وشوئی ایک عام تعلق ہے، جنسی لگاؤ اور محبت و چاہت اُس کے خواص ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب نے اِسے جائز قرار دیا ہے لیکن پیغمبرِ اسلام نے اس علاقہ کو عبادت کا درجہ دے دیا اور پھر کمال یہ کہ اُس کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت بھی نہیں رکھی۔ ملاحظہ فرمایئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معمولی چیز کو کیا سے کیا بنا دیا۔ فرمایا ''اگر کوئی اپنی بیوی کو محبت اور خلوص سے ایک لقمہ بھی کھلائے، اُس نیت کے ساتھ کہ میرے خدا نے بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے تو اُس کا بظاہر ذاتی یہ فعل عبادت بن جائے گا''۔ ؎

تو نے خموشیوں کو ترانہ بنادیا
ہر جنبشِ نظر کو فسانہ بنادیا

۲) خیبر کے محاصرے کے دوران ایک یہودی عورت نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفۃً بکرے کا بھونا ہوا دست پیش کیا۔ اُس گوشت میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے چکھا تو آپ کو محسوس ہوا کہ اُس میں زہر ملا ہوا ہے۔ آپ نے ہاتھ روک لیا اور دوسروں کو بھی کھانے سے منع فرما دیا۔ جب اُس یہودی عورت سے استفسار کیا گیا تو اُس نے کہا کہ چونکہ اِس جنگ میں میرے بہت سے عزیز مارے گئے ہیں اس لئے اُن کے بدلے کے خیال سے مَیں نے ایسا کیا تھا اور میرے دل میں یہ بات بھی تھی کہ اگر آپ اپنے دعوٰی میں جھوٹے ہیں تو ضرور ہلاک ہوں گے اور اگر سچے ہیں تو آپ کا خدا خود آپ کو بچالے گا۔ اُس کا یہ جواب سن کر اسے معاف فرما دیا اور کوئی سزا اُسے نہیں دی۔ آپ کا

یہ عفو عین تعلیمِ اسلامی کے مطابق تھا۔ایسی معافی جو آئندہ کسی فتنہ کا دروازہ نہ کھولتی ہو اور اُس سے مخالف کے روبہ اصلاح ہوجانے کی توقع ہو،اسلام میں جائز ہی نہیں بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔ایسی عالی ظرفی اور برمحل اخلاق کی مثال صفحاتِ تاریخ میں کم ہی نظر آئے گی۔ ؎

چوٹ لگنے کو تو لگتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

اسی طرح فتح مکہ کے موقعہ پر جس عفو اور درگزر کا آپ نے مظاہرہ فرمایا وہ بھی عین اسلامی تعلیم اخلاق کے موافق تھا۔آپ فاتح تھے لیکن مصلحت نے آپ کو معافی دینے اور درگزر کرنے پر اُکسایا۔نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔سارے کا سارا مکہ اسلام کی آغوش میں آ گیا۔بُرا ہو تعصب کا کہ اُس کی آنکھوں پر ہمیشہ کالا پردہ پڑا رہتا ہے۔کہاں ہیں وہ اقوام جن کے ہاتھوں میں آج علم کی مشعل ہے۔مگر پھر بھی وہ یہی کہے جاتی ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔کیا عفو کی اِس تعلیم کا حضرت عیسیٰؑ کی درگزر کی اُس تعلیم سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے،جس میں کہا گیا تھا کہ ''ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا بھی پیش کردو'' مصلحت سے دور اور موقعہ و محل سے بے بہرہ وہ تعلیم عمل کے جامہ سے ہمیشہ باہر رہی۔افسوس! ؎

ایک پروانے کو بھی دادِ جنوں دے نہ سکی
شمع سب کچھ تھی مگر صاحب کردار نہ تھی

۳) اَمانت کے اُصول کا اِحترام اور اُس کی پابندی میرے آقا کی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔گو کہ دعویٰ نبوت سے پہلے بھی آپ اپنی قوم میں **امین** کے لقب سے ممتاز تھے،لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کا کردار نہایت نازک جذباتی مواقع پر بھی بے داغ اور کھرا رہا،تو ہمارے دل آپ کی بزرگی اور برتری کے خیال سے رقّت آمیز ہوجاتے ہیں۔قلعہ خیبر کے

محاصرے کے وقت ایک یہودی رئیس کا گلہ بان جب مسلمان ہوگیا تو اُس نے اُن بکریوں کے بارے میں جو اُس کے قبضہ میں تھیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ طلب کیا۔حضور نے حکم دیا کہ بکریوں کا رخ قلعہ کی طرف کر کے اُنہیں ہانک دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور قلعہ والوں نے انہیں اندر لے لیا۔غور فرمائیے! یہودی قلعہ بند تھے۔اُن کا چاروں طرف سے محاصرہ تھا اور محاصرہ طول کھینچتا جارہا تھا۔بکریوں کا یہ ریوڑ اُن کی غذا کی فراہمی کا باعث بن کر اُن کے قلعہ بند اور مصروفِ پیکار رہنے کو تقویت پہنچاتا تھا۔لیکن آپ نے اسلامی اخلاق کو پورے زور اور شدت کے ساتھ برتا۔آج کے انتہائی ترقی یافتہ اِس دور میں بھی، دورانِ جنگ دشمن کا مال حلال سمجھا جاتا ہے،لیکن میرے آقا کا عمل ایک رسول کے امین ہونے اور ساتھ ہی اپنے خدا پر بے پناہ بھروسہ اور بے تکان اعتماد کرنے کی عظیم الشان دلیل ہے۔ ؎

ہر رہ گزر پہ شمع جلانا ہے میرا کام
تیور ہیں کیا ہوا کے یہ مَیں دیکھتا نہیں

۴) صحیح بخاری میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ بندوں کا اپنے اللہ پر کیا حق ہے؟ پھر استفسار پر فرمایا ''یہی کہ وہ اُنہیں عذاب نہ دے''غور فرمائیے! اللہ تعالیٰ کی صفات رحم، بخشش، عطا اور جُود وسخا کا کس قدر وسیع نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کا یہ حق سمجھتے ہیں کہ بہر حال اُنہیں عذاب نہ دیا جائے اور اُن پر رحم کیا جائے۔اللہ تعالیٰ کی بزرگی، استغناء اور اُس کے بے حدوحساب رحیم وکریم ہونے کا، کیسا صحیح اور مکمل عکس اس میں آ گیا ہے۔

اب اِس حدیث کو قرآنِ مجید کی اُس آیت سے ملا کر پڑھئے، جو یہ ہے کہ ''رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ''(الاعراف:۱۵۷) اللہ تعالیٰ اپنی عادت بیان فرماتے ہیں کہ ہماری

رحمت ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب پر بھی غالب ہوئی۔ اِس سے یہی نتیجہ نکلا کہ بہر حال ایک وقت آئے گا کہ تمام دوزخی بندے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مزہ چکھیں گے اور بخش دیئے جا کر جنت میں داخل ہوں گے۔ اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ ایک دن دوزخ بالکل خالی ہوجائے گی اور بادِ نسیم اُس کے دروازے کھٹکھٹاتی ہوگی۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پیدائش کو مکمل کیا تو اُس نے اپنی ایک کتاب میں جو عرش پر اُس کے پاس ہے، لکھا کہ ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔ کس قدر امید افزاء کتنا روح پرور اور کیسا راحت بخش ہے یہ پیغام جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے مخلوقِ خدا سے بے انتہا پیار کے ثبوت میں دیا۔ ؎

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہوسکا جب نہ مُداوا تیرے بیماروں کا

(ذوقؔ)

۵) احادیث میں آتا ہے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی دو جائز چیزوں کو حضور کے سامنے رکھا ہو کہ آپ اُن میں سے ایک پسند کرلیں اور حضور نے اُن میں سے آسانی اور سہولت والی چیز پسند نہ کی ہو۔ یہاں تک فرمایا کہ جب تم عبادت کرو تو اِس طرح کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم اِس قدر یقین تو رکھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ کہاں ہیں وہ صوفی نما مسلمان جو بیماری اور سفر میں روزۂ رمضان کو لازمی اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل ہمارے لئے اُسوہ ہے۔

غور فرمایئے! آپ کی سہولت پسندی ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت کا موجب ہے۔ ہم

سوچ بھی نہیں سکتے کہ اگر آپ نے مشکل پسندی کا نمونہ دکھایا ہوتا تو آج امت کا کیا حال ہوتا؟ اِس پر بھی ہمارے اشغال کا وہی حال ہے کہ ؎

فریب ایسا دیا روشنی نے جگنو کو
چراغ لے کے بھٹکتا ہے روشنی کے لئے

۶) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے کہ تم عنقریب اُس ملک کو فتح کروگے جہاں قیراط کے پیمانے کا رواج ہے (دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ملک مصر کا نام لیا تھا) آپ نے حکم دیا کہ اُس ملک کے باشندوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا کیونکہ اُن لوگوں کا ہم پر ایک حق ہے اور اُن کی صلہ رحمی ہم پر واجب ہے۔ غور فرمایئے! حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیوی حضرت ہاجرہ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ تھیں، مصر کی رہنے والی تھیں اور عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ گویا ہزاروں سال قبل کے تعلقات کا بھی آپ کو پاس اور لحاظ رہتا تھا۔ کیا اِس صلہ رحمی کی مثال کسی اور نبی کے واقعات میں مل سکتی ہے؟ ؎

تجھے صاف کیوں نہ کہہ دوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
تیرا درد دردِ تنہا، میرا درد دردِ زمانہ

۷) انسانوں کی سب سے بڑی خدمت اُن کی اخلاقی تربیت اور ایک ایسے راستہ پر اُن کو چلانا ہے کہ براہِ راست اُن کا تعلق اپنے خالق و مالک کے ساتھ اُستوار ہوجائے۔ انسان کی ہر تکلیف اور اُس کا ہر نقصان اُس کے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر بھی ہر مغموم چہرے کو دیکھ کر میرے آقا کا دل بھر آتا اور آنکھ نم ہوجاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے آئندہ زمانے کے حالات کے طور پر آپ کو اطلاع دی کہ اسلام تین صدیوں میں اپنی تدریجی ترقی کے کمال کو

حاصل کر لے گا۔ اُس کے بعد اُس کے تنزل کا دور شروع ہوگا اور آہستہ آہستہ عیسائی دنیا پر چھا جائیں گے۔ یہودی بھی ایک وقت میں اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کر لیں گے۔ تاہم اِن دونوں اقوام کی ترقی اور اُن کا تسلط عارضی ہوگا اور آخری زمانہ میں، نشاۃ ثانیہ کے طور پر اسلام کو پھر عروج اور غلبہ اور تسلط نصیب ہوگا اور دیگر اقوام عالم اُس کے سامنے پچھڑ جائیں گی۔ اور ظالم یہود و نصارٰی اپنے کیئے کی سزا پالیں گے۔ تو جہاں ایک طرف اسلام کی ترقی کا سُن کر آپ کو خوشی ہوئی کہ انسان آپ کے پیغام کے ذریعہ اپنی زندگی کے مقصدِ اعلیٰ تک پہنچ جائے گا، وہیں دوسری ظالم اقوام کے انجام کا بدحال معلوم کر کے آپ کو طبعاً دکھ ہوا، اور آپ نے اِس خصوص میں اپنے خدا سے بہت دعائیں کیں۔

غور فرمائیں! آپ کے اضطراب کی وجہ بعض اقوام کا وہ انجام ہے جسے ابھی ڈیڑھ ہزار سال بعد وقوع پذیر ہونا تھا۔ یوں تو انسانوں میں سب سے زیادہ کمال کا درجہ پائے ہوئے وجود انبیاء ہی ہوتے ہیں اور تمام انبیاء اپنی ذات میں انسانوں کی خدمت کے لئے ایک تڑپ اور اُن کے دُکھ درد پر ایک خواہش اپنے دل میں رکھتے ہیں، لیکن بعید مستقبل میں انجام پذیر ہونے والے تکلیف دہ سانحہ پر ایک بوجھ اور اضمحلال محسوس کرنا، وہ بھی اِس صورت میں کہ متأثرہ اقوام کو وہ روزِ بد دیکھنا محض اِس وجہ سے نصیب ہونے والا تھا کہ انہوں نے اُس مقصدِ عظیم کو ناکام بنانے کی ہر ممکن سعی و کوشش کی ہوگی جسے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خونِ دل سے سینچا تھا، سوائے میرے آقا (فداہ نفسی) کے کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ؎

خود پیاس کا صحرا ہوں، مگر دل کی یہ ضد ہے
ہر دشت میں بادل کی طرح ٹوٹ کے برسوں

اِس واقعہ عظیم میں ایک سبق یہ بھی ہے کہ امید کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے۔

مایوسی سے ہمیشہ پہلو بچانا چاہئے۔آخری وقت تک بھی آپ یہی سمجھتے رہے کہ دُعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو کھینچا جا سکتا ہے۔ممکن ہے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے دور میں وہ اقوام تائب ہو کر اور آپؐ کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں پر رکھ کے خدا کے غضب سے بچ جائیں۔یہ سب کچھ محض اُس درد کی وجہ سے تھا جو بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے آپ کے دل میں تھا۔؎

تقابل طورِ سینا کا نہ کیجئے قلبِ سوزاں سے
وہ ایک لمحہ جلا جانے جلے گا دل مرا کب تک

۸) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات دیر تک نوافل پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے۔ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کی اِس تکلیف کا خیال کر کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے جنت کی بشارت دے دی ہے۔ پھر کیوں اس قدر بوجھ آپ اپنی جان پر ڈالتے اور عبادتوں میں محنتِ شاقہ سے کام لیتے ہیں۔آپ نے جواب دیا کہ اے عائشہ! جب اللہ نے سب سے زیادہ فضل مجھ پر فرمایا ہے تو کیا میرا بھی فرض نہیں کہ سب سے زیادہ شکرگزار بندہ بنوں؟ سچ ہے۔؎

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانے کے ساتھ
وصل میں وہ جان دے، یہ ہجر میں جیتی رہے

۹) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے'' ونیز فرمایا ''تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے''۔اور یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص اپنی لڑکیوں کو پڑھائے ،لکھائے اور اچھی تربیت کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوزخ کو اُس پر حرام کر دے گا'' خود پسند، مغرور اور متکبر عربوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنی خود ساختہ اور اَنا کی تسکین کے لئے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر کے مستقبل کو ایک ماں سے اور قوم کو

بہت سے ہونہاروں سے محروم کر دیتے تھے۔ بے حیائی یہاں تک تھی کہ مرد اور عورتیں برہنہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔عیسائیت عورتوں کو کنواری رہنے کی تعلیم دے کر اُس کی فطرت پر ظلم کی مرتکب ہوتی تھی۔ ہندو مذہب عورت کو ایک غلام کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جوئے میں ہاری جاتی تھی۔ایک سے زیادہ شوہروں کے رکھنے پر مجبور کی جاتی تھی۔ باپ کے ترکے میں اُس کا کوئی حق نہ سمجھا جاتا تھا۔ستی کی رسم نے اُس کی رہی سہی حیثیت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ گویا کہ وہ سوسائٹی کا ایک ناکارہ ترین عضو تھی۔قربان جایئے اُس محسنِ انسانیت پر جس نے ایک طرف اولاد کو یہ حکم دے کر کہ ماؤں کے آگے تذلل اختیار کر کے ہی جنت کے حقدار بن سکتے ہو تو دوسری طرف شوہروں کو یہ جتا کر کہ تم میں سب سے اچھا کردار اُس کا تسلیم کیا جائے گا جس کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ بہترین ہوگا،عورت کے وقار کو بلند اور اُس کی حیثیت کو متعین کر دیا۔عورتوں کو عمدہ تعلیم دلانے کا حکم اُن کی صلاحیتوں کو اُبھارنے اور انہیں سوسائٹی کے لئے کارآمد وجود بنانے کا تاکیدی حکم ہے گویا کہ آج اقوامِ عالم عورتوں کے حقوق کے قیام اور اُن کی حیثیت کو بلند کرنے کے لئے سرگرم اور کوشاں ہیں، لیکن میرے آقا کے ارشاد فرمودہ حکیمانہ اقوال سے روگردانی کر کے، وہ افراط کی طرف مائل ہیں۔ یورپ نے عورت کی عزت کا جو ڈھنڈورا پیٹا ہے وہ محض نمائش ہے۔اس کی اصل عزت اس کی عصمت وعفت کی قدردانی، اور حقوق میں مرد کے ساتھ مساوات اب بھی مفقود ہے۔حق یہی ہے کہ عورتوں کے صحیح مقام اور اُس مقام کے تحفظ کے لئے میرے آقا کی تعلیمات ہی سینہ گیتی پر تحفظ نِسائیت کا نقطہ آغاز تھیں۔ ؎

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے
اگر نصیب تیرے کوچہ کی گدائی ہو

۱۰) جنگ اور لڑائی سے میرے آقا کو ہمیشہ نفرت رہی۔آپ کا پیغام صلح وآشتی اور امن و ترقی کا پیغام تھا۔ایسا موقعہ آپ کی زندگی میں کبھی نہیں آیا کہ لڑائی اور بدامنی سے بچنے کی کوئی راہ پیدا ہوئی ہو اور آپ نے اُسے اختیار نہ کیا ہو۔صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بیعتِ رضوان کے تحت کئے گئے عہد کے مطابق مسلمان، کفار سے ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار تھے۔چونکہ کفار مسلمانوں کے ہاتھ دیکھ چکے تھے۔انہوں نے صلح کے شرائط طے کرنے کے لئے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً صلح پر اپنی آمادگی ظاہر فرمادی۔اِس صلح کی بہت سی شرائط تھیں، جن میں سے بعض تو ایسی تھیں گویا کہ مسلمان ایک مغلوب فریق ہیں۔لیکن جب حضور نے دیکھا کہ بہر حال اہلِ مکہ کا رجحان صلح کی طرف ہے اور اِس طرح حالتِ امن کے پیدا ہونے کا امکان ہے تو آپ نے گویا دباؤ والی شرائط پر بھی صلح کرلی۔گو کہ اِس صلح کی بعض شرائط مسلمانوں کے لئے ذلت آمیز حد تک پست معلوم ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض اکابر صحابہ کو اس میں کد تھی لیکن واپسی کے سفر میں ہی اللہ تعالیٰ نے قرآنی وحی کے ذریعہ اِسے مسلمانوں کے لئے فتح مبین قرار دیدیا۔نتیجہ سب کے سامنے ہے۔جونہی کفار اور مسلمانوں میں میل جول پیدا ہوا، کفار کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی خوبیاں پرکھنے کے مواقع فراہم ہوگئے۔باوجود اس کڑی شرط کے کہ اگر مکہ کا کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ بھاگ آئے تو مسلمان اُسے مکہ لوٹانے کے ذمہ دار ہوں گے۔اور اگر مدینہ کا کوئی مسلمان مُرتد ہوکر مکہ بھاگ پڑے تو اہلِ مکہ اُسے مدینہ واپس بھجوانے کے پابند نہیں ہوں گے۔مکہ میں لوگ مسلمان ہونے لگے۔اہلِ مکہ نے اِس مذکورہ شرط سے فائدہ اٹھا کر خوب خوب ارمان نکالے اور جس قدر ممکن تھا اُن نومسلموں کو تختۂ مشق بنانے لگے۔لیکن دوسال کے اندر ہی بعض ایسی وجوہ پیدا ہوئیں کہ کفار مکہ نے کوششیں شروع کردیں کہ کسی طرح اس صلح نامہ

کو باہم منسوخ کرادیں۔ جو کفار اِس صلح نامہ کی تکمیل پر اپنی فتح کے غرور میں پھولے نہ سماتے تھے، بہت جلد اُس کے مآل پر خوف زدہ ہو گئے۔ اِس دوران میرے آقا نے ایفاء عہد کا جو پاس اور لحاظ رکھا اور جو نمونہ اپنے عہد کی پاسداری کا آپ نے دکھایا، اس کی مثالیں تاریخ میں شاید ہی مل سکیں۔ جتنے بھی مرد اسلام قبول کر کے اور اہلِ مکہ کے ظلم سے تنگ آکر مدینہ پہنچے، واپس لوٹا دئے گئے۔ حالانکہ اُن کی حالت نہایت سقیم اور خطرناک حد تک قابلِ رحم تھی۔ مدینہ کے مسلمانوں کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا، لیکن پاسِ عہد اور ادبِ رسول مانع تھا اور وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود اہلِ مکہ کو محسوس ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صلح حدیبیہ پر راضی ہو جانا عظیم تدبر اور فراست کا حامل تھا۔ اُنہیں اپنی عارضی فتح کا وہ جشن جو صلح حدیبیہ کے وقت اپنی شرائط منوا کر اُنہوں نے منایا تھا۔ اب بوجھل، غم ناک اور جان گُسل محسوس ہونے لگا۔ بہت جلد تاریخ نے ثابت کر دیا کہ حدیبیہ کا صلح نامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کھلی فتح اور کفار مکہ کے لئے بے پناہ شکست کا موجب تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

کوئی مغرورِ حُسن سے کہہ دے
وقت سب سے خراج لیتا ہے

۱۱) تاریخوں میں طائف کے واقعہ کا ذکر آتا ہے۔ مکہ والوں کو جب آپ نے دیکھا کہ اپنی جہالت میں ترقی ہی کرتے اور شرافت سے بکلی بیگانہ وش ہوتے جاتے ہیں تو آپ نے چاہا کہ طائف جا کر وہاں کے شرفاء اور رؤساء کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ لیکن وہاں بھی وہی سرد مہری آپ کی منتظر تھی۔ آپ کو یہی جواب دیا گیا کہ جب آپ کی اپنی قوم ہی آپ کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتی تو آپ کیونکر متوقع ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ التفات کا برتاؤ کریں گے۔ آخر کار آپ کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ واپسی میں دو تین میل تک طائف کے بازاری بے

فکروں نے وہاں کے رؤساء کے اشارے پر آپ کے پاؤں پر مسلسل خِشت باری کی یہاں تک کہ آپ لہولہان ہو گئے اور آپ کے جوتے خون سے بھر گئے۔ جب آپ درد اور تکلیف سے بیٹھنے لگتے تو کوئی بدبخت آتا اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیتا کہ یہ تمہارے بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے جب بدمعاشوں نے آپ کا پیچھا چھوڑا تو آپ کچھ آرام لینے کے لئے ایک باغیچہ میں بیٹھ گئے۔ غور فرمائیں! ایسے وقت کسی بھی مظلوم کے دل کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے ؟ لیکن میرے آقا دنیا کے تمام انسانوں سے بالا ایک عظیم قوتِ ارادی اور ایک رفیع الشان ضبطِ نفس کے مالک تھے۔ آپ اِس بے پناہ ظلم وستم اور بے تحاشہ تھکا دینے اور مایوس کر دینے والے جَور وطغیان کے باوجود اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اِس حال میں کہ مایوسی کا ایک شمہّ اثر بھی آپ پر غلبہ نہیں پاتا اور شکوہ وشکایت کا کوئی ایک لفظ بھی آپ کی زبانِ وجد سامان پر جاری نہیں ہوتا۔ میرے آقا کا قلب صمیم ایمان ویقین کی کیفیت سے ایسا پُر معلوم ہوتا ہے کسی بڑے سے بڑے جغادری پہلوان سے بھی ایسے ضبط اور ایسی برداشت کی توقع نہیں۔ آپ اپنے قادر وتوانا خدا کو مخاطب کرتے ہیں تو اِن الفاظ میں کہ ''اے خدا مَیں کمزور ہوں، مجھ میں ہی کچھ کمی ہے، لوگوں کی نظروں میں میرا ہیچ ہونا اِسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ تمام کمزوروں کو قوت دینے والی ذات تیری ہی ہے۔ مَیں بھی کمزور ہوں۔ تو مجھے کس کے سپرد کرے گا۔ کیا کسی دشمن کے کہ وہ ترش روئی کے ساتھ مجھ سے معاملہ کرے۔ یا کسی دوست کے کہ جس کے ذمہ تو نے میرا معاملہ کیا ہوا ہے۔ اگر تو مجھ سے راضی ہے تو یہ سب آفتیں میرے لئے کسی ملال کا موجب نہیں ہو سکتیں۔ تیری وسیع ترین حفاظت اور تیرے رخِ انوار کی پناہ مجھے چاہیئے۔ اُس رخِ انوار ودرخشاں کی جس کے آگے تمام تاریکیاں اور ظلمتیں پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ اور دنیا وآخرت کے تمام امور فیصلہ پا جاتے ہیں۔ مَیں تیرے غصہ اور تیری ناراضی سے

تیرے ہی منور چہرے کی پناہ مانگتا ہوں۔ میری عرض تجھ سے ہی ہے کہ بس تو مجھ سے راضی ہوجا۔ تیرے سوا نہ کوئی طاقت ہے اور نہ کوئی قوت۔

دوستو! دیکھا آپ نے! کس فقید المثال اور کس رفیع المرتبت شان کا مالک تھا میرا آقا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی نظر انسانی ظلم کی طرف نہیں گئی۔ جس قدر اہلِ طائف نے آپ کے پیغام کو بے اعتناء اور نا قابلِ غور ٹھہرایا، اُس سے بھی زیادہ آپ نے اُن کے گھناؤنے ظلم سے بے اعتنائی برتی اور اُسے نا قابلِ غور سمجھا اور اپنے خدا سے متوقع رہے کہ ایک دن بہرحال یہ بھٹکی ہوئی روحیں اپنے پیدا کرنے والے کے آستانے پر آ گریں گی۔ گویا کہ دنیا بھر کو آپ نے جواب دیا کہ ؎

آپ ہوں، مَیں نہیں انساں سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے ابھی کمسن ہے بہار

وَآخِرُ دعوٰنا اَنِ الحَمدُ للہِ ربِّ العٰلمین

❁❁❁

(3)

عِلم الکلام اور حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسلام

علمِ کلام وہ علم ہے جس میں عقائدِ اسلامیہ کی صحت کو دلائل عقلیہ کے ساتھ ثابت اور خلافِ اسلام خیالات یا عقائدِ کفریہ کو دلائل عقلیہ کے ساتھ رد کیا جاتا ہے۔علومِ عقلیہ کے استعمال میں منطق اور فلسفہ معاون علوم کی حیثیت سے کام میں لائے جاتے ہیں۔دیگر بہت سے علوم کی طرح علمِ کلام بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔عباسیوں کے زمانہ حکومت میں جب دنیا کی مختلف زبانوں کے علمی شہ پارے عربی میں ترجمہ ہوئے ، ونیز تمام اقوام وملل کو مذہبی تعلیمات ومباحثات ومناظرات کی آزادی دی گئی تو علم کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔اور جگہ جگہ علمی تذکرے اور عقائد میں باریک در باریک مسائل پر مباحث کا ایک سلسلہ چل پڑا۔عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں اور اسی طرح ملاحدہ، فلاسفہ اور زنادقہ وغیرہ کو موقعہ ملا کہ وہ اُس شکست کا بدلہ جو ابتدائے اسلام میں اُنہیں اٹھانی پڑی تھی، اب قلم کے ذریعہ سے لیں۔یونانی فلسفہ گو کہ قیاسات اور مظنونات کا مجموعہ تھا، تاہم اُس نے اُس وقت ایک عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی اور اُس کے زیرِ اثر، عقائد اور مسائل اسلام پر آزادانہ بلکہ بے باکانہ اعتراض کی وہ بوچھاڑ شروع ہوگئی جس نے ہزاروں مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر دیا۔علماءِ اسلام نے اِس بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کے لئے تلوار کو حرکت دینا اسلام کی شان کے منافی سمجھا۔نہایت ذوق وشوق اور جانفشانی سے فلسفہ سیکھا اور اُسی ہتھیار سے مخالفین کے خلاف مبارزت آزما ہوئے، جس ہتھیار سے وہ اسلام اور اہلِ اسلام کے مقابل صف آراء ہوئے تھے۔

عقیدہ اور مذہب کے اِس اختلاف کے آغاز کی ایک وجہ ایرانی، یونانی اور قرطبی قوموں کا فوج درفوج اسلام میں داخل ہونا تھا۔اُن کے اور عربوں کے مزاج میں نمایاں فرق تھا۔عربوں کا ذوقِ اصلی ''قوتِ عمل'' تھا۔اعتقادات میں نکتہ آفرینی اُن کے مزاج اور اُن کے مایہ خمیر سے باہر تھی،لیکن عجمی قومیں بال کی کھال نکالتی تھیں۔دوسری وجہ اِس کی یہ تھی کہ جو قومیں حلقہ اسلام میں داخل ہوئیں، اُن کے قدیم مذاہب، مسائلِ عقائد میں، صفاتِ خداوندی، قضا وقدر، اور جزا وسزا کے متعلق مخصوص خیالات ونظریات کے حامل تھے۔اُن خیالات ونظریات میں ایسے نظرئے جو علانیہ عقائدِ اسلامیہ کے مغائر تھے،یعنی شرک، بت پرستی اور تعددِ الٰہ وغیرہ، وہ تو دلوں سے جاتے رہے،لیکن جہاں عقائدِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں میں بعض پہلو اُن کے عقائد اولیٰ سے ملتے جلتے تھے، وہاں بالطبع وہ اسی طرف راغب ہوئے، اور چونکہ مختلف مکاتیب فکر کے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔اس لئے اُن کے عقائدِ مختلفہ کا جو اثر اسلام پر پڑا وہ بھی متنوع اور بعض صورتوں میں متضاد تھا۔یہودی خدا کی تجسیم کے قائل تھے اور اُن کے نزدیک خدا تکلیف اور خوشی کی حس بھی رکھتا تھا۔ جب یہودی مسلمان ہوئے تو قرآنی اُن آیتوں سے جن میں خدا تعالیٰ کی نسبت ہاتھ منہ وغیرہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔انہوں نے یہی رائے قائم کی کہ خدا تعالیٰ بھی واقعی انسانوں کی طرح ہاتھ اور منہ رکھتا ہے۔بعض مسائل ذوالوجوہ تھے۔جیسے مسئلہ جبر وقدر وغیرہ۔اِن مسائل میں عقائد کا اختلاف، طبائع کے فطری اختلاف کا نتیجہ تھا۔قرونِ اولیٰ میں علماءِ اسلام یک فنہ مہارت رکھتے تھے۔نحوی ائمہ فقہ سے ناواقف تھے تو فقہاء، علمِ حدیث سے کم ہی سروکار رکھنے والے۔اسی طرح محدثین، علومِ عقلیہ کا درک نہیں رکھتے تھے۔جب علمِ کلام ایجاد ہوا تو فلسفہ کی بیسیوں اصطلاحات اِس میں رواج پا گئیں۔محدثین کرام جو اشاعرہ کہلاتے ہیں، اِن نئی نئی اصطلاحات کو سُن کر فلسفہ اور

کلام میں فرق نہ کر سکے، اور چونکہ یونانی فلسفہ پہلے سے ہی اُن کی نظروں میں حقیر تر تھا، اس لئے علمِ کلام کو بھی انہوں نے اسی قبیل کی کوئی چیز سمجھا اور متکلمین کو گمراہ کا فتویٰ دے دیا۔ چنانچہ فقہاء اور محدثین سے جب صفات خداوندی یا جبر وقدر کے بارے میں کوئی سوال کیا جاتا تو وہ جواب دیا کرتے تھے کہ ''الکیف مجھول والسوال بدعة'' اِس کی کیفیت نامعلوم ہے اور سوال کرنا بدعت میں داخل ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو بڑے اکھاڑے عقائد مختلفہ کے اسلام میں بن گئے۔ جن کو ہم اشاعرہ اور معتزلہ کے نام سے جانتے ہیں۔ بعض اہم معتقدات جو اشاعرہ کے مسلمات بن گئے تھے، حسبِ ذیل تھے۔

۱) خدا کے احکام مبنی بر مصلحت نہیں ہیں۔

۲) کوئی چیز دنیا میں کسی کی علت نہیں۔

۳) اشیاء اپنے اندر خواص اور تاثیر نہیں رکھتے۔

۴) خدا کو اختیار ہے کہ وہ بے وجہ بھی انسانوں کو سزا دیدے۔

۵) انسان اپنے اعمال میں مقتدر نہیں ہے۔

۶) خدا ہی انسان سے نیکی اور بدی کرواتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اشاعرہ اور معتزلہ کی ستیز و آویز اور چشمکیں ایک عرصہ تک چلا کیں۔ اکثر ائمہ کے نزدیک معتزلہ کے مقابلہ میں اشاعرہ زیادہ صحت عقائد کے حامل تھے، لیکن ظاہر ہے کہ جہاں تک مطلق عقائدِ اسلامیہ کا تعلق ہے دونوں گروہ بھی صحت کے مقام سے دور تھے اور حقیقت دونوں کے بین بین تھی۔ لیکن یہ صورتِ حال رفتار زمانہ کے ساتھ بدلتی گئی۔ حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کا مذہب معتزلہ کے عقائد سے قریب تھا لیکن آج کے وہ معقول مسلمان جو اپنے آپ کو اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں تو ساتھ ہی حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بھی اپنے کو نسبت دیتے

ہیں۔ گویا کہ اہلِ سنت اور معتزلہ کا وہ نمایاں فرق آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ گو کہ مسائلِ عقائد میں یہ افتراق جو اُس زمانے میں عام تھا اور زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ آج عقل کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے، لیکن تفصیل میں جائیے اور علماء سے بحث کیجئے تو پامال شدہ یہ مسائل آج بھی مسلمہ ہیں۔ حضرت امام رازیؒ نے اپنی تفسیرِ کبیر میں اشاعرہ اور معتزلہ کے بارے میں یوں اظہارِ رائے فرمایا تھا کہ ''اہلِ سنت والجماعت (اشعریہ) کا خیال خدا کی وسعت کی طرف گیا ہے اور معتزلہ کا خدا کی تنظیم اور اُس کے مبرا عن العیوب ہونے کی طرف، غور سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت اور تقدس کے معترف ہیں، صرف اصابت رائے اور غلطی رائے کا فرق ہے۔''

اختلافِ عقائد کے اسباب میں ایک بڑا سبب عقل و نقل کی بحث بھی تھی۔ فطرتِ انسانی میں ایک قسم وہ ہے جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر رکھتی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو نقل پر یقین رکھتی ہے اور جب کسی بزرگ یا معتقد علیہ کی زبان سے کوئی بات سُن لیتی ہے تو اُس کی علت وغیرہ پر بحث نہیں کرتی بلکہ **آمنا وصدقنا** کہہ کر سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔ چنانچہ کوئی زمانہ بھی اِن دو قسم کی طبائع اور فطرتوں سے خالی نہیں رہا۔ صحابہ **رضوان اللہ علیہم اجمعین** کے زمانے میں بھی اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کی کہ زندوں کے گریہ و ماتم سے مُردوں کو تکلیف ہوتی ہے تو حضرت عائشہؓ نے اِسے قبول نہیں کیا اور **لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى** (الانعام:۱۶۵) کی آیت سے اُس کا رد فرمایا۔ اسی طرح کسی صحابی نے جب یہ روایت کی کہ مُردے سنتے ہیں تو حضرت عائشہؓ نے **اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى** (النمل:۸۱) والی آیت سے اِس روایت کو رد فرمایا۔

جوں جوں علوم و فنون میں ترقی ہوئی، عقائد اور مسلمات میں بھی تدریجاً تغیر ہوتا گیا اور فقہاء و محدثین کی ظاہریت اور اشتداد آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ پھر اُن ہی میں سے اشعریہ

پیدا ہوئے۔جنہوں نے خدا کے ہاتھ، پاؤں اور منہ وغیرہ ہونے کا انکار کیا اور کہا کہ صفاتِ خداوندی عین ذات ہیں۔لیکن آہستہ آہستہ یہ خیالات پیدا ہونے لگے کہ اگر صفات عین ذات ہیں تو الگ سے صفات کوئی چیز نہیں ہو سکتے۔اور اگر خارج از ذات سمجھے جائیں تو تعدد قدماء لازم آئے گا۔اِس اعتراض کو دور کرنے کے لئے **لا عین** اور **لا غیر** اور **بالذات و بالغیر** کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔لیکن چونکہ یہ وادی بھی تنگ تھی اور گز رمشکل، اس لئے آخر کار یہ ماننا پڑا کہ خدا ایک بسیط ہستی ہے اور تمام صفات کا مظہر۔اشعریہ کے مقابلہ میں معتزلہ کا حلقہء احباب وسیع تر تھا۔اشعریہ زیادہ تر فقہاء اور محدثین کے حلقہء درس میں شریک ہوتے تھے۔اور غیر مذاہب والوں سے اُن کے روابط کم تھے۔معتزلہ اپنی عقلیت کی وجہ سے غیروں سے بھی مناظرے کرتے رہتے تھے۔چنانچہ خیالات کی اِس حرکت نے نئے نئے مسائل پیدا کئے اور ابھی بنو امیہ کا دور ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ خلقِ قرآن، تنزیہ و تشبیہ اور صفاتِ باری وغیرہ کی بحثیں عام ہو گئیں اور چند ہی روز میں بیسیوں فرقے معرضِ وجود میں آ گئے۔

عِلمِ کلام کی ابتداء میں دو قسمیں تھیں۔ایک وہ جس کی وجہ پیدائش فرقہائے اِسلام کے باہمی جھگڑے تھے اور دوسری وہ جو فلسفہ کے مقابلہ کے لئے ایجاد ہوئی تھی۔امام غزالیؒ نے اِن دونوں قسموں کو ملا دیا اور فلسفہ کے انداز پر ایک جدید عِلمِ کلام کو ترویج دی۔امام رازیؒ نے اِسے مزید آگے بڑھایا، لیکن متاخرین اِس عِلم کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔فلسفہ، کلام، منطق، اصول، عقائد اور عمرانیات کو ملا کر مربہ بنا دیا۔گزشتہ ڈیڑھ صدی میں عِلمِ کلام کے متعلق مصر، شام، ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔عِلمِ کلام کو ایک نئے ڈھنگ اور طرز پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔لیکن وہ چنداں سودمند نہیں ثابت ہوئی۔یا تو وہی گھسے پٹے اور مہمل مسائل و دلائل تھے جو متاخرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے یا یہ کیا گیا کہ یورپ کے ہر قسم کے

معتقدات اور خیالات سے مرعوب ہو کر اُنہیں معیارِ حق قرار دے دیا گیا اور قرآن وحدیث کے ساتھ زبردستی اُن کی تطبیق کی گئی۔ سرسید احمد خان کی تفسیرِ قرآن اِس مؤخر علمِ کلام کی بہترین مثال ہے۔ پہلا کورانہ تقلید کا نمونہ تھا تو دوسرا تقلیدی اجتہاد کا۔ نیا پن کسی میں نہیں تھا۔ یہی سمجھ لیا گیا تھا کہ سلف نے جو کچھ اسلام کو دیا ہے۔ اِس میں اضافہ ممکن نہیں۔ فکر وتخیل میں جمود کی ارزانی نے توہمات کو پیدا کر دیا تھا اور ظاہر ہے توہمات کی بیداری، عقل کی ہوتی ہے۔ نتیجۃً اسلام ہزاروں ظلم اور جَور وطغیان کی آماج گاہ بن گیا لیکن کوئی مردِ ہمت نہیں تھا کہ خم ٹھونک کر اُٹھتا اور مخالف ہاتھ کو دبا کر شَل کر دیتا۔ افکارِ یورپ اِس تیزی سے وسعت اختیار کر رہے تھے کہ اُن کے سامنے علماءِ اسلام کو اپنا علم وفلسفہ ایک تنگنائی محسوس ہونے لگا تھا۔

علم کی ترقی اور ترویج کی وجہ سے اسلام کو مظنونات اور قیاسات سے فزوں تر بدیہات اور تجربات کا سامنا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، معلوم ہوتا تھا کہ اقوامِ اسلامی، مروجہ ضروری علوم، افکار اور تجربات سے یا تو تہی دست ہیں یا پھر اِس قدر مرعوب کہ احساسِ کمتری نے اُن پر کامل اقتدار اور غلبہ پالیا ہے۔ جن اقوام کے ہاتھ میں اسرارِ کائنات کے حل کی کنجیاں تھیں وہی اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہوگئیں۔ علم اور تجربہ کی وسعت وترقی کو انہوں نے اپنے مذہب و معتقدات کے خلاف پایا۔ ظاہر ہے کہ اسلامی معتقدات اور نظریات اُن کی نظر میں مضحک اور ناقابلِ التفات بلکہ ہدفِ ملامت ٹھہرے۔ اِس کی آڑ میں وہ اپنے عقائد اور اپنے تمدن کو عام کرنے کے لئے ہر سعی عمل کو بروئے کار لانے میں کوشاں ہوگئے۔ جہاں عیسائی مشنری اسلام کے درپے ہوئے، وہیں آریہ، برہمو، سناتنی، دہریئے اور فلاسفر اِسے نوالہء تر سمجھ کر اپنے دانت تیز کرنے لگے۔ آبادیوں کی آبادیاں اور بستیوں کی بستیاں اصحابِ علم ودانش اور اربابِ پیشوائی سے بھری پڑی تھیں۔۔ لیکن قیامِ حق کے لئے آگے آنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ بعض دامنِ

رخصت میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے تو بعض گوشہءانقطاع میں عافیت تلاش کر رہے تھے۔ضعفِ ایمانی کا درجہء تنزل جب اِس طور پر جاری و ساری ہوجاتا ہے کہ اہلِ فکر واصحاب مشیخت کی زبانیں گنگ اور دستِ عمل شل ہوجاتے ہیں تو ایسے ہی وقت مشیت ایزدی جوش میں آتی اور اپنی سنتِ مستمرہ کے مطابق کسی نفس مُزکی کو عزائم امور کے لئے چُن لیتی ہے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اللہ تعالیٰ نے جو اسلام اور نبی اسلام کے لئے بے پناہ عزت رکھتا ہے، اپنے ایک اُمثل اور اصلح بندے کو جو بظاہر عُلومِ دینی و دنیوی سے کوئی خاص حصہ نہیں رکھتا تھا۔اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے چُنا اور اِس زمانہ کے لئے مسیح اور مہدی کے طور پر اُسے کھڑا کر دیا۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فتوٰی ہائے کفر کا عذاب سہا، استہزاء کی زحمتیں برداشت کیں۔لیکن انسانوں کی جمعیتِ قلب کو ہمیشہ مقدم رکھا۔توہمات کی قید اور رسومات کے سلاسل سے اسلام کو آزاد کرانے اور دینِ فطرت کو تمام ادیان پر غالب کر دکھانے کے لئے ایک طوفان آپ کے سینے میں برپا ہوا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاؤں اور تضرعات کو سُنا اور بپایہ قبولیت اُنہیں جگہ دی۔آپ نے اپنے پیارے اور محسن خدا سے طاقت پا کر علمِ کلام میں ایک انوکھا تخیل، ایک اچھوتا تصور، ایک نرالا فلسفہ اور ایک اثرانگیز انقلابی رجحان فکر پیدا کر دکھایا اور وہ وہ مینا کاریاں کیں کہ عقل حیران ہوتی ہے۔آپ کا علم صرف فلسفہ تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ نے اِس علم کو ایسی وسعت دی کہ تمام عُلوم کو قرآن کا خادم بنا دیا۔علمِ لغت، علمِ معانی و بیان، علمِ منطق وفلسفہ اور علمِ تاریخ کو ایک نئے ڈھنگ سے آپ نے برتا۔آج مخالف بھی اِس بات کے مُقر ہیں۔اخبار وکیل امرتسر نے آپ کی وفات پر لکھا تھا۔کہ ”مرزا صاحب کا لٹریچر جو مسیحیوں اور آریوں کے مقابلہ پر اُن سے ظہور میں آیا.....کسی تعارف کا محتاج نہیں۔اِس لٹریچر کی قدر وعظمت آج جبکہ وہ اپنا کام پورا کر چکا ہے، ہمیں دل سے تسلیم کرنی پڑتی ہے.....جبکہ اسلام دشمنوں کی یورش میں گھِر چکا تھا

اور مسلمان محافظِ حقیقی کی طرف سے عالم واسباب وسائط میں حفاظت کا واسطہ ہوکر اُس کی حفاظت پر مامور تھے، اپنے قصوروں کی پاداش میں پڑے سسک رہے تھے اور اسلام کے لئے کچھ نہ کرتے تھے یا نہ کر سکتے تھے۔ایک طرف حملوں کے امتداد کی یہ حالت تھی کہ مسیحی دنیا اسلام کی شمع عِرفان حقیقی کو سرِ راہ منزل مزاحمت سمجھ کر مٹا دینا چاہتی تھی اور عقل و دولت کی زبردست طاقتیں اِس حملہ آور کی پشت پناہی کے لئے ٹوٹی پڑتی تھیں اور دوسری طرف ضعف مدافعت کا یہ عالَم تھا کہ توپوں کے مقابل پر تیر بھی نہ تھے..... مسلمانوں کی طرف سے وہ مدافعت شروع ہوئی جس کا ایک حصہ مرزا صاحب کو حاصل ہوا۔ اِس مدافعت نے نہ صرف عیسائیت کے اُس ابتدائی اثر کے پرخچے اڑادئے جو سلطنت کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے حقیقت میں اُس کی جان تھا اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اُس کے، اِس سے زیادہ خطرناک اور مستحق کامیابی کی زد سے بچ گئے بلکہ خود عیسائیت کا طلسم دھواں ہوکر اڑنے لگا..... کاش کہ اُس کی تاثیر کی آزمائش کی جائے اور اِسے عیسائی آبادی کی زبانوں میں منتقل کرکے کثرت سے شائع کیا جائے۔غرض مرزا صاحب کی یہ حالت آنے والی نسلوں کو گرانبارِ احسان رکھے گی کہ انہوں نے قلمی جہاد کرنے والوں کی پہلی صف میں شامل ہوکر اسلام کی طرف سے فرضِ مدافعت ادا کیا اور ایسا لٹریچر یادگار چھوڑا جو اُس وقت تک کہ مسلمانوں کی رگوں میں زندہ خون رہے اور حمایتِ اسلام کا جذبہ اُن کے شعارِ قومی کا عنوان نظر آئے، قائم رہے گا‘‘

(اخبار وکیل امرتسر مئی ۱۹۰۸، از مولانا ابوالکلام آزاد)

ایک اور اخبار کی رائے ملاحظہ فرمائے۔

’’مرحوم کی وہ اعلیٰ خدمات جو اُس نے آریوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں اسلام کی کی ہیں، وہ واقعہ تعریف کی مستحق ہیں۔اُس نے مناظرے کا بالکل رنگ ہی بدل دیا اور ایک

جدید لٹریچر کی بنیاد ہندوستان میں قائم کردی۔ نہ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے بلکہ ایک محقق ہونے کے، ہم اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے آریہ اور بڑے سے بڑے پادری کو یہ مجال نہ تھی کہ وہ مرحوم کے مقابلے میں زبان کھول سکتا۔ جو بے نظیر کتابیں آریوں اور عیسائیوں کے رد میں لکھی گئیں اور جیسے دندانِ شکن جواب مخالفینِ اسلام کو دئے گئے ہیں، آج تک معقولیت سے اُن کا جواب ہم نے تو نہیں دیکھا''

(کرزن گزٹ، یکم جون ۱۹۰۸، از مرزا حیرت دہلوی)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علمِ کلام کا صحیح لطف تو آپ کی کتب کے مطالعہ سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم بعض اہم اصول اور نُکات جو آپ نے اپنے علمِ کلام کی تدوین میں مقرر فرمائے، اُن کو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

۱) گزری ہوئی تیرہ صدیوں نے اسلام اور اہلِ اسلام میں جو معتقدات اور نظریات پیدا کردئے ہیں، اُن کے حال یعنی اندرونی اصلاح کے لئے آپ نے یہ اصل پیش فرمایا کہ ہمارے محلِ نظر سب سے مقدم کتاب اللہ یعنی قرآنِ کریم ہونی چاہیئے۔ اُس سے نیچے دوسرے نمبر پر آپ نے سنتِ رسول کو یعنی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کو دیا۔ وہ افعال جو خود آپ کے ذاتِ بابرکات سے سرزد ہوئے اور جن کی کامل تقلید و تصدیق صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے عمل سے اپنے حینِ حیات فرمائی۔ (واضح ہو کہ سنتِ رسول، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اور احادیث آپ کے اقوال ہیں۔ اُس وقت تک کہ آپ کے اقوال ابھی جمع نہیں ہوئے تھے، آپ کا عمل دنیا میں موجود تھا۔ بایں لحاظ اسے احادیث پر فوقیت حاصل ہے اور وہ حدیث سے الگ ایک حیثیت رکھتا ہے۔) تیسرا درجہ آپ نے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں صحیح بخاری کو دیا۔ مگر اِس شرط کے ساتھ کہ سنتِ رسول اور قرآنِ کریم اُس کی

تائید کریں۔ چوتھے نمبر آپ نے صحیح مسلم کو جگہ دی، اِس شرط کے ساتھ کہ بخاری، سنتِ رسول اور قرآنِ مجید اُس کے مخالف نہ ہوں۔ پھر اِسی طرح دیگر کتبِ حدیث درجہ بدرجہ۔

۲) آپ نے یہ اصل پیش فرمایا کہ مجرد عقلِ انسانی یا فلسفہ دنیا کے مسائل کا حل نہیں ہو سکتے بلکہ ضروری ہے کہ انسانی عقل خدا تعالیٰ کی تازہ بتازہ ہدایات کی روشنی میں اپنا راہِ عمل متعین کرے۔ اُس کے لئے خدا تعالیٰ نے وحی والہام کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا ہے۔

۳) قرآنِ مجید کی تفسیر کے لئے آپ نے بے نظیر اصول مرتب فرمائے اور اُنہیں پیش نظر رکھنا ضروری قرار دیا۔

۱۔ قرآن الہامی کلام ہے اور کلامِ الٰہی کیلئے لابدی ہے کہ وہ اپنے دعوٰی کی خود ہی دلیل بھی دیوے۔

۲۔ قرآن اپنے اندر ایک محکم اور ابلغ ترتیب کا حامل ہے اور تمام دینی و اخلاقی ضروریات کو وہ پورا کرتا ہے۔ اسی طرح دائمی صداقتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۳۔ قرآن کی بیشتر آیات کی تشریح اور تفسیر خود اُس کی دوسری آیات کرتی ہیں۔ نیز یہ کہ قرآنی آیات میں باہم تناقض نہیں اور اُن کی تفسیر میں ہمیشہ لغت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

۴۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ چنانچہ اِس کا ایک شوشہ یا ایک نقطہ بھی منسوخ اور نا قابلِ عمل نہیں ہے۔

۵۔ آیت لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (سورۃ الواقعہ:۸۰) کے مطابق اسرار وغوامض قرآن اور نکات ومعارف صرف اُنہی لوگوں پر کُھلتے ہیں جو مطہر وجود ہیں۔

۶۔ قرآن میں محکمات اور متشابہات ہیں۔ محکمات تعلیماتِ اسلامی کا اصل الاصول ہیں اور متشابہات میں تفصیلِ تعلیم ہے۔ متشابہات کی تفسیر کا گُر یہ ہے کہ اُنہیں محکمات کے تابع رکھا

جائے اور اُن کی روشنی میں اُنہیں حل کیا جائے۔

۷۔ فکرِ انسانی اور فلاسفہ خواہ کوئی صداقت اپنی کاوش سے پیش کریں۔ وہ پہلے سے قرآن میں موجود ہے۔

۸۔ اسلام کا خدا زندہ، اُس کی کتاب زندہ اور اُس کا رسول زندہ ہے۔

۴) اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے آپ نے منجملہ اور بہت سے اُصولوں کے یہ اُصول بھی رواج دیا کہ اسلام کے احکامات اور معتقدات کی فلاسفی اور اُس کی حکمت بتائی جائے۔گوکہ یہ بات قرآنِ مجید کی تعلیم کے مطابق ہی ہے، جیسا کہ آیت وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (البقرۃ:۱۵۲) سے ظاہر ہے کہ ہمارا یہ رسول کتاب (قرآن) کی صرف تعلیم ہی نہیں دیتا بلکہ ہر تعلیم کی حکمت بھی بتاتا ہے۔ عام طور پر اہلِ اسلام نے اِس اصول کو بھلا دیا تھا۔ نماز یا روزہ یا دیگر اور احکاماتِ اسلام کے بارے میں یہی عقیدہ تھا کہ اُن کا ادا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اُن کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ، ورنہ جنت سے محرومی اور دوزخ سے سابقہ واسطہ پیش آئے گا۔ گویا کہ نماز اور روزہ وغیرہ بالذات کسی خوبی کے حامل نہیں، بلکہ اصل غرض انسان کی پیدائش کی حصولِ جنت ہے جو مرنے کے بعد ملے گی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسلام کی ہر تعلیم اور حُکم کی حکمت بتائی اور ظاہر فرمایا کہ اسلام اور دیگر ادیان میں یہی فرق ہے کہ اِسلام کا ہر حکم اپنے اندر ایک بلیغ حکمت رکھتا ہے اور اِس طرح بجائے حُکم سے منوانے کے عقل کو اُکسایا اور انسانی فہم کو اپیل کی اور ظاہر ہے کہ یہی وہ طریق ہے جو ہر اعتراض اور تنقید سے بالا اور ہر شک اور بدظنی سے پاک ہے۔

۵) آپ نے دعوٰی کیا کہ عیسائیوں کے مقابلے میں اہلِ اسلام کی علمی برتری کی اصل وجہ عقیدہ حیاتِ مسیح ہے۔ اِس عقیدہ کے بُطلان کیلئے قرآنِ کریم و نیز عقل و نقل اور تاریخ سے

آپ نے ایسے شواہد جمع کئے اور ایسے بے نظیر دلائل اور براہین سے اِس کا ردفرمایا کہ گویا ایک سورج چڑھا دیا اور اسی دلیل کے ذریعہ آپ نے عیسائیوں کے اصل عقیدہ اُلوہیت اور کفارہ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ گویا اُن کے مذہب کی عمارت کو دھڑام سے زمین بوس بلکہ زمین دوز کردیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پہلے مسلمان بدک کر آگے آگے بھاگتے تھے اور پادری اُن کے پیچھے دوڑتے تھے اور اب پادری آگے بھاگ رہے ہیں اور مُسلمان اُن کا پیچھا کئے ہوئے ہیں۔

۶) ہندوؤں میں ایک فرقہ آریہ سماج ہے۔ جس کا عقیدہ ہے کہ ارواح انادی ہیں، آپ نے اُن کے خلافِ عقل وفطرت ہونے کا ثبوت دے کر اِس قدر عاجز کیا کہ احمدیوں کے نام سے وہ چونک پڑتے ہیں۔

۷) حضرت بابا نانک کا حقیقی مذہب خود اُن کی مسلمہ کتابوں اور آثار سے آپ نے ثابت فرمایا اور ایسے دلائل اور حقائق پیش کئے کہ اُن کے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں۔ غرض یکہ یحی الدین ویقیم الشریعة کے اپنے منصب کو ہر مذہب اور ہر مذہبی آدمی سے زبانِ حال وقال سے منوالیا اور آپ کے پیش کردہ چیلنج جو ہزاروں روپیوں کے انعامی ہیں اُن میں تمام ادیانِ عالَم کے علماء کو مخاطب کیا گیا ہے۔ آج بھی نا قابلِ جواب ہیں۔ مغرور اور متکبر نام نہاد علماء مذاہب کا منہ چڑا رہے ہیں۔ اور سورۃ الصّف میں بیان فرمودہ پیشگوئی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (سورۃ الصّف:۱۰) آج آپ کے وجود میں پوری ہوگئی ہے۔ آپ نے وحی الٰہی کی بناء پر جو فرمائی تھی وہ اپنی کامیابی اور فتح کا جھنڈا گاڑ چکی ہے۔ اِس کے الفاظ یہ ہیں۔

”خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبت دلوں میں بٹھا دیگا اور میرے سلسلے کو تمام زمین میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر میرے فرقہ کو غالب کرے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اِس قدر علم ومعرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ وہ

اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رُو سے سب کا منہ بند کر دیں گے اور ہر ایک قوم اِس چشمہ سے پانی پیئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جائے گا۔ بہت سی روکیں پیدا ہوں گی اور ابتلاء آئیں گے۔ مگر خدا سب کو درمیان سے اٹھا دے گا اور اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ سوائے سننے والو! اُن باتوں کو یاد رکھو اور اُن پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہوگا‘‘

(تذکرہ: صفحہ ۵۹۷)

ے

لِكُلِّ زَمَانٍ وَاحِدٌ يُقْتَدٰى بِهٖ
وَهٰذَا زَمَانٌ اَنْتَ لَا شَكَّ وَاحِدٌ

یعنی ہر زمانے میں ایک پیشوا ہوا کرتا ہے۔ بے شک اِس عہد میں، تُو وہ ایک ہے

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❀❀❀

مرقوم۔ ۱۹۷۵ء

(4)

یقینِ کامل

جدید فلسفہ نے یقین کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ انسان کی دیگر کیفیاتِ نفسی وجذباتی کی طرح ایک اضافی اور تغیر پذیر ذہنی کیفیت ہے، جس کا اطلاق ہر نفس پر، بوجہ اُس کے فن، پیشہ، قوتِ استقلال اور درکِ علمی کے اختلاف کے، مختلف اور متضاد ہوتا ہے، ایک ہی واقعہ یقین کا مختلف آدمیوں کے دِلوں اور ذہنوں میں مختلف کیفیات اور متنوع اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی یقین اپنی حقیقت اور ماہیت کی رُو سے ایک منطقی نفسی میلان ہے، انسانی حِس کے تنوع کا یہ عالم ہے کہ مزہ، خوبصورتی وبدصورتی، آواز کی شیرینی اور کرختگی، سردی وگرمی، دوری ونزدیکی اور پستی وبلندی، ہر معاملے میں ایک آدمی کی رائے، دوسرے سے مختلف ہے، دراصل یقین کا تعلق انسان کے جذباتِ اُمید وبیم سے ہے۔ ایک نااُمید مریض کے لئے جو اپنا حوصلہ چھوڑ بیٹھا ہو، ایک ناگوار شئے بھی جس سے شفاء کی خواہ معمولی سی اُمید ہی بندھتی ہو، اُسے تجربے پر اُکساتی ہے اور وہ اُسے برتنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ انبیاء کے دعووں کے واقعات میں یہ جو ہمیں نظر آتا ہے کہ بعض واقعات، اور کردار کی مضبوطی کے بعض پہلو، بعض اشخاص پر آگ اور بارود کا اثر رکھتے ہیں اور وہ قبولیت سے غیر مُنفک ہو ہی نہیں سکتے۔ وہیں بیشتر ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں کہ وہی واقعات، اور کردار کی ہمہ گیر خوبی کے وہی پہلو جنہوں نے بعض افراد کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا، اُن کی توجہ کو اپیل ہی نہیں کر سکے اور وہ دور سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ بعض غیر معمولی واقعات اور حالات جنہیں ہم مُعجزہ کہتے ہیں، اپنی نوع کے اعتبار سے خواہ سینکڑوں اور

ہزاروں لوگوں کو متأثر کریں، لیکن اُن کی قبولیت کے آثار، سب میں مختلف النوع کیفیات پر مُنتج ہوتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا یقین، ہماری خواہش، ہمارے ارادہ، اور ہماری جذباتی کیفیات کا پابند ہے۔ جدید فلسفیوں میں شوپنہاری کی فلاسفی یہی ہے کہ صداقتِ عالیہ یا صداقتِ مطلقہ، یعنی خدا تعالیٰ کا عقیدہ، صرف ارادہ اور خواہش ہے، عقل اور فکر سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ ارادہ اور خواہش چونکہ بے عقل ہیں، اِس لئے اُن کی کوئی حد بندی نہیں کی جاسکتی، گویا کہ وہ بے لگام ہیں، اِس بات کو میر تقی میرؔ نے ایک شعر میں نہایت سلیس انداز میں یوں ظاہر کیا ہے۔ ؎

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

(میرؔ)

ایک اور شاعر نے اِس کا اظہار کچھ یوں کیا ہے کہ ؎

ہم ایسے سادہ دِلوں کی نیازمندی سے
بُتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

یقین کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں قسمیں ہوسکتی ہیں۔ فلاسفروں کی آراء بھی دیگر امور کی طرح اِس ایک امر یعنی یقین پر بھی کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے، اُن تمام اَقسام کو آسان بناتے اور ہمارے فہم سے قریب تر لاتے ہوئے، بنیادی طور پر اُنہیں تین قسموں میں مُنقسم کیا ہے۔ پہلی قسم کا نام عِلم الیقین، دوسری کا عین الیقین اور تیسری کا حق الیقین ہے۔ اُن کی مثال یہ ہے کہ جب ہم کہیں دُور سے دُھواں اُٹھتا ہوا دیکھتے ہیں تو یقین آ جاتا ہے کہ وہاں قریب ہی کہیں آگ موجود ہے جس سے دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ یہ حالت عِلم الیقین

کہلاتی ہے، جب ہم قریب جاتے اور اپنی آنکھوں سے آگ کا مُشاہدہ کر لیتے ہیں تو اُس وقت جو یقین ہمیں حاصل ہوتا ہے، اُس کا نام عین الیقین ہے۔ جب ہم مزید اُس آگ کے قریب جاتے، اور اُس آگ میں اپنی اُنگلی یا اپنا ہاتھ داخل کر کے محسوس کر لیتے ہیں کہ ہماری اُنگلی یا ہمارا ہاتھ جلنے لگا ہے تو یقین کی اِس کیفیت کا نام حق الیقین ہے۔ یہی حق الیقین یا یقینِ کامل اگر خدا تعالیٰ کی ذات یا غیب کے دیگر اور اُمور سے متعلق ہو تو اُسے معرفت یا عِرفان کہتے ہیں، عِرفان کے عام معنی جو روزمرہ مستعمل ہیں وہ عِلم کے ہیں، لیکن عِلم اور عِرفان میں عموم وخصوص کا فرق ہے۔ عِلم وہ چیز ہے جو بغیر محنت کے بھی حاصل ہو جاتی ہے، لیکن عِرفان کے لئے مُسلسل غور وفکر اور محنت وکاوش لازمی عنصر ہیں۔

انسان کی پیدائش کی غرض جو قرآنِ کریم نے بتائی ہے وہ عبودیت ہے، لیکن عبودیت کے معنی صرف نماز، روزہ، یا زکوٰۃ اور حج کے لینا، عبودیت کی مکمل تعریف نہیں ہے۔ عبودیت میں انسان کی زندگی کا ہر لمحہ شامل ہے۔ یعنی عبودیت کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر فعل اور ہر قول، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا عکس ہو، مکمل انسان اور حقیقی عابد وہ شخص ہے، جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آ جائے۔ یوں معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اندر اُترا ہوا ہے۔ حقیقت میں انسانیت اور عبودیت کے کمال کا یہ درجہ انبیاء کرام کو حاصل ہوتا ہے اور ہمارے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ درجہ کمال تام کی حد تک حاصل تھا۔ آپ کے وجود کی برکت اور فیضان کا یہ اثر رہا ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ میں بے شمار ایسے بزرگ گزرے ہیں جنہیں دیکھ کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔ اُس کی وجہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی محبت اور عِشق ہے۔ جِس قدر یہ آثارِ محبت شدید ہوں گے، اُسی قدر صفاتِ باری تعالیٰ کا عکس بھی اُن کے اندر گہرا اُتر جائے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرۃ:۱۳۹) یعنی اے مسلمانو! اُن سے کہو کہ ہم تو اللہ کا رنگ (دین) اختیار کریں گے۔ اور دین سکھانے کے معاملے میں تو اللہ سے کون بہتر ہوسکتا ہے۔ صفاتِ باری تعالیٰ کے رنگوں کی یہ آمیزش اور افزونی ہی عبودیت کے مقام کو بلند سے بلند تر کرتی جاتی ہے اور اِس کے انعامات میں نبوت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت شامل ہوتے جاتے ہیں۔ اِسی مقام کے حصول کیلئے ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ '' والی دُعا سکھلائی گئی ہے۔ اور دعا کی قبولت کا نتیجہ اِن الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (سورۃ النساء:۷۰) اور (جولوگ بھی اللہ اور اِس رسول کی اطاعت کریں گے) وہ اُن لوگوں میں شامل ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شُہداء اور صالحین (میں) اور یہ لوگ (بہت ہی) اچھے رفیق ہیں۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے اور یہاں اِس کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ سے اِسلام کا جو خلاصہ ہمیں بتایا اور سکھایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اِنسان پیدائشی اور جبلی طور پر حیوان سے زیادہ ممتاز نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اُسے حیوانِ ناطق کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ بول سکنے کی صلاحیت سے سرفراز ہے۔ اسلام نے انسان کی طبعی حالتوں کو تین طرح تقسیم کیا ہے۔ پہلی حالت کو جو حیوانوں سے زیادہ مُشابہ ہوتی ہے، نفسِ اَمّارہ کے نام سے معنون کیا ہے اِس میں انسان جانوروں کی طرح کھانے، پینے اور شہوات کے اِزالے سے آگے نظر نہیں رکھتا۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف:۵۴) یعنی نفسِ امارہ جو انسان کو بدی کی طرف جو اُس کے کمال کے مخالف اور اخلاقی حالت کے خلاف ہے، جھکاتا ہے۔ یعنی اخلاقی درجہ کے حصول سے قبل یہ حالت اُس پر وارد ہوتی

ہے۔ اِسلام نے اپنی تعلیم کے ذریعہ وہ طریق سکھائے جن سے انسان کی یہ حالت روبہ ترقی ہوتی ہے اور وہ اپنی اِس حالت کو بنظرِ تحقیر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسانیت کا شرف اُسے حاصل ہو، اور وہ اِس پست حالت سے بلند ہو۔ اِس حالت اور کیفیتِ اخلاقی کا نام قرآن نے نفسِ لوّامہ رکھا ہے۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (سورۃ القیامۃ: ۳) مَیں اُس نفس کی قسم کھاتا ہوں جو بدی کے ہر کام پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ یہاں قسم کھانا گویا اُس نفس کو عِزّت بخشنا ہے کہ وہ نفسِ امّارہ سے ترقی پاکر اور نفسِ لوامہ بن کر بوجہ ترقی کے لائقِ عِزت ہوگیا۔ یہ دوسرا سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی حالتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی اب انسان اِس درجہ پر آ گیا کہ اُس کا ضمیر اور اُس کی عقل اپنی پچھلی حالت کو ملامت کی نظر سے دیکھتے ہیں او ر اِس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ طبعی جذبات اور لوازم میں وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرے۔ اِس درجہ پر آ کر انسان چاہتا ہے کہ اُس کا ہر فعل عقل کے مشورہ سے سرزد ہو، اور ہر معاملے میں اِعتدال پیشِ نظر رہے، نفسِ لوّامہ برے خیالات وجذبات کو ناپسند کرتا ہے لیکن نیکیوں کی انجام دہی پر پوری طرح قادر بھی نہیں ہوتا۔ اور کبھی کبھی طبعی جذبات سے مغلوب بھی ہوجاتا ہے۔ تب ٹھوکر کھاتا اور گر جاتا ہے، پھر بھی اپنی کوششوں سے باز نہیں آتا۔ کمزوریوں پر نادم ہوتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اخلاقِ فاضلہ کو اپنے اندر جمع کرے۔ گویا کہ وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے لگ جاتا ہے، طبعی سرکشیوں سے بے زار ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُنہیں غلبہ نہ پانے دے۔ لیکن پورے طور پر اُن کو مغلوب نہیں کرسکتا۔ اِس حالت کا نام اخلاقی حالت ہے۔

اِس کے بعد طبعی حالتوں میں سے تیسرے سرچشمہ کا نام اسلام نے نفسِ مطمئنہ رکھا ہے۔ یہ سرچشمہ روحانی حالتوں کا مَبدأ اور منبع ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ

الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر:۲۸ تا ۳۱) یعنی اے نفسِ آرام یافتہ جو خدا سے آرام پا گیا اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ۔ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی پس میرے بندوں میں مِل جا اور میرے بہشت کے اندر آجا۔ اِس مرحلے پر نفس تمام کمزوریوں سے نجات پا کر روحانی قوتوں سے پُر ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ایسا پیوند کر لیتا ہے کہ بغیر اُس کے جی نہیں سکتا۔ اور ڈھلان پر بہنے والی پانی کی طرح وہ اپنے خدا کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ تبھی خدا اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے نفس جو خدا سے آرام پا گیا، اُس کی طرف واپس چلا آ، گویا کہ وہ اِسی دنیا میں ایک عظیم الشان تبدیلی اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے اور اِسی دنیا میں ایک بہشت کو پالیتا ہے۔ یہ جو فرمایا کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پرورش کرنے والے کی طرف واپس چلا آ، ایسا ہی وہ خدا سے پرورش پاتا ہے اور خدا کی محبت ہی اُس کی غذا ہوتی ہے۔ اُسی زندگی بخش چشمے سے وہ سیراب ہوتا ہے اور موت سے نجات پا جاتا ہے۔ اِسی بات کو دوسری جگہ یوں فرمایا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس:۱۰،۱۱) یعنی جس نے ارضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا وہ بچ گیا اور زندہ رہا۔ مگر جس نے اپنے آپ کو ارضی اور طبعی جذبات کے سپرد کر دیا وہ زندگی سے نا اُمید ہو گیا)

غرض یہ تین حالتیں اِنسان کی ہیں، جنہیں طبعی، اخلاقی اور روحانی حالتیں کہہ سکتے ہیں۔ اِنسان کی اِن تینوں حالتوں میں سب سے ترقی یافتہ یعنی روحانی حالت جسے نفسِ مطمئنہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے، وہ حالت ہے جسے عرفانِ الٰہی یا یقینِ کامل کا نام دیا جاتا ہے۔ اِس کا حصول زبردست غور و فکر، دِقّتِ نظری، محنت، توجہ اور سب سے زیادہ اپنے آپ کو پاک کرنے کا یعنی تزکیہ نفس کا متقاضی ہے۔ یقینِ کامل کا یہ درجہ جسے نفس مطمئنہ کہا گیا ہے، اُس میں اللہ

تعالیٰ خود اپنے بندے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے نفس آرام یافتہ (جو خدا سے آرام پا گیا یعنی جس نے اُسے پالیا) اپنے پرورش کرنے والے کی طرف واپس چلا آ۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کے الہامات کا وہ مورد ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اُس پر دراز ہوتا جاتا اور اُس کے یقین کو کمال تام کا درجہ دے دیتا ہے۔

مجددینِ اُمت کے ذریعہ قوموں کی جو اصلاحِ احوال ہوتی ہے، وہ ایک خاص قوم اور ایک خاص زمانے تک محدود رہتی ہے، اُس میں بھی مجددین کا کام گزشتہ سو سال میں پیدا ہو جانے والی خرابیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ چودھویں صدی کے لئے جس مجددِ اعظم کو مخصوص کیا گیا تھا اُسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل بروز بھی قرار دیا گیا تھا۔ پس اُس کے ذریعہ جس تجدیدِ دین کا کام لیا جانا مقدر تھا، وہ دین کے تمام شعبوں پر حاوی اور ہمہ گیر صلاحیتوں کا تقاضا کرتا تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو کام کئے، اُنہیں پچھلے مجددین نے چھوا نہیں۔ فکر و عمل کے بیشتر کام مجددینِ اُمت اور آپ علیہ السلام میں مُشترک ہیں لیکن وہی عموم و خصوص کا فرق ہے۔ پچھلے مجددینِ اُمت کا دائرہ عمل محدود تھا جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دائرہ عمل ساری دنیا اور زمانوں کو محیط تھا۔ آپ کا کام وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا جس کی ہمہ گیری سے کسی کو انکار نہیں۔ چودہ سو سالوں میں جو گرد اسلام کے روشن چہرے کو دھندلا گئی تھی، اُسے اُجاگر کرنا اور تمام مذاہب پر اُس کے نور کو غالب کر دکھانا تھا، یہی کام آپ نے کیا اور خوب کیا۔ الہامِ الٰہی جو مؤمن کا مقصدِ اعلیٰ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے چہرے کو روزِ روشن کی طرح مؤمن کے سامنے عیاں کر دیتا ہے۔ الہام کے پانی کے بغیر عقل و فکر کی سرزمین سیراب نہیں ہوتی اور نہ برگ و بار لاسکتی ہے۔ الہام کا سلسلہ جس یقینِ محکم کی بناء ڈالتا ہے، وہی یقین، عزم اور عمل اور قربانیوں کا ضامن بن جاتا ہے اور مؤمن سے وہ محیر العقول

افعال سرزد ہوتے ہیں جن پر عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔حق کی شناخت آسان ہوجاتی ہے۔ باطل اور نحوست فرار ہوجاتے ہیں اور دل یقین کامل اور عِرفانِ الٰہی پر قرار پکڑ لیتے ہیں۔حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کے کاموں میں یہ کام سب سے نمایاں ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ جو قرآن میں آیا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔(الانعام: ۱۶۴)۔یا۔اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الاعراف: ۱۴۴)اِس کا مفہوم یہی ہے کہ سب سے پہلے انبیاء کے دلوں میں خود اُن کے دعوے پر یقینِ کامل پیدا کیا جاتا ہے۔یقینِ کامل کے بغیر کوئی شخص اپنے مفوضہ کام کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔انبیاء کا وہ مفوضہ کام ہوتا کیا ہے؟ لوگوں کے دلوں سے شکوک وشبہات اُکھاڑ کر پھینکنا ،جس شخص کا دل خود یقین سے خالی ہو، وہ دوسروں کے دلوں کو کیونکر یقین سے پُر کرسکتا ہے؟جِس کے دل میں نورِ ایمان موجود ہو ، وہی دوسروں کے دلوں میں بھی نورِ ایمان پیدا کرسکتا ہے۔ پس اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ی۔یا۔اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ کوئی معمولی فقرہ نہیں بلکہ یقین سے معمور دل سے نکلا ہوا وہ شعلۂ حق ہے جو دوسروں کے دِلوں سے شک وشبہ کے تمام خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور اُنہیں یقین کی بلندیوں کا سفر کرواتا ہے ، اِسی لئے کہتے ہیں کہ شک یقین کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یقین ،شک کی ترقی یافتہ قِسم ہے۔

مادی چیزوں کا حصول خدائی تجلّی کا محتاج نہیں ہے،لیکن روحانیت کیلئے خدا کی مسلسل تجلیات لازمی ہیں، یہ مسلسل تجلیات ہی ہوتی ہیں جو یقین کے اُس کمال تک پہنچاتی ہیں،جس کا نام حق الیقین ہے۔جِسے یہ حاصل ہوجائے ، اُس کے نفس کو نفسِ مطمئنہ کہا جا تا ہے۔ روحانی چیزوں یعنی وراءالادراک امور پر یقین کے لئے خدائی تجلّی اور رہنمائی لازمی ہے۔اِس کے بغیر غیر متزلزل ایمان حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔اِنشراحِ صدر اِسی کا نام ہے،مؤمن کے ایمان کی بنیاد

قیاس اور اَندازہ پر نہیں ہوتی بلکہ اُس کا ایمان زبردست یقین پر قائم ہوتا ہے۔ایسا ایمان جو مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے اور مشاہدہ کرنے والی ہستی نبی کہی جاتی ہے۔ وہ اپنی صداقت کے زندہ نشان لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو شکوک وشبہات خودبخود مِٹتے چلے جاتے ہیں اور ایمان کی بنیاد مشاہدہ پر اُستوار ہوجاتی ہے۔ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (العصر:۴) میں اِسی بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ مؤمن نہ صرف خود مشاہدہ پر ایمان رکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اِس ایمان اور یقین پر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خطبہ جمعہ فرمودہ ۸؍جنوری؍۱۹۹۹ء میں اِس بات کو لطیف انداز میں آیتِ مندرجہ ذیل کی تفسیر میں کیا خوب کھولا ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۔(البقرۃ:۱۸۷)

تخاطب رسولِ کریمؐ سے ہے کہ جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو کہہ دو کہ مَیں بہت قریب ہوں، یعنی کیا سوال کرنے والا یہ نہیں دیکھ رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خدا بول رہا ہے، جب وہ تجھ سے پوچھیں کہ خدا کہاں ہے تو تُو بتا دے کہ کیا اُن کو تیرے قرب سے خدا کی خوشبو نہیں آرہی؟ پھر اُس کی دلیل یہ دی أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دعا ہے جو رد ہوئی ہو؟ نہیں! تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو سنتا ہے۔ یہاں داعی سے مراد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اگر تم مجھے دیکھنا اور میرا قُرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اِس رسول کے نمونہ پر چلو۔ اِس کا قُرب حاصل کرو۔ دعاؤں کی تصدیق چاہتے ہو یعنی دعاؤں کی قبولیت کی خواہش رکھتے ہو تو اِس رسول کی دعاؤں پر غور کرو۔ وہ دعائیں صرف اُس زمانے کیلئے نہیں تھیں جس

زمانے میں وہ رسول رہ رہا تھا بلکہ ہر زمانے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بھی اسرار آپ پر کھولے اور جو غیب کی خبریں آپ کو دیں، آپ نے اُس زمانے کے لوگوں کے لئے اور خصوصًا اپنے اُمتیوں کے لئے دعائیں کیں۔ دعاؤں کا یہ سلسلہ آفرینش سے قیامت تک دراز ہے۔ آج اِسلام کو جو نئی جہتیں نصیب ہو رہی ہیں۔ نئی نئی کامیابی کی راہیں اسلام کے لئے کھولی جارہی ہیں، وہ سب اِسی پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی قبولیت کی برکت ہے۔ پچھلے ہر دور میں اُن دعاؤں نے رنگ دکھایا اور اِسلام کے دِفاع میں ہر زمانے میں خدا کے پہلوان کھڑے کئے جاتے رہے۔ چنانچہ اگر تم مجھ سے ملنا اور میرا قُرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اِس رسول کے قرب سے فائدہ اُٹھاؤ۔ تمہیں میرا قُرب حاصل ہو جائے گا۔ ''فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ'' مَیں جواب بھی دیتا ہوں یعنی دعاؤں کو قبول کرتا رہوں گا۔ مگر پکارنے والا بھی چاہئے۔ وہ پکارنے والا جس کی دُعا کبھی رد نہیں ہوئی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات تھی۔ تم بھی اُس کے رنگ میں رنگین ہو کر پکارو اور جواب پاؤ۔ نہ صرف جواب پاؤ بلکہ ''وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ'' اپنے ایمان کو تازہ کرو اور یقین کی دولت سے مالا مال ہو جاؤ۔ تم بھی میرے ساتھ اُس قُرب کا ثبوت دو جو اُس پاک رسول نے دیا تھا۔ اگر مَیں اُس کے قریب ہوں تو تمہارے اُس کے قریب ہونے سے میرے قُرب میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ پھر فرمایا لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ اگر ہدایت پانی ہے تو یہی ایک راستہ کُھلا ہے۔ نئے نئے دَر جھانکنے اور نئے نئے راستے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا قُرب اُس کی قربت میں تلاش کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ یقین تمہارا بھی ہوگا جو اِس رسول کو حاصل تھا۔ یعنی خدا تک پہنچنے کا راستہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہو کر گزرتا ہے۔ اُس سے ہٹ کر جتنی بھی راہیں ہیں، وہ گمراہ کُن ہیں۔

یقینِ کامل کو پانا یا حق الیقین کے درجہ تک پہنچنا ایک امتحان، ایک آزمائش کو چاہتا

ہے۔حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لیکچر ''عرفانِ الٰہی'' میں اُس کے حصول کے لئے چھ شرطیں بتائی ہیں۔

۱) **توبہ:۔** توبہ اِستقلال اور اِستقامت کو چاہتی ہے۔ساتھ ہی مُسلسل دعاؤں کے ذریعہ وہ اِستقامت اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا چاہئے۔

۲) **خیالات میں پاکیزگی:۔** بُرے خیال کا دِل میں پیدا ہونا ایک فطری اَمر ہے اور بے اِختیار شئے ہے۔ بُرے خیال کا دل میں پیدا ہونا گناہ نہیں بلکہ اُس کو پرورش کرنا، اُسے پھیلانا اور منصوبہ بندی کے ذریعہ اُسے دراز کرنا گناہ ہے۔ بُرا خیال دل میں پیدا ہوتو اُسے فوراً جھٹک دو، اُس سے پیچھا چُھڑانے کیلئے، ذہن کو کسی اور طرف لگا دو، خیال ایک زبردست طاقت اور صداقت ہے۔ دُنیا میں جتنی بھی مُفید یا بے فائدہ ایجادات ہیں، اُن کا موجب خیالات ہی رہے ہیں۔کوئی بُرا خیال دل میں آئے اور انسان اُس پر عمل نہ کرے تو یہ خود ایک نیکی ہے۔

۳) **تکرار:۔** یعنی جو کام ہم کرنا چاہیں یا کوئی نیک تبدیلی اپنے اندر پیدا کرنا چاہیں تو اُس کے جو لوازم ہیں، اُن کو بار بار دُہراؤ۔قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (المائدۃ:۹۴) یعنی مؤمنوں پر گناہ نہیں، اُن چیزوں کے متعلق جو وہ کھاتے ہیں، جبکہ وہ متقی ہوں اور ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں، (یعنی پہلے ایسا تقوٰی اختیار کریں جس کا نتیجہ ایمان اور عملِ صالح ہوں) پھر تقوٰی کریں اور ایمان لائیں (یعنی ایمان میں ترقی کریں) پھر تقوٰی کو شعار بنائیں اور مُحسن ہو جائیں اور اللہ محسنوں سے محبت کرتا ہے)

اِس آیت میں تین دفعہ تقوٰی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور تین ہی بار تقوٰی کے الگ

الگ نتائج بتائے ہیں۔

پہلے تقوٰی کے ساتھ یہ بتایا کہ اُس کا نتیجہ ایمان اور عملِ صالح ہوں۔ اِن اعمال سے وہی اعمال مُراد ہیں جو اپنی تمام شرائط کے ساتھ کئے جائیں اور ایمان خالص ہو۔ اُس کے بعد فرمایا، پھر تقوٰی کرے۔ اِس کے ساتھ صرف اٰمَنُوْا رکھا۔ یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ پہلے تقوٰی کا نتیجہ ایمان اور عملِ صالح بتایا تھا اور دوسری دفعہ تقوٰی کا حُکم دیتے ہوئے اُس کا نتیجہ صرف ایمان رکھا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ایمان کی ایک قِسم تو وہ ہے کہ اُس کا لازمی نتیجہ اعمالِ صالحہ نہیں ہوتے۔ یعنی ایمان ابھی اپنی پوری پختگی کو نہیں پہنچا ہوتا ہے۔ دوسری قِسم ایمان کی وہ ہے جس کا نتیجہ اعمالِ صالحہ ہوتے ہیں۔ اِس لئے پہلی بار جو تقوٰی کا حُکم دیا تو ناپختگی کے سبب اُس کے ایمان اور عملِ صالح کی شرط رکھی۔

دوسری دفعہ تقوٰی کے حُکم میں صرف ایمان کے حصول کا ذکر کیا۔ یعنی تکرار کے نتیجہ میں اب جو ایمان حاصل ہوگا وہ پہلے سے قوی تر ہوگا اور اُس کے نتیجہ میں اعمالِ صالحہ خود بخود سرزد ہونے لگیں گے۔ اِس لئے اُس کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذکر نہیں کیا۔ تیسری دفعہ فرمایا کہ پھر تقوٰی اختیار کرو اور اُس کے نتیجہ میں مُحسن ہو جاؤ۔ اس میں اشارہ کیا کہ تکرار کے نتیجہ میں ہمیشہ انسان کا قدم آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے، اور ہر دفعہ وہ ایک نئی ترقی کی راہ پر قدم مارتا ہے۔ اِس آیت میں جو اِحسان کا لفظ ہے، اُس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں احسان کی تعریف یہ کی ہے کہ، احسان یہ ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ۔ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔ تو خدا تعالیٰ کی عبادت اِس طرح کر کہ گویا تُو اُس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت نہ پیدا ہو تو کم از کم یہ حالت تو ہو کہ تجھے یقین ہو کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔ اِسی کا نام عِرفانِ الٰہی ہے۔

اِس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ کسی عمل کا تکرار کس قدر ضروری ہوتا ہے اور کس طرح پہلے کی نسبت بڑا نتیجہ نکلتا ہے، کیونکہ فرماتا ہے کہ جب انسان تقوٰی سے کام لیتا ہے تو اُسے ایمان نصیب ہوتا ہے اور اعمالِ صالحہ بجالانے کی توفیق ملتی ہے۔ اِس کے بعد جب وہ پھر تقوٰی کو مشعلِ راہ بناتا ہے تو ایمان اور ترقی کرتا ہے اور ایسا پختہ ہوجاتا ہے کہ اعمالِ صالحہ اُس کے ایمان کا جُز بن جاتے ہیں اور خود بخود ہی اُس سے نیکیاں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ جب وہ پھر تقوٰی سے کام لیتا ہے تو اور بھی ترقی ہوجاتی ہے اور وہ مُحسن کا درجہ پالیتا ہے جس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمائی کہ وہ اللہ کا محبوب ہوجاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ محبوب سے کوئی پردہ نہیں کرتا۔ اِسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ خدا کو دیکھ لیتا اور پالیتا ہے۔ اِسی کا نام عِرفانِ الٰہی یا یقین کامل ہے۔

۴) دوام:۔ اپنی توبہ کو توبۃ النصوح بنائے۔ توبہ اور دعاؤں پر دوام اختیار کرے اور کبھی مایوس نہ ہو۔

۵) ضرورتِ اُستاد:۔ ہر کام کے عُمدہ طور پر سیکھنے کے لئے ایک اُستاد اور سکھانے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس کے لئے فرمایا **کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ** (التوبہ:۱۱۹) کہ سچوں اور نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔ کہتے ہیں کہ زمانہ سب سے بڑا اُستاد ہوتا ہے۔ یہ صحبت وہی زمانے کا حُکم رکھتی ہے۔

۶) محاسبہ:۔ اپنا جائزہ لیتے رہو کہ توبہ جو کی تھی تو وہ اللہ کے ساتھ ایک معاہدہ تھا۔ اُس پر عمل درآمد کا نتیجہ برآمد ہوا یا ہو رہا ہے۔ اور دُعاؤں کے نتائج پر بھی نظر رکھو۔ کوئی کمی نظر آرہی ہو تو دعاؤں پر زور دو اور جو کچھ بھی مانگو اپنے خدا سے مانگو۔ ؎

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو مِنت سے، خوشامد سے، ادب سے مانگو

کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو بندے ہو اگر ربّ کے، تو ربّ سے مانگو

(امجدؔ حیدر آبادی)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے معرکۃ الآراء لیکچر ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' میں بعنوان ''روحانی حالتیں'' حسبِ ذیل عِبارت رقم فرمائی ہے۔

''تیسرا حصہ یعنی یہ کہ روحانی حالتیں کیا ہیں؟ واضح رہے کہ ہم پہلے اِس سے بیان کر چکے ہیں کہ بموجب ہدایت قرآنِ شریف کے روحانی حالتوں کا منبع اور سرچشمہ نفسِ مُطمئنہ ہے جو انسان کو با اخلاق ہونے کے مرتبہ سے باخدا ہونے کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے۔ يَآاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر:۲۸ تا ۳۱) یعنی اے نفس خدا کے ساتھ آرام یافتہ۔ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ۔ وہ تجھ سے راضی اور تُو اُس سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت کے اندر آ جا۔

اِس جگہ بہتر ہے کہ ہم روحانی حالتوں کے بیان کرنے کے لئے اِس آیتِ کریمہ کی تفسیر کسی قدر توضیح سے بیان کریں۔ پس یاد رکھنا چاہئے کہ اعلیٰ درجہ کی روحانی حالت انسان کی اِس دنیوی زندگی میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آرام پا جائے۔ اور تمام اطمینان اور سُرور اور لذّت اُس کی خدا میں ہی ہو جائے۔ یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں بہشتی زندگی کہا جاتا ہے۔ اِس حالت میں انسان اپنے کامل صدق اور صفا اور وفا کے بدلہ میں ایک نقد بہشت پا لیتا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کی بہشتِ موعود پر نظر ہوتی ہے اور یہ بہشتِ موجود میں داخل ہوتا ہے۔ اِسی درجہ پر پہنچ کر اِنسان سمجھتا ہے کہ وہ عبادت جس کا بوجھ اُس کے سَر پر ڈالا گیا ہے، درحقیقت وہی ایک ایسی غذا ہے جس سے اُس کی روح نشوونما پاتی ہے اور جس پر اُس

کی روحانی زندگی کا بڑا بھاری مدار ہے۔ اور اُس کے نتیجہ کا حصول کسی دوسرے جہاں پر موقوف نہیں ہے۔ اِسی مقام پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ساری ملامتیں جو نفس لوامہ انسان کا اُس کی ناپاک زندگی پر کرتا ہے، اور پھر بھی نیک خواہشوں کو اچھی طرح اُبھار نہیں سکتا اور بُری خواہشوں سے حقیقی نفرت نہیں دِلاسکتا اور نہ نیکی پر ٹھہرنے کی پوری قوت بخش سکتا ہے، اُس پاک تحریک سے بدل جاتی ہیں، جو نفسِ مطمئنہ کے نشوونما کا آغاز ہوتی ہے۔ اور اِس درجہ پر پہنچ کر وقت آجاتا ہے کہ اِنسان پوری فلاح حاصل کرے۔ اور اب تمام نفسانی جذبات خود بخود افسردہ ہونے لگتے ہیں۔ اور روح پر ایک ایسی طاقت افزا ہوا چلنے لگتی ہے جس سے انسان پہلی کمزوریوں کو ندامت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُس وقت انسانی سرشت پر ایک بھاری اِنقلاب آتا ہے اور عادات میں ایک پاک تبدّلِ عظیم پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان اپنی پہلی حالتوں سے بہت ہی دور جا پڑتا ہے۔ دھویا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے اور خدا نیکی کی محبت کو اپنے ہاتھ سے اُس کے دِل میں لِکھ دیتا ہے۔ اور بدی کا گند اپنے ہاتھ سے اُس کے دل سے باہر پھینک دیتا ہے۔ سچائی کی فوج سب کی سب دل کے شہرستان میں آجاتی ہے۔ اور فطرت کے تمام بُرجوں پر راست بازی کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل بھاگ جاتا ہے اور اپنے ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ اُس شخص کے دِل پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر ایک قدم خدا کے زیرِ سایہ چلتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ آیاتِ ذیل میں اِنہی اُمور کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔

أُولٰئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلة:۲۲) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۔ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔(الحجرات:۸۔۹) جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ

زَھُوۡقاً (بنی اسرائیل:۸۲) یعنی خدا نے مؤمنوں کے دل میں ایمان کو اپنے ہاتھ سے لکھ دیا ہے اور روح القدس کے ساتھ اُن کی مدد کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا اور اُس کا حسن و جمال تمہارے دل میں بٹھا دیا۔ اور کفر اور بدکاری اور معصیت سے تمہارے دل کو نفرت دیدی۔ اور بُری راہوں کا مکروہ ہونا تمہارے دل میں جما دیا۔ یہ سب کچھ خدا کے فضل اور رحمت سے ہوا۔ حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ اور باطل کب حق کے مقابل ٹھہر سکتا تھا۔

غرض یہ تمام اشارات اُس روحانی حالت کی طرف ہیں جو تیسرے درجہ پر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور سچی بینائی انسان کو کبھی نہیں مل سکتی جب تک یہ حالت اُس کو حاصل نہ ہو اور یہ جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے ایمان اُن کے دل میں اپنے ہاتھ سے لکھا اور روح القدس سے اُن کی مدد کی۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو سچی طہارت اور پاکیزگی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک آسمانی مدد اُس کے شاملِ حال نہ ہو۔ نفسِ لوامہ کے مرتبہ پر انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ بار بار توبہ کرتا اور بار بار گرتا ہے بلکہ بسا اوقات اپنی صلاحیت سے نااُمید ہو جاتا ہے اور اپنے مرض کو لاعلاج سمجھ لیتا ہے اور ایک مُدت تک ایسا ہی رہتا ہے۔ اور جب وقت مقررہ پورا ہو جاتا ہے تو رات کو یا دن کو یک دفعہ ایک نور اُس پر نازل ہوتا ہے اور اُس نور میں الٰہی قوت ہوتی ہے۔ اُس نور کے نازل ہونے کے ساتھ ہی ایک عجیب تبدیلی اُس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور غیبی ہاتھ کا ایک قوی تصرف محسوس ہوتا ہے اور ایک عجیب عالَم سامنے آ جاتا ہے۔ اُس وقت انسان کو پتہ لگتا ہے کہ خدا ہے۔ اور آنکھوں میں وہ نور آ جاتا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ لیکن اِس راہ کو کیونکر حاصل کریں اور اِس روشنی کو کیونکر پاویں۔ سو جاننا چاہئے کہ اِس دنیا میں جو دارالاسباب ہے ہر ایک معمول کے لئے ایک عِلّت ہے۔ اور ہر ایک حرکت کے لئے ایک محرّک ہے اور ہر ایک عِلم حاصل کرنے کے لئے ایک راہ ہے۔ جس کو صراطِ مُستقیم

کہتے ہیں۔دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو بغیر پابندی اِن قواعد کے مِل سکے جو قدرت نے ابتداء سے اِس کیلئے مقرر کر رکھے ہیں۔

قانونِ قدرت بتلا رہا ہے کہ ہر ایک چیز کے حصول کے لئے ایک صراطِ مستقیم ہے اور اُس کا حصول اُسی پر قُدرتاً موقوف ہے۔مثلاً اگر ہم ایک اندھیری کوٹھری میں بیٹھے ہیں اور آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہوتو ہمارے لئے یہ صراطِ مستقیم ہے کہ ہم اُس کھڑکی کوکھول دیں جو آفتاب کی طرف ہے۔تب یک دفعہ آفتاب کی روشنی اندر آ کر ہمیں مُنور کر دے گی۔سو ظاہر ہے کہ اِسی طرح خدا کے سچے اور واقعی فیوض کے پانے کیلئے بھی کوئی کھڑکی ہوگی اور پاک روحانیت کے حاصل کرنے کیلئے کوئی خاص طریق ہوگا۔اور وہ یہ ہے کہ روحانی اُمور کے لئے صراطِ مُستقیم کی تلاش کریں۔جیسا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام اُمور میں اپنی کامیابیوں کے لئے صراطِ مستقیم کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔مگر کیا وہ طریق یہ ہے کہ ہم صرف اپنی ہی عقل کے زور سے اور اپنی ہی خودتراشیدہ باتوں سے خدا کے وصال کو ڈھونڈیں۔کیا محض ہماری ہی اپنی منطق اور فلسفہ سے اُس کے وہ دروازے ہم پر کُھلتے ہیں جن کا کُھلنا اُس کے قوی ہاتھ پر موقوف ہے۔یقیناً سمجھو کہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ہم اُس حی وقیوم کو محض اپنی ہی تدبیروں سے ہرگز نہیں پاسکتے۔بلکہ اِس راہ میں صراطِ مستقیم صرف یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی زندگی مع اپنی تمام قوتوں کے خداتعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے خدا کے وصال کے لئے دُعا میں لگے رہیں تا خدا کو خدا ہی کے ذریعہ سے پاویں۔''

(اسلامی اُصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰، صفحہ ۳۷۷ تا ۳۸۰)

پھر آگے سب سے پیاری دُعا یعنی سورۃ فاتحہ کا ذکر کر کے اُس کی مُختصر تفسیر ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

''اور اِس دُعا کے ساتھ اپنے تمام قوٰی سے عبادت بجالاتے ہیں اور گناہ سے پرہیز کرتے اور آستانہءالٰہی پر پڑے رہتے ہیں اور جہاں تک اُن کے لئے ممکن ہے اپنے تئیں بدی سے بچاتے ہیں اور غضبِ الٰہی کی راہوں سے دُور رہتے ہیں۔ سو چونکہ وہ ایک اعلیٰ ہمت اور صدق کے ساتھ خدا کو ڈھونڈتے ہیں، اِس لئے اُس کو پالیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی پاک معرفت کے پیالوں سے سیراب کئے جاتے ہیں۔ اِس آیت میں جو اِستقامت کا ذکر فرمایا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے سچا اور کامل فیض جو روحانی عالَم تک پہنچاتا ہے کامل استقامت سے وابستہ ہے اور کامل استقامت سے مُراد ایک حالتِ صدق ووفا ہے جس کو کوئی امتحان ضرر نہ پہنچا سکے۔ یعنی ایسا پیوند ہو جس کو نہ تلوار کاٹ سکے نہ آگ جلا سکے اور نہ کوئی دوسری آفت نقصان پہنچا سکے۔ عزیزوں کی موتیں اُس سے علیحدہ نہ کرسکیں۔ پیاروں کی جُدائی اُس میں خلل انداز نہ ہوسکے۔ بے آبروئی کا خوف کچھ رعب نہ ڈال سکے۔ ہولناک دُکھوں سے مارا جانا ایک ذرہ دل کو نہ ڈرا سکے۔ سو یہ دروازہ نہایت تنگ ہے اور یہ راہ نہایت دشوار گزار ہے''۔

(اسلامی اُصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰، صفحہ ۳۸۲)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ہی صِدق وصفا، عزم واستقلال، استقامت، عِرفان اور یقینِ کامل کا مُرقع رہی ہے۔ آپ کی زندگی کے چندایک واقعات جو ایمان ویقین سے پُر آپ کی شخصیت اور کردار کے حیرت ناک پہلو ہمارے سامنے لاتے ہیں، آپ کے آگے پیش کرتا ہوں، آپ کی حیاتِ مقدسہ کا ہر لمحہ اپنے مُحسن خدا کیلئے فدائیت اور قربانیوں سے عبارت ہے۔ وہ مرتبہ یقین واذّعان کا جو آپ کو نصیب تھا، کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ہاں! مگر آپ کے غلاموں کو بقدر ہمت واستطاعت اور محبت جو انہوں نے اِس جاہ وجلال کے نبی کے ساتھ دکھائی۔ یہ انعام دیا گیا، اُنہیں ربِّ کریم نے اپنے کلام سے شرف اور

غیرت بخشی اور آج بھی وہ دروازہ بقدر اپنی اپنی وُسعت کے کُھلا ہوا ہے۔ مگر اُس کے لئے ایک صراطِ مُستقیم مقرر ہے۔ اور وہ ہے امامِ وقت کی شناخت، اُسے پہچاننا، اُس پر ایمان لانا، اور اُس کے کِردار اور سیرت میں اپنے پیارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو محسوس کرکے، استقامت کا ثبوت دینا اور اُس موت کو قبول کرنا جس کا نام حقیقی اسلام ہے کہ اُس موت کے بعد درحقیقت ہم زندہ ہوتے ہیں اور لقاءِ الٰہی کا شربت اِس موت کا انعام ہے۔ یہ جو اُوپر ذکر ہوا ہے کہ خدا کے لئے اپنے آپ کو وقف کردینا یا قربانیوں کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا وغیرہ تو اِس سے مراد تمام کام کاج اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کے خَلوت گزین ہوجانا نہیں ہے۔ جب ایسا کام ہمارے پیارے رسول نے نہیں کیا تو ہم سے کیونکر اُس کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اِس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو بھی کام ہم کرتے ہیں اور جو زندگی ہم گزار رہے ہیں، اُس میں اُس راہِ عدل اور میانہ روی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ جو اسلام کا مقصدِ اعلیٰ اور اخلاقِ عالیہ اسلامیہ کا عین منشاء ہے۔ ہم چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے رہیں لیکن ہماری روح ہمیشہ خالقِ حقیقی کے آگے سجدہ ریز رہے اور ظاہر ہے سجدہ کی حالت حقیقی عبودیت اور فروتنی کی مظہر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وصل کی راہ میں پہلا قدم ہی سب سے اہم ہوتا ہے۔ جسے اُٹھاتے ہوئے آدمی ڈرتا ہے لیکن جیسے ہی وہ قدم اُٹھ جاتا ہے، پھر آگے کا ہر قدم حوصلے اور اِعتماد کو بڑھاتا جاتا ہے یہاں تک کہ تمام اندیشوں کا دھواں غائب ہوجاتا ہے اور آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

ا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یقینِ کامل کے واقعات میں پہلا واقعہ ابوطالب کا ہے۔ مکہّ کے بڑے بڑے لوگ اکٹھے ابوطالب کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو یہ پیغام دے دیں کہ اگر وہ دولت کا خواہشمند ہے تو ہم اُسے اتنی دولت دینے کو تیار ہیں کہ وہ ہم میں سے سب سے زیادہ دولت مند ہوجائے۔ اگر وہ حسین بیوی کا شائق ہے تو ہم

عرب کی سب سے خوبصورت لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی کروادیں گے۔اگر وہ حکومت یا ریاست کا شوقین ہے تو ہم اُسے اپنا بادشاہ ماننے کے لئے تیار ہیں۔وہ ہماری صرف اِتنی بات مان لے کہ ہمارے بُتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔اگر آپ کے دِل میں اپنے یقین پر ذرا بھی تذبذب ہوتا یا لالچ کا کوئی محرک بھی آپ کے قلب میں پایا جاتا تو اِس پیغام پر آپ خوش ہوتے کہ چلو مقصد حاصل ہو گیا۔مگر آپ نے یہ جواب نہیں دیا۔آپ نے اپنے چچا کو یہ جواب دیا کہ اے میرے چچا! اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لاکر کھڑا کر دے، تب بھی مَیں اپنے عقائد پر قائم رہوں گا۔

۲) ہجرت کے وقت گھر سے نکلنے کا واقعہ بھی آپ کے اپنے خدا پر یقینِ کامل کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔آپ کو یہ علم ہو چکا تھا کہ باہر کُفار آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے جمع ہیں۔مگر چونکہ خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ کفار تیری ہلاکت کے خواہ کتنے ہی منصوبے کریں وہ تجھے قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔اِس لئے بغیر کسی گھبراہٹ کے گھر سے نکل آئے اور بڑی دلیری سے کفار کے درمیان سے گزر گئے۔کوئی اور شخص ہوتا تو اُس کے اوسان خطا ہو جاتے اور قدم لڑکھڑا جاتے لیکن آپ بڑی جُرأت سے دشمن کی قطار کے سامنے سے گزر گئے۔آپ کے چہرے پر پوری بشاشت اور اطمینان تھا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

۳) تیسرا واقعہ غارِ ثور کا ہے۔دشمن سَر پر آپہنچا ہے۔حضرت ابوبکرؓ گھبرا رہے ہیں مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (التوبہ:۴۰) گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔اللہ ہمارے ساتھ ہے۔اُس کے ہوتے ہوئے یہ لوگ کیا کر سکتے ہیں۔نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔دشمن خائب و خاسر واپس چلا گیا۔

۴) چوتھا واقعہ غزوۂ خندق کا ہے۔دشمن مدینہ میں گُھس آیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔قرآنِ کریم نے سورۂ احزاب میں اِس کا اعلیٰ نقشہ کھینچا ہے۔جب دشمن سمجھ رہا تھا کہ میدان مار لے گا۔اُس وقت مؤمن بندے کہہ رہے تھے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کی باتیں پوری ہوگئیں۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَاناً وَّتَسْلِيْمًا۔ (احزاب: ۲۳) یعنی مؤمنوں کا یہ حال تھا کہ بجائے گھبرانے کے وہ خوش خوش پھرتے تھے کہ خدا نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہوگیا۔یہ بھی ثبوت ہے اُس شرحِ صدر کا۔

❁❁❁

(5)

حقوق اللہ اور حقوق العباد

حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی منجملہ اور عقائد کے اسلام کے مہتم بالشان داعیات اور عقائد میں شمار ہوتے ہیں۔ بعض علماء نے اِنہیں عقائدِ اسلامیہ سے خارج قرار دیا ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ حقوق اللہ کوئی چیز نہیں۔ وہ بھی دراصل حقوق العباد ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے کسی بھی بدلے کی آرزومند ہونے سے بہت بالا ہے، کیونکہ وہ بے نیاز ہے۔ ایک حد تک تو یہ بات درست ہے، لیکن اِس کو عام کرنا انسانوں کے مفاد میں نہیں بلکہ فساد میں داخل ہے۔ حقوق العباد تو سمجھ میں آ گئے کہ انسانوں کا انسانوں پر یا بندوں کا بندوں پر جو حق ہے اُسے پورا کیا جانا چاہئے۔ اُس سے روگردانی مُضر اخلاق ثابت ہوتی ہے۔ مذاہب کا اور خصوصاً اِسلام کا بنیادی مقصد قیامِ اخلاق ہی ہے۔ ایک مسلمان نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تمام اُمور کی پابندی کرتا ہے مگر معاملات میں اُصول وضوابط اور اخلاق کی پابندی نہیں کرتا تو اُس کا عبادات کا پابند ہونا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا کیونکہ عبادات کے قیام کا مقصد ہی معاملات میں سُدھار اور لین دین میں صحت کا قائم رکھنا ہے۔ اور اِسی سے تمدنی اور معاشرتی فائدہ مُتصور ہے۔ جہاں تک معاملات کا تعلق ہے اُس میں فرض اور حق دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ تاہم لوگ اِن کے الگ الگ نام رکھتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے کو قرض دیتا ہے۔ دوسرے پر لازم ہے کہ وہ حسبِ وعدہ وقت پر وہ قرض واپس کردے۔ قرض دینے والا اپنی چیز کا مطالبہ کرتا ہے تو حق کہہ کر کرتا ہے، یعنی جو میرا حق ہے وہ مجھے ادا کرو۔ اور قرض ادا کرنے والا یا قرض لوٹانے والا اُسے فرض

سمجھ کر لوٹا تا ہے۔ کہ یہ میرا فرض ہے کہ مَیں اپنے محُسن کا قرض وقت پر ادا کروں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو قرض کا تارک کہلاتا ہے۔ لیکن حق کی کئی صورتیں ہیں، جب تک وہ متعین نہ ہوں، فرض کی صورت بھی متعین نہیں ہوتی۔ فرض یا حق سے مُراد کسی اِحسان، ایثار یا الطاف و کرم کا احساس اور اعتراف کرنا ہے۔ اِس معاملہ میں ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ ایثار یا احسان کرنے والا، اور پھر اُس کو قرض اور اُس کی ادائی کو فرض سمجھ کر وقت پر لوٹانے والا دونوں تقریباً ایک سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ احسان کرنے والا اپنے ایثار اور لُطف و کرم میں بہت اونچا درجہ رکھتا ہے اور اُس کے معاوضے کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ جب وہ دیتا ہے تو اُس کے دل میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اِسے واپس بھی لینا ہے۔ مثلاً ہم کسی غریب، مفلس یا ننگے بھوکے کی وقت پر مدد کر دیتے ہیں، یا کسی فقیر کو خیرات میں کوئی چیز دیتے ہیں تو ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ اِسے واپس لے لینا، کیونکہ یہاں دینے اور لینے والوں کی حیثیت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک غریب شناسا کی ہم نے اُس کے بُرے وقت میں مدد کی۔ ہمارے گمان میں یہ بھی نہیں گزرا کہ کبھی اِسے واپس بھی لینا ہے۔ اور نہ ہی لینے والے نے سوچا کہ یہ قرض ہے اور مجھے لوٹانا پڑے گا۔ لیکن ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ ہم مالی لحاظ سے اُس شخص کی سطح پر آجاتے ہیں اور وہ غنی ہو جاتا ہے۔ اب اگر اُسے احساس ہے اور اُس نے ہمیں یاد بھی رکھا ہے، یا اُسے یاد رکھنا چاہئے، تو اُس کا فرض ہوتا ہے کہ ہماری مدد کرے، معاملات میں ایک تیسری صورت اور بھی ہوتی ہے، وہ یہ کہ احسان اور کرم کرنے والی ہستی ایک ایسا مبداِ فیض اور منبع جود و کرم ہوتا ہے کہ وہ بلا تخصیص اور بلا کسی غرض و سبب کے عام لطف و کرم کا عادی ہوتا ہے۔ جیسے سورج ہے کہ اُس کا لُطف و احسان یعنی اُس کی روشنی دشت و دَمن، صحرا اور باغ، خشک و تر اور وادی و مَرغزار سب کے لئے عام اور سب کے لئے حیات افروز ہے۔

جیسے مثلاً پھول ہے۔ پھول کی خوشبو اور نکہت اور اُس کی شامہ نوازی کسی بھی محدود زمان و مکان سے ماورا اور سب کے لئے عام ہے۔ جیسے بادل ہے، وہ شاہ و گدا، خشکی و تری، صبح و شام اور نشیب و فراز کسی چیز کی تخصیص کا روادار نہیں۔ اِن حالات میں نہ تو کوئی سوال حق اور فرض کا پیدا ہوتا ہے اور نہ اُس احسان کے لوٹانے یا ادا کئے جانے کا۔

اللہ تعالیٰ اور بندے کا تعلق بھی اِسی تیسری شِق اور قِسم کے تحت آتا ہے۔ اِنعامات خداوندی بِلا تخصیص، بلا غایت اور غرض کے ہر شئے پر یکساں ہیں۔ اُن لوگوں پر بھی جو اُس کا انکار کرتے ہیں بلکہ اُن پر بھی جو اُس کی برائی کرنے میں بے جا جسارت سے کام لیتے ہیں۔ اُس کا کرم و الطاف یکساں جاری و ساری ہے اور وہاں ادائی یا مطلوبہ ادائی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اگر ہم کوئی حق اپنے اوپر خدا تعالیٰ کا تسلیم کرتے ہیں تو اُس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم خدا تعالیٰ کو صاحبِ احتیاج بھی تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ ایسا خیال بھی کُفر ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کا کوئی حق ہم پر ہے اور اُس کا ادا کرنا ہم پر فرض ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ہمیں نعمتوں سے نوازنا، عقل و اِدراک، فہم و شعور اور دنیا بھر کے لذائذ و نعائم مہیا کرنا کسی ایسی غرض سے ہے جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی فائدہ پوشیدہ ہے۔ اور اگر ہم اپنے فرض کی ادائی میں کوتاہی کریں گے تو ہم سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی ذات اِس قدر بلند ہے اور ایسی عُلوِ شان رکھتی ہے کہ اُس کے ساتھ کسی غرض یا سبب کی نسبت ممکن ہی نہیں کیونکہ وہ تو ہر قِسم کے تاثرات سے بے نیاز ہے۔

ہاں! ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم غور کریں کہ حقوق اللہ کے تعلق سے ہماری فطرت میں کیا احساس ودیعت کیا گیا ہے، تو سب سے پہلے یہی خیال آتا ہے کہ اُس کی ذات اور اُس کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور برحق مانا جائے۔ لیکن اگر کوئی اِس سے بھی اِنکار کر دے تو خدا تعالیٰ

کی ذات کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ہاں ! ہمارا اِس میں ایک نقصان ہے۔ اور وہ یہ کہ ہماری جِبلّت میں احسان فراموشی اور ایک قِسم کی بے نیازی ہر اُس چیز سے جو ہمارے لئے جود وسخا کا منبع ہے، پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے معاشرے اور تمدن کے صحت مندانہ قیام میں یہ چیز بے حد نقصان دہ اور رُکاوٹ ڈالنے والی ہے۔ گویا کہ اِس احساس اور اعتراف کا تعلق جس سے ہم روگردانی اختیار کر رہے ہیں۔ نظامِ اخلاق سے ہمارا یہ انکار اور بے نیازی دنیا کے امن کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی سمجھدار اور احساسِ ذمہ داری رکھنے والا انسان، معاشرے اور تمدن کے اِس نقصان پہنچانے کو دانستہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اِس نقصان کا مرتکب ہو کر اپنے آپ پر فخر کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے الطاف وکرم کے مقابلے میں ہم میں سے کسی فرض کی ادائی کی امید رکھتا ہے۔ نہ صرف ذاتِ باری کا استخفاف ہے بلکہ معنوی شرک میں داخل ہے۔

ابھی جو مَیں نے بیان کیا ہے وہ نیچریوں اور فلاسفروں کے اندازِ فکر اور رُجحان کی ترجمانی ہے۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے اور اپنے اندر معقولیت کا رنگ رکھتی ہے لیکن اِس سے آگے جب فلاسفر اور مفکر غور کرتے ہیں تو اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا کا کام ایک با قاعدہ پلان اور قاعدے قانون کے تحت چل رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اب اِس میں دخل نہیں دیتا اور کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ ہمارے فائدے اور نقصان سب نیچر کے اِس مقرر کردہ قانون کے صحیح اور غلط استعمال میں مضمر ہیں۔

اِس بات سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ''دعا'' کوئی چیز نہیں۔ ہمارے مقاصد کی تکمیل یا عدمِ تکمیل سب کچھ حالاتِ زمانہ اور اُن سے نبرد آزما ہونے کے ہمارے طریق پر منحصر ہے۔ جب اس طرح غور کرتے جایئے تو خدا تعالیٰ کی نسبت بہت سی صفات کو معطل ماننا پڑتا

ہے۔جن میں نمایاں صفات اُس کا کلام کرنا، ہماری باتوں کا جواب دینا اور ہماری التجاؤں اور ہمارے اضطراب پر حالات کو ہمارے فائدے کے لئے موڑ دینا وغیرہ شامل ہیں۔

یہ تو تھا حال معاملات کا۔اب اُن عبادات کو لیتے ہیں جنہیں حقوق اللہ میں شمار کیا جاتا ہے۔یوں تو انسان کی زندگی کا ہر لمحہ عبادتِ الٰہی کا تقاضا کرتا ہے۔دنیا میں جب تک آدمی زندہ رہتا ہے۔اُس کا ہر فعل اور اُس کی ہر احتیاج جس کے پورا کرنے میں وہ لگا ہوا ہے، اُس سے ایک ڈھنگ، ایک سلیقہ، ایک اُصول اور ضروری مناسبِ حال نیک عمل کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر وہ اُن کے پورا کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا اور اپنے مفوضہ کاموں کو پورے سلیقے اور حوصلے کے ساتھ انجام دیتا ہے تو وہ عبادت میں داخل ہے۔

مائلِ دیر و حرم تو نے یہ سوچا بھی کبھی
زندگی خود ہی عبادت ہے اگر ہوش رہے

آیئے اُن عبادات کو لیں۔جن کو فرائض کے طور پر ادا کرنا ہم پر لازم ہے۔اور جنہیں عام طور پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار اور بے پایاں عنایات کا بدل سمجھا جاتا ہے۔سب سے پہلے نماز ہے۔نماز کا فائدہ کیا ہے؟ نماز کی تیاری کے ساتھ ہی ایک مخصوص پاکیزگی کا خیال دل میں جگہ بنا لیتا ہے، وضو کرنا، پھر مخصوص ڈھنگ سے کھڑا ہونا، جُھکنا، اُٹھنا، بیٹھنا، سجدہ کرنا وغیرہ جوارح کو مُستعد رکھنے کا ذریعہ ہیں خصوصاً اجتماع اور یکجہتی کی صورت جو صف بستہ نمازیوں میں پائی جاتی ہے، وہ ہماری اجتماعی زندگی اور ہمارے تمدن کے فروغ میں کِس قدر کارآمد ہے۔ ''فحشاء اور منکر'' سے بچنے کی صورت میں جو تزکیہ اخلاق حاصل ہوتا ہے، وہ خود ہمارے لئے اور ہمارے معاشرے کے لئے کِس قدر مُفید اور دُوررَس نتائج کا حامل ہے اور ہمارے قومی اور مِلّی مفاد اور اِرتقاء کا لازمی جُز ہے۔اگر ہم نمازوں کی پابندی نہیں کرتے تو اُس کے معنے یہ

ہوئے کہ ہم اپنی قومی اور مِلّی حیات کیلئے ونیز معاشرے کی بھلائی کے لئے اور اجتماعی وتمدنی ترقی کیلئے کچھ نہیں کرنا چاہتے۔سعادت اور خوش حالی کو ہم اہمیت نہیں دیتے، گویا کہ ترکِ نماز اُن تمام حقوق کی پامالی ہے، جو قوم کی طرف سے اُس کے ایک ایک فرد پر عائد ہوتی ہیں۔اور اِس طرح ہم دانستہ ایک قومی نقصان کا موجب بنتے ہیں۔ثابت ہوا کہ یہ نماز جس کا نام ایک عبادت ہے،خود ہمارے ذاتی اور قومی فائدے کے لئے ضروری ہے،اب غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت حقوق اللہ سے بڑھ کر حقوق العباد سے قریب تر ہے، دوسرا رُکن حج ہے، یہ بھی دراصل نماز ہی کے مقاصد کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے،مگر ایک زیادہ وسیع دائرے میں،اخوتِ عامہّ کی بنیادوں کو مضبوط کرنا اِس کا مقصدِ اوّلین ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی حقوق العباد ہی کا ایک شعبہ ہے، یہی حال روزے کا بھی ہے کہ ہمارے دل مساکین اور محتاجوں کی ضرورتوں، حاجتوں اور محرومیوں کا صحیح اِدراک کرسکیں، اور اُن کی مدد کی طرف متوجہ ہوں، اگر روزہ یہ جذبات ہم میں پیدا نہیں کرتا تو روزہ، روزہ نہیں کہلاسکتا، اور ایک بے معنی چیز بن کر رہ جاتا ہے،معلوم ہوا کہ یہ عبادت بھی حقوق العباد ہی میں شامل ہے،اسی طرح زکوٰۃ ہے اور اِس کے مصالح اور افادیت سے سب ہی واقف ہیں، یعنی بظاہر حقوق اللہ کہلانے والے تمام اعمال حقوق العباد ہی سے متعلق ہیں، اور اُن کا فیض صرف ہماری ذاتی اور اجتماعی افادیت کو محیط ہے۔

اَب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اِن اعمال کو حقوق اللہ کا نام کیوں دیا گیا ہے ؟ اِس کی بظاہر وجہ یہی سمجھ آتی ہے کہ مذہب اور فلسفۂ مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔انسانی عقول کو بھی ہم دو حصوں میں بانٹ لیتے ہیں کہ عقولِ انسانی کا ایک حصہ تو وہ ہے جو جاہلوں، اَن پڑھ اور کم تعلیم یافتہ لوگوں سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا وہ جو ذہین اور قوتِ متفکرہ رکھنے والے انسانوں سے متعلق ہے۔جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کو ایک بات سمجھانی ہو وہ طریق اختیار نہیں کیا جاسکتا جو

ایک فلاسفر کو سمجھانے کیلئے کارآمد ہے، اور نہ ہی صاحبِ عقل و فراست لوگوں کو اُس طریق اور اُن مثالوں سے مطمئن کیا جاسکتا ہے جو ہم بچوں کو یا کم عقل لوگوں کو سمجھانے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص جب تک فلسفۂ مذاہب سے پوری طرح واقف نہ ہوجائے، مذہب کو اختیار نہ کرے۔ اگر وہ نتیجہ جو مذہب کی پابندی سے پیدا ہونا چاہئے، بغیر فلسفہ کی مُوشگافیاں جو ایک عام عقل والے آدمی کے لئے لایعنی ہیں، اگر اُس کے سامنے رکھی جائیں تو وہ مذہب سے بیزار ہی ہوجائے گا۔ ایسے موقعہ پر مناسب حال عمل یعنی عملِ صالح یہی ہوگا کہ اُسے علمی توجیہوں میں اُلجھائے بغیر عام پیرائے میں ضروری اُمور کی طرف راغب کریں جیسے یہ کہیں کہ عبادات کا بجالانا ہمارا فرض ہے، اللہ کا حق ہے کیونکہ اُس نے بے شمار انعامات سے ہمیں نوازا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اِس سے خاص قِسم کی خشیت اُس کے اندر پیدا ہوجائے گی، اور وہ نتیجہ ازخود، تمام باریکیوں کے جاننے کے بغیر پیدا ہوجائے گا جو کسی بھی عبادت کی پابندی سے مقصود ہے۔ اگر اُسے یہ بتایا جائے کہ نماز میں کیا کیا قومی فوائد مُضمر ہیں تو وہ بوجہ اپنی کوتاہ فہمی اور کوتاہ نظری کے اور اجتماعی فوائدِ قومی کا اِدراک نہ رکھنے کے، نماز کی اہمیت سے بیگانہ ہوجائے گا۔

ابھی تک ہونے والی گفتگو، موجودہ نیچری خیالات کے حامل لوگوں کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ اِس میں ایک خاص قِسم کی معقولیت جو نظر آتی ہے، اُس کا نُقطہء آخری یہیں تک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو عقل سے بہرہ ور کیا ہے، لیکن عقل چونکہ اُس وقت تک اندھی ہے جب تک کہ نیّرِ الہام سے حصہّ نہیں پاتی، اِس لئے اُس کے ریکارڈ کی سوئی یہاں تک آکر پھنس جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بغیر عقل نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی۔ وحی و الہام اور رؤیا کشوف صرف نبوت سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ مؤمنانہ ظرف سے تعلق رکھتے ہیں،

ایک فلاسفر ایک نبی میں یہی فرق ہوتا ہے۔فلاسفر اور نبی دونوں ہی دنیا کی بھلائی اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے سوچتے ہیں۔اُن کی سوچ اور فکر جہاں تک جاتی ہے، وہ منزل تقریباً ایک ہی ہوتی ہے،لیکن فلاسفر ایک انتہائی نقطہ تک پہنچ کر رُک جاتا ہے اور اُس کی فکر کہتی ہے بس ''یوں ہونا چاہئے'' لیکن نبی کے ساتھ چونکہ اللہ کی مدد ہوتی ہے اور اُس کی قوتِ متفکرہ کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کارفرما ہوتا ہے، وہ اپنی سوچ اور فکر کے نتیجہ کو عملاً ثابت کر کے ''یوں ہے'' کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔صرف عقل پر بھروسہ کرنا اور اُس کے تجویز کردہ حل کو ہی حَرفِ آخر سمجھنا ہمیشہ نادرست ثابت ہوتا ہے۔فلاسفروں اور حکیموں وطبیبوں کی تھیوریاں وقفہ وقفہ سے اِسی لئے بدلتی رہتی ہیں کہ اُن کے ساتھ الہام کا نور نہیں ہوتا۔اِسی لئے ماہرین نے اِس باب میں اپنی رائے یہ دی ہے کہ ایک پاگل اور جینیس (GENIUS) میں بہت معمولی فرق ہوتا ہے یعنی اگر پاگل، پاگل نہ ہوتا تو ضرور جینیس ہوتا۔

یہ کہنا اور سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نے نیچر کا جو قانون بنا دیا ہے، اُس میں کوئی لچک نہیں اور ہماری دعائیں، ہمارا اضطرار اور اضطراب، ہماری تڑپ اور ہماری بے قراریاں، اللہ تعالیٰ کو بالکل متاثر نہیں کرتیں اور ہم نیچر کے اصولوں کے ایسے پابند ہیں کہ اُن کے صحیح یا غلط استعمال پر ہی ہمارے اعمال کے نتائج مترتب ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بے نیازی میں انتہائی غلو کو داخل کردینا ہے،شاید ایسے ہی کسی موقعہ پر غالبؔ کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک

ہم سنائیں حالِ دل اور آپ فرمائیں، کیا؟

غالب نے تو پھر بھی نتیجہ میں ''کیا؟'' یعنی ''کیا کہا'' کے جواب کی گنجائش رکھی ہے،مگر علماءِ نیچر اِس کے بھی قائل نہیں۔اُن کے خیال میں ہماری تڑپ اور بیقراری ہمارے معشوق اور

محبوب خدا تعالیٰ پر کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کر کے اپنی ذمہ داریوں کو سمیٹ لیا اور بہت کم کر لیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ جو ایمان افروز ہے یہاں پیش کرتا ہوں۔ حضرت جابر بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں کہ مَیں پہلی بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا تھا تو مجھے پتہ چلا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ میرے استفسار پر فرمایا کہ ہاں! مَیں اُس کا رسول ہوں جسے تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ تمہاری تکلیف دُور کر دیتا ہے۔ تم خُشک سالی میں اُس سے دُعا کرتے ہو تو وہ تمہاری کھیتیاں ہری بھری کر دیتا ہے، یا تمہیں اناج کی تکلیف سے نجات عطا کرتا ہے، اگر کسی لق ودق صحرا میں تمہارا اونٹ کھو جاتا ہے اور تم اپنے اللہ کو پکارتے ہو، تو وہ اونٹ کو تم تک واپس پہنچا دیتا ہے۔

دراصل انسان ضعیف البنیان واقع ہوا ہے، وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی مدد اور رہنمائی کا محتاج ہے، اگر نیچری مکتب کو صحیح سمجھا جائے تو انسان کی اصلاحِ احوال کے لئے بار بار انبیاء کا مبعوث کیا جانا کِس زُمرے میں آتا ہے، وہ تو کہتا ہے کہ ”اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ۔ (البقرۃ:۱۸۷) یعنی مَیں پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ پکارتا ہے سنتا ہوں اور جواب بھی دیتا ہوں۔

حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے مجیب ہونے کا بار بار ثبوت دیتا ہے اور دیتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اُس کے عاشق بندے بے موت مر جائیں، حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام پر ایمان لانے نے ہمارے ایمانوں کو جِلا بخشی اور وہ سب ہمیں عطا کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو عطا فرمایا تھا، ”وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ“ (الجمعۃ:۴) والی پیشگوئی آپ کے وجود میں پوری ہوگئی۔ آپ کی قبولیتِ دعا کے بے شمار نمونے ہمارے سامنے ہیں، آپ نے اپنے صحابہ کو اپنی صحبت اور تعلیم کے ذریعہ اللہ سے ایسا

قریب کردیا کہ گویا وہ دُوبَدُو اپنے خدا سے ہم کلام ہیں، اِس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی استخفاف نہیں بلکہ اُس کی لازوال محبت کا جو اُسے بندوں سے ہے، ایک ثبوت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم نے ہمارے یقین کو جو ہمیں اپنے خدا کے وجود اور اُس کے عفو وکرم پر ہے، ایسا قوی اور توانا کردیا ہے کہ ہم آئے دن اپنی دُعاؤں کی قبولیت کے مظاہرے اپنی زندگیوں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ دعاؤں کا قبولیت پانا اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اُسی کا ایک حصہّ ہے۔ ہم اپنی یا اپنے کسی عزیز کی صحت اور شفائے کاملہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے عرض پرداز ہوتے ہیں تو یہ تو نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیچر کے قانون کو توڑ دیتا ہے، کیونکہ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (احزاب: ۶۳) کا ارشاد ہمارے سامنے ہے، بلکہ اگر صحت میں سلامتی اور شفایابی کے رُخ کچھ بھی گنجائش ہوتی ہے تو اُس کے پورا کرنے کے لئے وہ ہمیں اچھا طبیب مہیا فرماتا ہے، جس کے ذریعہ مرض کی صحیح تشخیص ہوجاتی ہے۔ صحیح دوا مُیسر آجاتی ہے، صحیح دیکھ بھال کرنے والے دستیاب ہوجاتے ہیں اور اِس طرح مرض جاتا رہتا ہے، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سبز اشتہار والی پیشگوئی کیا تھی؟ وہی پیشگوئی جسے ہم پیشگوئی مصلح موعودؓ کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اُس تڑپ اور اُس اضطراب کا جواب تھا جو آپ میں اسلام کی نازک حالت کے پیشِ نظر مچلا اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور آپ کی اُمت کی سرفرازی اور سربلندی کے لئے اپنے آنسوؤں کے نذرانے کے طور پر اپنے خدا کے حضور پیش فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ عالَم کے بارے میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا یہ نوٹ بار بار پڑھنے کے لائق ہے کہ اُس کے پڑھنے سے دل پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”وہ جو عرب کے بیابانی مُلک میں ایک عجیب ماجرا گزرا کہ لاکھوں مُردے تھوڑے

دنوں میں زندہ ہوگئے اور پشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے۔ اور آنکھوں کے اندھے بینا ہوئے۔ اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے۔ اور دنیا میں یک دفعہ ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نہ پہلے اِس سے کسی آنکھ نے دیکھا۔ اور نہ کسی کان نے سُنا۔ کچھ جانتے ہو وہ کیا تھا؟ وہ ایک فانی فی اللہ کی اندھیری راتوں کی دعائیں ہی تھیں جنہوں نے دنیا میں شور مچادیا۔ اور وہ عجائب باتیں دکھلائیں کہ جو اُس اُمّی بے کس سے محالات کی طرح نظر آتی تھیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ بِعَدَدِ هَمِّهٖ وَغَمِّهٖ وَحُزْنِهٖ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَنْزِلْ عَلَيْهِ اَنْوَارَ رَحْمَتِكَ اِلَى الْاَبَدِ''۔

(برکات الدعا۔ روحانی خزائن جلد۶ صفحہ ۱۰، ۱۱)

عرب کے بیابانوں میں نہ جانے کتنے ماجرے گزرے مگر وقت کی تنگی کے باعث ایک مختصر سا ماجرا بیان کرتا ہوں جو حقوق اللہ کی ادائیگی کی ایک ایسی عجیب وغریب مثال ہے جسے سُن کر انسان خود کو اپنے ہی قائم کردہ معیار کے انتہائی کمتر درجہ پر پاتا ہے۔ میدانِ جنگ تیار ہے۔ ایک طرف تین سو تیرہ نہتے اور بے بس جبکہ دوسری طرف ایک ہزار سے زائد زرہ بکتر اور جدید ہتھیاروں سے لیس، بظاہر کوئی مقابلہ نہیں ایک شخص بے چین و بیقرار اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا ہے۔ کبھی اپنے کمزور ساتھیوں پر نظر ڈالتا ہے اور کبھی مدِّ مقابل پھیلے ہوئے بحرِ بیکراں پر۔ رات ہوجاتی ہے لوگ اپنے اپنے خیموں میں آرام کی غرض سے لوٹ جاتے ہیں مگر وہ ایک شخص بجائے آرام کرنے کے خیمے کے ایک کونے میں اپنے خالق و مالک کے حضور پیش ہوجاتا ہے، اور رات کا ایک بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی کمزوریوں کے شکلوں اور ناتوانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے اور اُس سے مدد و نصرت کی بھیک مانگتے ہوئے گزار رہا ہے۔ چشمِ فلک نے اِس سے پہلے نہ کبھی ایسا مضطرب اور بے چین کسی کو دیکھا ہے اور نہ بعد میں۔

بیقراری کا یہ عالَم ہے کہ بار بار اپنے پروردگار سے عرض کرتا ہے کہ اے میرے رب تو دیکھ رہا ہے کہ تیرے اِن عاجز اور کمزور بندوں کا مقابلہ بظاہر کتنے طاقتوروں کے ساتھ ہے۔ مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کے مال وجان کی کوئی پرواہ نہیں مجھے تو صرف یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ آج اگر تیرے یہ مٹھی بھر جانثار مارے گئے اور دشمن فتح پا گیا تو پھر تیرا قیامت تک اس دنیا میں کوئی نام لیوا نہ ہوگا۔ پس اپنا رحم فرما اور ہمیں فتح سے ہمکنار کر۔ آپ کی آہ وزاری سے آسمان تو لرز ہی رہا تھا کہ قریبی خیموں میں بھی ہلچل مچ گئی اور لوگ اُس آواز کی طرف دوڑے کہ جانیں کیسا زلزلہ آ گیا ہے۔ قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ وہ جو خود اُن کو تسلیاں دیتے اور خدائی فتح ونصرت کی نویدیں دیتے نہ تھکتا تھا بے انتہا بے چین ہے۔ آپؐ عبادت سے فارغ ہوئے تو عرض ہوا، یا رسول اللہ! کیا اللہ نے آپ سے فتح کا وعدہ نہیں فرمایا۔ فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ عرض کیا۔ پھر ایسی گھبراہٹ کیوں؟ فرمایا کیا مَیں اُس کی طرف سے ملنے والی خوشخبری پر اُس کا شکر، نہ ادا کروں اور اُس کا حق ادا کرنے والا نہ بنوں۔ میرا کام مانگنا اور مانگتے چلے جانا ہے۔ صبح ومساء لیل ونہار اور اُس کا کام اپنے وعدوں کا پاس کرنا ہے۔ پس میرے بھائیو! یہ ہے حقوق اللہ کی ادائیگی کا ایک انداز۔ بادشاہوں کا بادشاہ ہر چیز سے زیادہ طاقتور وعدہ دے رہا ہے کہ فتح تیری ہوگی مگر دوسری طرف اپنے خالق و مالک کے وعدوں پر سب سے زیادہ یقین رکھنے والا، ایسا عاجز کہ رو، رو کر اپنی کم مائیگی کا اظہار کر رہا ہے اور بار بار مانگتا ہی چلا جا رہا ہے اور ڈرتا ہے کہ اُس کے حقِ عبادت کی ادائیگی میں سَرِ مُوغفلت کہیں اُس کے ہاں میری بے نیازی کی کوئی ادا نہ ٹھہرے جبکہ بے نیازی کی صفت اُسی کی ذات سے منسوب اور محض اُسی کو زیب دیتی ہے۔

تو میرے دوستو! یہ ہے ادائیگی حقوق اللہ کا وہ حسین اُسلوب جو ہمارے پیارے آقا

اور محبوب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عملی شکل میں دکھلایا اور بتایا کہ حاجات کے پورا ہونے اور دعاؤں کی قبولیت کے بعد بھی ہمارا سَر اُسی کے آستانہ پر جھکے رہنا چاہئے کہ زندگی کی پہلی سانس سے آخری سانس تک کا ہمارا ایک ایک لمحہ اُس کی نگاہِ شفقت کا محتاج ہے۔ جوتی کے ایک تسمے سے لیکر خدا کی رضا کی جنتوں کے حصول تک ہمیں اپنے اوپر نہ جانے کتنی موتیں وارد کرنی ہوں گی ،تب بھی شاید اُس کے مقرر کردہ حقوق کا عُشرِ عَشیر بھی ادا نہ کر پائیں اور پھر کوئی کہہ سکتا ہے کب اُس کی طرف سے بُلاوا آجائے، یہ وہ وقت ہوگا جب انسان کو پتہ چلے گا کہ وہ تو خالی ہاتھ ہی چلا آیا پھر وہ کہے گا کہ ایک بار آپ پہلی دنیا میں واپس لوٹا دو پھر دیکھنا کہ ہم تیرے حقوق کس طرح ادا کرتے ہیں مگر جواب ملے گا جو ہونا تھا ، وہ ہو چکا ، اب اپنی کوتاہیوں کا مزہ چکھو۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

”جب اللہ تعالیٰ کا فضل قریب آتا ہے تو وہ دعا کی قبولیت کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے، دل میں ایک رِقت اور سوز گداز پیدا ہو جاتا ہے،لیکن جب دُعا کی قبولیت کا وقت نہیں ہوتا تو دِل میں اطمینان اور رجوع پیدا نہیں ہوتا۔طبیعت پر کتنا ہی زور ڈالو مگر طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی خدا تعالیٰ اپنی قضاء وقدر منوانا چاہتا ہے اور کبھی دُعا قبول کرتا ہے۔اِس لئے مَیں تو جب تک اِذنِ الٰہی کے آثار نہ پالوں،قبولیت کی کم اُمید کرتا ہوں اور اُس کی قضاء وقدر پر اُس سے زیادہ خوشی کے ساتھ جو قبولیتِ دُعا میں ہوتی ہے، راضی ہو جاتا ہوں کیونکہ اِس رضا بالقضاء کے ثمرات اور برکات اِس سے بہت زیادہ ہیں“

(ملفوظات جلد اول صفحہ ۴٦٠)

آپ علیہ السلام ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

''خدا تعالیٰ نے اپنے عجیب عالَم کو تین حصہّ پر مُنقسم کر رکھا ہے۔(۱) عالَمِ ظاہر جو آنکھوں اور کانوں اور دیگر حَواسِ ظاہری کے ذریعہ اور آلاتِ خارجی کے توسل سے محسوس ہوسکتا ہے۔(۲) عالَمِ باطن جو عقل اور قیاس کے ذریعہ سمجھ میں آسکتا ہے اور (۳) عالَمِ باطن در باطن جو ایسا نازک اور لَایُدرَک وفوق الخیالات عالَم ہے، جو تھوڑے ہیں جو اِس سے خبر رکھتے ہیں۔ وہ عالَم غیب محض ہے جس تک پہنچنے کے لئے عقلوں کو طاقت نہیں دی گئی مگر ظنِّ محض، اور اُس عالَم پر کشف اور وحی اور الہام کے ذریعہ سے اطلاع ملتی ہے اور نہ کسی اور ذریعہ سے، اور جیسی عادت اللہ بدیہی طور پر ثابت اور متحقق ہے کہ اُس نے اِن دو پہلے عالَموں کے دریافت کرنے کے لئے، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، انسان کو طرح طرح کے حواس اور قوتیں عنایت کی ہیں، اِسی طرح اِس تیسرے عالَم دریافت کرنے کے لئے بھی اُس فیاض مطلق نے انسان کے لئے ایک ذریعہ رکھا ہے۔ اور وہ ذریعہ وحی والہام اور کشف ہے جو کسی زمانہ میں بکلی بند اور موقوف نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اُس کے شرائط بجالانے والے ہمیشہ اُس کو پاتے رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے۔''

(سُرمہ چشم آریہ: حاشیہ صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات میں نمازوں کے پڑھنے میں اِس قدر انہماک رکھتے تھے کہ اکثر آپ کے پاؤں سُوج جایا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے توجہ دلانے پر کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے لئے جنت کی بشارت دی ہوئی ہے، پھر کیوں آپ اِس قدر زحمت برداشت کرتے ہیں، تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تھا کہ، عائشہ، اللہ تعالیٰ کے بے پایاں عنایات کے بدلے میں کیا میرا فرض نہیں بنتا کہ مَیں بھی اُس کا بہت زیادہ شکر گزار بندہ بنوں۔ یہی جواب ہمارا بھی ہے۔ حقوق اللہ کے نام سے جو

فرائض ہم نے اپنے اوپر عائد کرر کھے ہیں، وہ اِسی جذبۂ شکر و سپاس گزاری اور احسان شناسی کا حصہ ہیں جس کا نمونہ ہم اپنے مُطاع اور پیارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ میں دیکھتے ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد اپنی اپنی جگہ بے حد اہمیت رکھتے ہیں مگر حقوق العباد کی ادائیگی حقوق اللہ سے نہ صرف زیادہ مُشکل بلکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں زیادہ اہم بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ جب حساب کتاب کا وقت آئے گا تو مَیں اپنے حقوق بندے کو معاف کر دوں گا، لیکن ایک بندے کی دوسرے بندے کے ساتھ حق تلفی کو اُس وقت تک معاف نہیں کروں گا جب تک بندہ خود معاف نہ کرے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت کے دِن بندہ اگر معافی بھی مانگنا چاہے گا تو اُس کو اِس کی اجازت نہیں ہوگی، اُس دن تو صرف دنیا میں کئے گئے ظلم اور زیادتیوں کا حساب کر کے اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا۔ اِس لئے ضروری ہے کہ بندہ ہر آن اور ہر لمحہ محتاط رہے اور کبھی ایسا وقت نہ آنے دے جب اُسے یہ احساس ہو کہ اُس نے اپنے دوسرے بھائی کا کوئی حق غصب کیا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو چاہئے کہ اِسی دنیا میں اُس کی تلافی کرنے کی کوشش کرے کہ یہاں سے جانے کے بعد یہ موقعہ نہیں مِلے گا۔

حقوق العباد ایک بندے کے دوسرے بندے پر بے شمار حقوق گنوائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اِس مختصر وقت میں مَیں صرف چند موٹے موٹے حقوق ہی گنواؤں گا۔ مثلاً والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، پڑوس کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، میاں کے بیوی اور بیوی کے میاں پر حقوق، مُسافر کے حقوق، مریض کے حقوق، غریب کے حقوق، دوست کے حقوق، راہ چلتے لوگوں کے حقوق وغیرہ وغیرہ، حقوق العباد میں اسلام سب سے زیادہ زور والدین کے حقوق پر دیتا ہے۔ والدین وہ ہستی ہیں جو اولاد کے بے حد قریب ہوتے ہیں۔ اُس کی ہر قِسم کی

ضروریات کا خیال رکھتے ہیں، اُنہیں پالتے پوستے ہیں، کھلاتے، پلاتے ہیں، اچھے برے کی تمیز بتاتے ہیں اور بڑا ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے یا بیٹی کی صورت میں اُسے بیاہ کر، دوسرے گھر رخصت کر دینے کے باوجود اُن کا خیال رکھتے ہیں۔ الٰہی احسانات کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک میں یہاں تک فرمایا کہ تم اُنہیں (والدین کو) اُف تک نہ کہو۔ جہاں والدین پر اولاد کی ذمہ داریاں ہیں وہاں اولاد پر والدین کی ذمہ داریاں ہیں۔ اِسی لئے فرمایا کہ اگر تم اپنے والدین کو بڑھاپے میں پاؤ اور تم توفیق رکھتے ہو تو اُن کی خدمت کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ جہاں اولاد کا فرض ہے کہ وہ ماں کی خدمت کرے اور اُس کے ساتھ احسان کا سُلوک کرے، وہاں ماں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اس طرح تربیت کرے کہ وہ اُس کے نتیجہ میں جنت کا حقدار ٹھہرے۔

اِسلام نے پڑوسیوں کے حقوق پر بھی بہت زور دیا ہے، پڑوسیوں کے دکھ درد، خوشی اور غم میں شریک ہونا فرائض میں شامل ہے۔ اسلام نے اِن حقوق کی ادائیگی کے لئے اسقدر زور دیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اُس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اللہ تعالیٰ پڑوسی کو جائیداد میں وارث نہ قرار دیدے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اِس بات کا یقین کرلے کہ کہیں اُس کا ہمسایہ بھوکا تو نہیں سو رہا۔ اگر ہر مسلمان اِس تعلیم پر عمل کرنا شروع کر دے تو دنیا سے نہ صرف بھوک، پیاس اور غربت کا خاتمہ ہو جائے بلکہ پیار و محبت کی ایسی فضاء پیدا ہو جائے جسے دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بڑی نیک، تہجد گزار عورت کے بارہ میں فرمایا کہ وہ دوزخی ہے کیونکہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتی ہے۔

اسلام رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے پر بھی بہت زور دیتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی فوت ہوجائے اور وہ اپنے پیچھے ترکہ چھوڑے تو بہتر ہوگا کہ اگر ترکہ تقسیم کرتے وقت حقیقی وارثوں کے ساتھ ساتھ دیگر قریبی رشتہ داروں کو بھی کچھ دے دیا کرو، بلکہ فرمایا اگر کوئی مسافر اُس وقت تمہارے درمیان موجود ہو تو اُس کا بھی خیال کیا کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

حقوق العباد میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بندوں کے چھوٹے چھوٹے حقوق کا خیال رکھنے کو کہا ہے بلکہ اپنی دوسری مخلوقات یعنی چرند، پرند، حیوانات اور نباتات تک کے بارہ میں بہت سی باتوں کا پابند کردیا ہے۔

ایک مسافر کو منزل تک پہنچانا، نابینا کو راستہ دکھانا، مریض کی تیمارداری کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، مستحق طالبِ علم کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا، دوستی کا حق نبھانا، نادار کی مدد کرنا، یتیم کا خیال رکھنا، اُستاد کی عزت کرنا، بزرگوں کا احترام کرنا، بوقتِ ضرورت قرض دینا، دوسروں کی بُرائیوں سے صرفِ نظر کرنا اور پردہ پوشی کرنا اور اِس جیسی اور بہت سی باتیں ہیں جن کا خیال رکھنا حقوق العباد میں شامل ہے۔

میرے دوستو! اور بھائیو! وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (سورۃ الجمعۃ: ۴) والی پیشگوئی پوری ہوچکی ہے۔ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے جارہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بُروز کی شکل میں مہدی دوراں اپنا کام ختم کرکے جاچکے ہیں۔ قدرتِ ثانیہ کی مظہر خلافتِ خامسہ کا دور دورہ ہے۔ زمین کے کنارے اُس کے لئے سمٹتے جارہے ہیں۔ مخالفین کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی جارہی ہے۔ قومیں اُس کے لئے پُرجوش ہیں اور والہانہ اِس تحریک کو اہلاً وسہلاً ومرحبا کہنے کے لئے

بے قرار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حسین چہرہ اپنا جلوہ دِکھا رہا ہے، اُس کی نُصرت اور تائید ایک آہنی ہاتھ بن کر فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (البروج:۱۷) کا حیرت انگیز ثبوت پیش کر رہی ہے۔ باغی دل اور مغرور دماغ مرکزی نقطہ کی طرف پسپا ہو رہے ہیں اور وہ دِن قریب ہیں کہ مادیت پرستی اپنی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے گی۔

روحانیت پھر غلبہ پائے گی اور سچائی کا سُورج مشرق اور مغرب دونوں جہتوں سے چڑھے گا۔ انسانیت اپنے شرف سے ہمکنار ہوگی اور پیاسی روحوں کے قافلے جوق در جوق اپنے حقیقی معبود سے آملیں گے۔ توحید کی سُرخُروئی قریب ہے۔ غرور و تکبر اور بے جا محبتوں کے بُت پاش پاش ہونے والے ہیں۔ خود شناسی جو اپنے حُسن و قبح پر اطلاع پانے کا نام ہے۔ اپنی جگہ بناتی جا رہی ہے۔ خود پسندی اور خود پرستی کے لات و عُزّٰی ڈھائے جا رہے ہیں۔ طبائع ایک مخصوص ساخت میں ڈھل رہی ہیں، فکریں ایک مُعیّن خط پر ہم سفر ہیں۔ دنیا کے دل اسلامی اخلاق اور سیرت کی سادگی کے آگے سَرنگوں ہونے کو تیار ہیں۔ جن نمونوں کے دیکھنے کی دنیا مشتاق تھی وہ تیار ہوتے جا رہے ہیں۔ حضرت مہدی آخر الزماں کے اصحاب کی شکل میں آخرین و اولین کی یکجائی ہو چکی ہے اور وہ یکجائی اپنی ہمہ گیری اور فعالیت کے حُسن کے ساتھ جلوہ آفرینی پر مُستعد ہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز کامل تھے، اپنی کتاب براہینِ احمدیہ میں جو آپ کے دعویٰ مسیحیت سے تقریباً بیس سال پہلے کی شائع شدہ ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

”زمین کے لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ شائد انجام کار عیسائی مذہب دنیا میں پھیل جائے یا بُدھ مذہب تمام دنیا پر حاوی ہو جائے۔ مگر وہ اِس خیال میں غلطی پر ہیں۔ یاد رہے کہ

زمین پر کوئی بات ظہور میں نہیں آتی جب تک وہ بات آسمان پر قرار نہ پائے۔ سو آسمانوں کا خدا مجھے بتلاتا ہے کہ آخر کار اسلام کا مذہب دِلوں کو فتح کرے گا۔‘‘

(براہینِ احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴۲۷)

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

۞۞۞

(6)

رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشاۃ ثانیہ

تاریخِ عالَم پر نظر دوڑا ئیے تو ایسے ایسے مناظر اور ایسی ایسی شخصیتوں سے ہمارا تعارف ہوتا ہے، کہ اُن کے کارناموں پر عقل دنگ رہ جاتی ہے، شیریں مقال واعظ، آتش بیان خطیب، جابر و قاہر بادشاہ، عظیم فاتح، جماعتوں اور تنظیموں کے بانیان، ایسے لیڈر جنہوں نے تہذیب و تمدن کے سمندر میں اپنی تڑپ اور حرکت سے مدو جزر پیدا کئے۔ مختلف انقلابی طاقتیں جن سے کارزار حیات بار بار زیر وزبر ہوا، مدعیانِ اخلاق، قانون دان جنہوں نے تہذیب کے محل استوار کئے اور فلاسفر و مفکرین جنہوں نے متعدد نسلوں کو متاثر کیا۔ لیکن جب ہم اُن سب کی سعی وکاوش اور اُن ولولہ انگیز کاموں کے نتائج کا جائزہ لیتے ہیں تو خیر وفلاح اور تعمیر کا ایک جزوی پرتو ہی ہمارے ہاتھ لگتا ہے۔ اُس تمام تگ ودَو کے اثرات انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو اور گوشے پر جلوہ فگن ہوتے نظر آتے ہیں۔ کوئی تحریک، کوئی اِرادہ، اور کوئی شخصیت ایسی دکھائی نہیں دیتی، جس نے انسان اور انسانیت کی بقاء کے ہر پہلو کو چھوا ہو اور اپنی گونا گوں فلاح و بہبود کی چھاپ انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر چھوڑی ہو، جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے انسان کی کایا پلٹ کی ہو اور تہذیبی، تمدنی اور فکری ہر لحاظ سے انسان کے ظاہر ہی کو نہیں اُس کے اندرونہ کو بھی بدل کر رکھ دیا ہو۔

صرف ایک شخصیت ہے، ایک ہستی ہے جس کی دعوت، جس کے اخلاق و کردار اور جس کی قوت قدسی نے انسان کو، انسان کی اجتماعیت کو، اُس کے تہذیبی اور فکری ڈھانچے کو، ذہنوں

کے زاویوں کو، عادات واطوار کو، انسان کی خونین جبلت کو، رسم ورواج ،حقوق وفرائض، خیر وشر، اور حلال وحرام کے معیارات کو، دستور اور قانون اور معیشت اور جنگ و امن غرضکہ تمام اسالیب کوتغیر پذیر کر دیا اور پاک وصاف ایسی روشنی سے انسانیت کو نہلا یا کہ تمدن وتہذیب کا وہ اُجلا پن تاریخ کے صفحات پر مجسم انسانیت بن کر آج بھی محفوظ چلا آرہا ہے۔نہ اُس میں کسی ایزاد کی گنجاش ہے اور نہ ہی کسی کمی کا متحمل ہوسکتا ہے۔ بیداری شعور کے گوندھنے میں عناصر اور اجزاء کا جو تناسب وہاں برتا گیا، اِس میں اخلاقی معیار، حرص وہوا، خود پسندی وخود غرضی، اور طمع وآز کی کثیف اور بدبودار فضا پھر متقاضی ہے کہ اُسے وہی جوہر پھر گھول کر پلایا جائے، جس نے دنیا کی بدترین اور بدنام ترین قوم عرب کو قعرِ مذلت سے نکال کر سورج کا مدمقابل بنادیا تھا، چانداور تاروں کی طرح کائنات انسانیت کے جھومر میں عربوں کے فکر وشعور کے موتی ایسے جھلمل چمکے کہ دنیا کا ایک بڑا حصہ اُن سے روشن اور منور ہوگیا۔اُس انقلاب آفریں شخصیت کو ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جانتے ہیں۔

آج مسلمانوں کی تمام تر دلچسپی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں، حُصولِ ثواب کے لئے وقف ہے۔ثواب کے اِس حصول کو اوہام اور معتقدات کے ایسے دھوئیں سے بھر دیا گیا ہے جس کے پیچھے روشنی کا وہ مینار ٹمٹماتا چراغ نظر آتا ہے۔حصولِ ثواب کا اصل ذریعہ زندگی میں سنوار اور کردار واعمال میں پاک تبدیلی کو بنایا جانا چاہئے نہ کہ میلاد کی محفل کے انعقاد میں مضمر اِس اعتقاد کو کہ وہاں حضور کی روح بہ نفسِ نفیس جلوہ گر ہوتی اور اپنے معتقدین کے اظہار محبت پر سندِ خوشنوی عطا کرتی ہے۔کوئی بھی عمل جب تک انسان کے اندر نیک اور پاک تبدیلی پیدا کرنے کا موجب نہ ہو، صالح عمل نہیں۔نماز بے حیائی اور فحشاء سے روکتی ہے۔ لیکن اگر کسی نماز میں یہ برائیاں ڈیرہ جمائے رہیں تو یقیناً سوچا جائے گا کہ نماز کے عمل میں، نماز

کی ادائی میں، نیت نماز میں کہیں کھوٹ ہے، کوئی کمی اور کمزوری ہے جو متوقع نتیجہ پیدا نہیں ہونے دیتی۔ یہی حال اُن تمام اعمال کا ہے جن کے پیچھے اعتقادی قوت تو ہے لیکن نتیجہ خیزی نہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک انسان کی زندگی تھی۔ ایک مکمل انسان کی، بے شک آپ کی زندگی میں معجزات بھی ہیں، فرشتوں کی مدد، غیبی ہاتھ کی کارفرمائی اور خدا کی خاص نصرتیں بھی، تاہم آپ ایک انسان تھے۔ انسان کے شاملِ حال دکھ ورنج، غم وہم، تمام تر دشواریوں کو لئے صبر آزما لمحات سب کچھ آپ کے لاحقِ حال رہے لیکن اُن تمام مشکل مراحل کے مقابلے میں آپ کا کوہ صفت حوصلہ، عزم واستقلال، اخلاق وکردار کی مضبوطی، اور حِلم وپاکیزگی کا پیکر ہونا انسانیت کے دائرے سے باہر نہیں۔ ہمارے معتقدات اگر آپ کو انسان کے درجہ سے بڑھا کر ایک فوق العادت بشر میں تبدیل کردیں جس کے ہر کام فرشتے انجام دیتے ہیں، جو گوشت وپوست کا انسان نہیں بلکہ ایک نور کا پیکر ہے، جس کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا، وجودِ عالَم اسباب کے تمام قوانین جس کے تابع فرمان ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ اوصاف اور یہ قدرت کسی اور انسان کو حاصل نہیں اور نہ ہوسکتی ہے، تو پھر یہ حکم کہ آپ کا اُسوہ بہترین اُسوہ ہے، اُس کو اختیار کرو، کس طرح ممکن ہے۔ آپ کی تقلید تو اُسی وقت ممکن ہے جب تک کہ آپ انسان کے پیکر میں قید ہیں۔ آپ اگر مشکلات کا سامنا اپنے بے پناہ عزم وحوصلے سے کرتے ہیں تو ہمیں بھی بلند حوصلگی کا سبق ملتا ہے۔ محرومیوں اور بے مائیگی کے جنگل میں جہاں آسرا اور سہارا مفقود ہے اگر آپ نے اُمید کا دامن نہیں چھوڑا اور آپ کی دعاؤں نے پایہء عرش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تو ہمیں بھی ایسے حالات میں اِسی قِسم کے اوصاف کو اپنانے اور اُجاگر کرنے کا درس ملتا ہے۔ دشمن کے جان لیوا منصوبوں کے مقابلے پر صبر وثبات کے ساتھ نصرتِ الٰہی کی طلب اور

مناسب تدابیر کو اختیار کرنے کا جو نمونہ ہم آپ کی زندگی میں پاتے ہیں، وہی ایسے کسی بھی صعوبت کے مرحلے میں ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔فوق البشریت ہمارے کسی کام کی نہیں۔ قرآن نے ہمیشہ آپ کی بشریت کا اعلان کیا ہے۔ وہ بھی بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف:۱۱۱) کہہ کر،فوق البشریت سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں۔

اِسلامی بلاک میں آج جو چند ایک نام نہاد مفکریں ہمارے سامنے ہیں، اُن کا عِلم ،اُن کا تجربہ اور اُن کی فکر کی رِسائی جسے وہ قرآن وسنت سے اخذ کردہ نظریہء حیات کا نام دیتے ہیں، وہ صرف یہاں تک پہونچتا ہے کہ انسانوں کا ایک ایسا معاشرہ جو اپنے اعتقاد میں اور عمل میں ایک امت اور ایک قوم کہلانے کا مستحق ہو تشکیل دیا جانا چاہئے جیسا کہ اسلام کے اولین دور میں تشکیل دیا گیا تھا۔ کردار اور اخلاق میں وہ صحابہ کرام کا ہمسر اور انقلابی روح سے معمور ہو اور ایک ایسی قیادت اُسے نصیب ہو جو صالح اور تمام اسلامی اخلاق اور کردار واوصاف کا پیکر ہو۔ اس بات سے انکار نہیں کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے یہی تقاضے ہیں اور اُن سے روگردانی کر کے دنیا کو ایک عالم گیر اور ہمہ گیر امن و عافیت کا گہوارہ نہیں بنایا جاسکتا، تاہم اِس کے حصول کے لئے جو راستہ خود خدائے علیم وحکیم نے مقرر فرمایا ہے، اُس کے بغیر کوئی دوسرا طریق اور راستہ چنداں مفید اور قابلِ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔اسلام کے ابتدائی دور میں اُس کے احیاء اور نفاذ کو جن مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا تھا، آج اُس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔اُس وقت بڑی رکاوٹیں قبائلی عصبیت اور خود ساختہ فخر ومباہات پر مبنی تھیں جنہیں جہالت اور کمی علم کے باوصف دلائل سے دور نہیں کیا جاسکتا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا نمونہ اور کردار ہی ایک ایسی بڑی قوت تھی جس نے جزیرۃ العرب کے تمام دیو مالائی نظام کو بہت معمولی عرصے میں زمیں بوس کر دیا۔علمی بحثیں، دلائل ونقد یہ سب پہلی صدی کے دوسرے نصف کی پیداوار ہیں۔

صرف اقتدار اور طاقت اِس طرح کے بدبودار معاشرے کے سدھار کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے۔ عقل وفراست اور علم و دانش بھی اُس فرسودہ نظام کو ملیا میٹ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس کے لئے سب سے بڑی اور اولین ضرورت ایک ایسی لیڈرشپ کی تھی جو اپنی بے ریا پاکیزگی، ہمالیائی عزم وحوصلہ اور انسانیت سے بے پناہ پیار ومحبت اور انسانی بہبود وبرتری کے لئے لازوال محبت اور قربانیوں کا مظہر ہوتی اور اپنی تمام تر اعلیٰ صلاحیتیں محض انسان کی فلاح اور ترقی اور انسانیت کے اونچے اٹھائے جانے کے لئے وقف رکھتی۔ یہ قیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات میں مُیسر آئی اور اُس قیادت کے مخلصانہ جذبے نے ایک ایسی قوم اور اُمت برپا کر کے دکھا دی جس نے تاریخِ عالم پر بہترین طبقہء انسانیت کے لحاظ سے اپنے اَنمٹ نقوش ثبت کر دئے۔ آج بھی اُسی لیڈرشپ کی ضرورت ہے۔ اُمت اور قوم اور مثالی معاشرہ اُس کے ساتھ آئیں گے اور ویسی ہی قیادت ایک انقلاب آفریں معاشرہ پیدا کر کے دکھا سکے گی۔ اِس باب میں جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حساس دل، دنیا کے تمام لہوولعب سے مستغنی اور تجارت وفائدے کے خیال سے بے نیاز محض انسانیت کی بقا اور ترقی کے لئے تڑپتا رہتا تھا۔ یہی تڑپ تھی جس نے آپ کو حِراء کی راہ دکھائی، وہاں آپ کی تمام تر فکر اور سوچ انسان کے شرف اور مرتبہ میں اضافے اور سُدھار کے لئے وقف تھی۔ آپ کی دعائیں عرشِ الٰہی کو ہلانے کا موجب بنیں اور اللہ کی صمد اور غنی ذات نے محض اپنے فضل سے انسانیت کو اُس کے حقیقی شرف اور اعزاز سے مشرف کرنے کیلئے اپنی جناب سے ایک بندہ کو کھڑا کر دیا۔ وہ ایک انسان ہی تھا جس کیلئے اپنے مقصد کے حصول تک بے شمار مصائب کے سمندروں سے گزرنا اور بے حساب مخالفتوں، مشکلات اور دشمنیوں کے پہاڑوں کو سر کرنا مقدر کر دیا گیا تھا۔ ہاں! یہ وعدہ اُس کے خالق و مالک نے اُس سے ضرور

کر رکھا تھا کہ ''لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ'' (سورۃ المجادلۃ: ۲۲) کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔ اُس کے پیچھے خدائی ہاتھ تھا، جو دِن میں سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ہوتا اور رات میں مادرِ مہرباں سے زیادہ شفقت کے ساتھ اُسے ڈھارس دیتا اور تمام صعوبتوں کے دریاؤں سے پار اُترنے کی اُسے نوید سناتا رہتا۔ **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** (المائدۃ: ۶۸) کہ یقیناً اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں کے ہر شر سے بچائے گا اور **اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ** (الزمر: ۳۷) کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں؟

وہی سنت اب بھی درکار ہے۔ صرف وہی طریق کامیابی کا ضامن ہے اور وہی تقدیر آج کے لئے بھی مقدر ہے۔ اُس سے قطع نظر کر کے عُلماء اور مفکرین کا خیال اور یہ فیصلہ کہ صرف انسانی فراست، عِلم کی فراوانی اور سیاست و سیادت کی سوجھ بوجھ ہی اِن مسائل کا حل ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یہ سوجھ بوجھ اور دنیوی یہ علم جو سراسر اکتسابی ہے، وہبی نہیں، قیاس اور اِستدلال تک جا کر رُک جاتے ہیں۔ اُس سے آگے یقین کا جو کوہ گراں ہے وہ سر نہیں ہو سکتا جب تک کہ راست اللہ تعالیٰ کی تائید و نُصرت، وحی و الہام اور رؤیا و کشوف کے ذریعہ دِلوں کو مسخر نہ کر لے اور ہر ہر قدم پر راہ نما نہ بنے۔ دنیا لاکھ کہے اور علماء بے شک چلاتے رہیں کہ الہام کا پانی کبھی کا بند ہو چکا اور آج جو قوم الہام و وحی کی قائل ہے، جھوٹی ہے، لیکن ہوگا وہی اور ہو بھی رہا ہے۔ جو اسلام کے اولین دور میں ہوا۔ آج الہام کی تائید و نُصرت ہی، اُس گروہ کو جسے عُلماء کرام جھوٹا قرار دیتے ہیں، وہ وسعتِ نظری، وہ علم، وہ قیادت اور سیادت اور وہ سب کچھ عطا کی جاتی رہی ہے جو ایک قوم اور امت کے برپا ہونے کے لئے ضروری ہے، وہ قوم، وہ امت اور وہ معاشرہ برپا ہو چکا ہے۔ اُس کے پیچھے نہ حکومتیں ہیں نہ دولت و قوت اور اثر و رسوخ کی دنیوی طاقت لیکن عزمِ محکم اور حوصلہ نے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اسلام کے ساتھ بے ریا

اخلاص نے انہیں ہر قسم کی جغرافیائی تقسیم سے بالا کر کے اور ہر طرح کی عصبیت سے اونچا اٹھا کر ہر مشکل دریا اور ہر دُشوار پہاڑ سر کرنے کی صلاحیت دے دی ہے۔ یقیناً محض علم اور سوجھ بوجھ سے وہ معرکۂ عظیم سر نہیں ہوسکتا جب تک اُس کے پیچھے خدائی ہاتھ نہ کارفرما ہو۔ الہام کی بارش نہ ہو اور خدائی بشارتیں اور تسلیاں قیادت کا نصیب نہ بنیں۔

'' اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ '' (الانبیاء:۳۱)

یعنی کیا کفار نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے پس ہم نے اُن کو کھول دیا (یعنی جب تک خدا تعالیٰ نے وحی نہیں بھیجی آسمان اور زمین کی ہدایت کا کوئی سامان نہ ہوا۔ مگر جب ہم نے اُس کو کھولا اور وحی نازل کی تب ہدایت کا سامان پیدا ہوا۔ اور ثابت ہوا کہ وحی الٰہی کے بغیر کوئی زندگی نہیں تعجب ہے کہ یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے (اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا ہے (وحی و الہام اللہ تعالیٰ کا روحانی پانی ہے، جس سے روحیں زندہ ہوتی ہیں اور روحانی خشک کھیتی ہری بھری ہو جاتی اور لہلہانے لگتی ہے) پس کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

صحیح بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مفکر کہتے یا کہلواتے ہیں، اور مدعی ہیں کہ اُن کا عِلم قرآن سے کسب کیا ہوا ہے، وہی قرآن کی بنیادی باتوں اور اُصولوں میں تبدیلی کرنے والے ہیں۔ قرآنِ مجید میں یہودیوں کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ توریت کے بعض حصوں کو جو اُن کی مرضی کے مطابق ہیں لے لیتے ہیں اور بعض کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی حال اِن نام نہاد علماء اور مفکرین کا ہے۔ اپنی سوچ اور فکر سے یہ نتیجہ تو نکال لیا کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے ایک مضبوط اخلاقی اور کرداری معاشرہ، ایک قوم اور ایک اُمت کا وجود ضروری ہے لیکن وہ معاشرہ یا وہ اُمت کس طرح ظہور پذیر ہوگی، اُس کے لئے اِن کا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راست کلام کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ گویائی اب معطل ہے اور اب قیادت کی ساری ذمہ داری اِن نام نہاد علماء اور مُفکرین پر رہ گئی ہے۔ وہ اپنے علم اور سوجھ بوجھ کے بل بوتے پر جسے وہ فراستِ مؤمنانہ کا نام دیتے ہیں اور خود کو رازدانِ شریعت کہلواتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ سب کام وہ کر سکتے ہیں۔ ایک بزرگ نے تو جو ڈاکٹر بھی ہیں، اب بیعت لینے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ اُن کا دعوٰی بھی ایک پاک معاشرہ اور ایک فعال امت برپا کر کے دکھانے کا ہے جو آئندہ دنیا کے امن اور اِنسان کی فلاح و اِصلاح کی ضامن ہوگی۔ چودھویں صدی جو دعوت و اِصلاح کے کام کے لئے مختص تھی گزر گئی، لیکن کوئی ایسا فعال یا صالح معاشرہ علماء پیدا کر کے نہ دکھا سکے، اُلٹا اُن کی ذات عمل و کردار کے لحاظ سے متنازعہ رہی ہے۔ اُن کی سوچ کا یہ موڑ بھی غور طلب ہے کہ ایسی صالح جماعت پیدا کرنے کیلئے حکومت اور طاقت کا ہمارے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ کیا مسلمانوں کے پاس حکومتیں نہیں ہیں؟ کیا اُن حکومتوں کو انہوں نے اسلامی یا اسلامی جمہوریہ کا نام نہیں دے رکھا ہے؟ کیا بعض حکومتوں نے شرعی قوانین کے نفاذ اور اپنی حکومتوں کے لئے شرعی ہونے کا دعوٰی نہیں کیا ہے؟ پھر کیا بات ہے کہ اُن کے خواب ابھی تک خواب ہی ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی سوچ اور فکر، طمع سے، خود غرضی اور خود پسندی سے معمور ہے۔ جب تک وہ حقیقی عاجزی اور فروتنی کا جامہ نہیں پہنیں گے، اور جب تک اُن کی نظریں اللہ تعالیٰ کی طرف اِس نیت سے نہیں اُٹھیں گی کہ وہ اپنی کسی پسندیدہ ہستی کو مامور فرمائے، اُس وقت تک اِن کے خواب سراب ہی ثابت ہوں گے۔

حکومت پر قبضہ کر کے اُسے دین کے احیاء کیلئے استعمال کرنا اگر کسی کے لئے آسان تھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی، تمام لیڈران مکہ کے اتفاق رائے سے عُتبہ نے آپ

کوحکومت کی پیشکش بھی کی تھی جسے آپ نے فرطِ حقارت سے ٹھکرا دیا، حالانکہ عرب قومیت کا نعرہ آپ کو فوری طور پر ایک بڑے علاقے کی سربراہی بخش رہا تھا۔ آپ میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی کہ آپ چاہتے تو اپنی خداداد فراست اور زیرکی، و نیز اپنے بے داغ کردار و عمل کے بل پر اطراف کی دیگر اقوام کو زیرِ نگیں لے آتے، قوم کی خواہش بھی یہی تھی۔ اِس طریقہ سے عربوں کی شیرازہ بندی ہو جاتی اور قبائلی زندگی جو سینکڑوں خانوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک سِلک میں پروئی جاتی۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں روم کی اور جنوب میں ایران کی تخریبی طاقتیں نہایت شاداب علاقوں پر قبضہ جمائے بیٹھی تھیں۔ اُنہیں سرنگوں کرنا آپ کے لئے چنداں دُشوار امر نہ تھا، لیکن خدائی منشاء اِس کے خلاف تھا۔ قومیت کے نظریہ سے بلند تر انسانیت کی آزادی اور فلاح آپ کے پیشِ نظر تھی۔ رومی اور ایرانی استبداد سے آزادی دلا کر، انسانیت کو عربی عصبیت کا شکار بنا دینا آپ کا مطمحِ نظر نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ قوم ضلالت اور گمراہی کا شکار ہو جاتی ہے تو اصلاحِ احوال تقاضا کرتی ہے کہ صاف ستھری اور صالح ایک قیادت اُسے نصیب ہو۔ پاک معاشرہ، فعال قوم اور نیک سیرت اُمت اُس قیادت کا نتیجہ ہوتے ہیں، لازمہ نہیں۔

ایسے وقت میں قرآن نے جو نسخہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ ”اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ○“۔

(حم السجدۃ: ۳۱،۳۲)

یعنی جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ مضبوطی کے ساتھ اُس عقیدے پر

قائم ہو گئے اور حوادث کی آندھیاں اُن کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہ کرسکیں، ایسے لوگوں پر اللہ کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی کوتاہی پر افسوس کرو بلکہ اُن اعلیٰ درجہ کی کامیابیوں پر خوش ہو جاؤ جو عنقریب تمہیں ملنے والی ہیں اور جن کا خدا تعالیٰ کی طرف سے تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم اِس دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے دوست رہیں گے اور اُس جنت میں تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تمہارے دلوں کی خواہش اور آرزو کے مطابق ہوگا بلکہ جو کچھ تم مانگو گے وہی کچھ تم کو مل جائے گا۔یعنی نیک دلوں پر فرشتوں کا نزول ہوگا اور وہ یہ الہام کریں گے کہ غم اور خوف نہ کرو۔تم سے ایمان اور استقامت کے مقابلہ میں جس جنت کا وعدہ دیا گیا ہے،جن بہتر حالات کی تمہیں اُمید دلائی گئی ہے وہ عنقریب تمہارے شاملِ حال ہوں گے .

سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔'' اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ○'' (النور:۴۱) یا (اُن کافروں کے اعمال کی کیفیت) اُن تاریکیوں جیسی ہے جو ایک گہرے سمندر پر چھائی ہوئی ہوتی ہیں جس پر لہریں اُٹھ رہی ہوتی ہیں،اور اُن لہروں پر لہریں اُٹھ رہی ہوتی ہیں اور اُن سب کے اُوپر ایک بادل ہوتا ہے۔ یہ ایسی تاریکیاں ہوتی ہیں کہ اُن میں سے بعض بعض کے اوپر چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنا بازو نکالتا ہے تو باوجود کوشش کے اُس کو دیکھ نہیں سکتا۔اور جس کے لئے اللہ نور نہ بنائے اُس کو کہیں سے نور نہیں ملتا۔

یہاں جو حالت بیان کی گئی ہے، گو کہ اُسے کفار سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن عمومی طور پر جب بھی قوم پر ایسے حالات وارد ہوں کہ قوم میں شریعت پر عمل درآمد مفقود ہو گیا ہو تو

ایک طرف اُس کے نفس کی تاریکیاں جوش مارنے لگ جاتی ہیں اور دوسری طرف خدا تعالیٰ بھی اپنے نور کو اُس سے کھینچ لیتا ہے۔ لحظہ بہ لحظہ اُس کے مصائب بڑھتے جاتے ہیں اور اُس کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کو بھی نہیں دیکھ سکتا یعنی اُس کے کام کرنے کے ذرائع بھی اُس سے غائب ہو جاتے ہیں اور جسے خدا کا نور میسر نہ ہو اُس کا یہ حال لازماً ہوتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کی شریعت کا اور کوئی قائم مقام نہیں۔ سمندر پر ظلمت چھانے اور انسانوں پر تباہی آنے کے یہ معنی تھے کہ مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ قرآنی نور اور نورِ محمدیؐ کے بعد اب اُن کے اندر زوال اور اندھیرے کی کیفیت نہیں پیدا ہوگی۔ اُن پر اندھیرا کا دور آئے گا اور اُسے دور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی وہی تدبیر کارگر ہوگی جو ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنا نور نازل فرمائے گا یعنی آسمان سے کوئی مصلح بھیجے گا جو اُس اندھیرے کو دور کرے گا۔ پھر تاریکی ہوگی تو پھر مُصلح آئے گا اور اِس طرح تاریکی دور ہوتی رہے گی۔ آخر میں فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے انسان کو کہیں سے نور نہیں مل سکتا۔ یعنی علماء اور مفکرین کچھ نہیں کر سکتے جب تک کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو مامور بنا کر نہ بھیجے۔

اِسی سورۂ نور میں آگے چل کر فرماتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○۔

(النور: 56,57)

اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور مناسبِ حال عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُن کو زمین میں خلیفہ بنادے گا جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنادیا تھا اور جو دین اُس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے وہ اُن کے لئے اُسے مضبوطی سے قائم کردے گا۔ اور اُن کی خوف کی حالت کے بعد وہ اُن کے لئے امن کی حالت تبدیل کردے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں بنائیں گے اور جو لوگ اس کے بعد میں انکار کریں گے وہ نافرمانوں میں سے قرار دیئے جائیں گے۔ اور تم سب نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اِس رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک وعدہ ہے پیشگوئی نہیں ہے اور وعدہ خلافت کے دینے کا ہے اِس لئے اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے معنی ہیں کہ اگر وہ ایمان بالخلافت پر قائم رہیں گے اور قیامِ خلافت کے لئے مناسب حال عمل اور تدبیر کو بروئے کار لائیں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اُنہیں خلافت عطا فرمادے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے خلافت کے قیام کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، وعدہ کرنے کا یہی مطلب ہوتا ہے، کیونکہ جو وعدہ کرتا ہے وہی دیتا بھی ہے۔ پھر فرمایا کہ اُس خلافت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے دین پر قائم فرمائے گا جو اُس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے۔ یعنی خلافت سے وابستگی ہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہوگا۔ وہ اُس دین کی جڑیں مضبوط کرے گا اور اگر کوئی خوف کی حالت ہوگی تو اُسے بدل دے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدائے واحد کے پرستار بنے رہیں گے اور شرک اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ چونکہ یہ ایک وعدہ ہے اور مشروط ہے اِس بات سے کہ مسلمانوں کا ایمان، خلافت کے بارے میں پختہ رہے اور اُس کے قائم رکھنے کیلئے وہ ہمیشہ کوشاں بھی رہیں، اِس لئے شرط کے ختم ہوجانے پر وعدہ بھی ساقط ہوجائے گا۔ خلافت کے ذکر کے ساتھ یہ نصیحت

بھی فرمائی کہ جب یہ نظام قائم ہو جائے تو تمہیں نمازوں کو قائم کرنا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی پابندی کرنی بھی لازم ہو جائے گی۔ اور یہی رسول کی اطاعت کی شرط مشکل ہو گی۔ گویا کہ خلفاء کے ساتھ عہد باندھ کر اور دین کی تمکین کر کے ہی وہ اطاعتِ رسول کرنے والے قرار پائیں گے۔ یہ وہی بات ہے جسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ مَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ عَصَا اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ یعنی جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (النور: 57) فرما کر اِس طرف توجہ دلائی کہ اُس وقت رسول کی اطاعت یہی ہو گی کہ اشاعت اور تمکنِ دین کیلئے نمازیں قائم کی جائیں، زکوٰتیں دی جائیں، اور خلفاء کی پورے طور پر اطاعت کی جائے۔ یہاں ضمناً یہ بات جتائی کہ اقامت الصلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ صحیح معنوں میں خلافت کے ساتھ ہی وابستہ ہے اور اِس کے بغیر ممکن نہیں۔ یعنی خلافت اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے کہ اُس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے اور اِس سے محرومی بے شمار بد نصیبیوں کو جنم دیتی ہے۔ نمازیں صحابہ کرام بھی پڑھتے تھے اور آج مسلمان بھی پڑھتے ہیں، زکوٰۃ، روزہ اور حج جیسے اُس زمانے میں تھے، اب بھی ہیں۔ پھر فرق کیا ہے ؟ فرق یہ ہے کہ صحابہ ایک نظام کے پابند تھے اور اُس پابندی نے اطاعت کی جو روح اُن کے اندر پیدا کر دی تھی، وہ اب مفقود ہے۔ چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی حکم دیتے، صحابہ فوراً عمل کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اطاعت کا مادہ نظام کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پس جب بھی خلافت ہو گی، اطاعت رسول بھی ہو گی، رسول کی اطاعت یہ نہیں ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو یا زکوٰۃ دو۔ یہ تو اللہ کا حکم ہے، اللہ کی اطاعت ہے۔ اطاعتِ رسول یہ ہے

کہ جب بھی خلیفہ حکم دے کہ اب نمازوں پر زور دینے کا وقت ہے تو لوگ نمازوں پر زور دینے لگ جائیں۔ جب خلیفہ کہے کہ اب زکوٰۃ اور چندوں کی ضرورت ہے تو اُس حکم پر لبیک کہا جائے اور جب وہ کہے کہ اب جانی قربانیوں کا وقت آگیا ہے تو لوگ جانیں قربان کرنے کو تیار ہو جائیں۔ وطن کی قربانی کا مطالبہ ہو تو وطن چھوڑنے پر تیار ہو جائیں۔ گویا کہ خلافت ہے تو سب کچھ ہے۔ خلافت نہیں تو نمازیں بھی نہیں، زکوٰۃ بھی نہیں اور اطاعتِ رسول بھی نہیں۔

مذکورہ بالا آیت اِستخلاف زبردست شہادت ہے اِس بات پر کہ خلیفہ خدا بناتا ہے۔ کیونکہ وعدہ اُس کی طرف سے ہے اور جو وعدہ کرتا ہے، وہی اُسے پورا بھی کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنی کوششوں سے خلیفہ نہیں بن سکتا۔ خلیفہ وہی ہوگا جسے خود اللہ تعالیٰ خلیفہ بنائے گا۔ خلیفہ مؤید من اللہ ہوتا ہے اور وہ اُس کی مدد ایسے کرتا ہے جیسے انبیاء کی۔ فرمایا کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ یہ خلیفہ ہم بنائیں گے ویسے ہی جیسے قبل ازیں بنائے تھے۔ گویا کہ وہ خلیفہ ایسے ہی ہمارے تائید یافتہ ہوں گے جیسے کہ پہلے خلفاء ہم سے تائید اور نصرت یافتہ تھے۔ اِس ضمن میں یہ بات یادرکھنی ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے خلافت کا جو ذکر آتا ہے اُس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو خلافت نبوت، دوسری خلافت ملوکیت اور تیسری نبوت کے بعد والی خلافت۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت، خلافتِ نبوت تھی کیونکہ اُنھیں اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تھا اور اپنے اپنے زمانوں میں وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اِس دنیا میں مظہر تھے۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ظِل بن کر اِس دنیا میں ظاہر ہوئے تھے، اِس لئے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کہلائے۔ دوسری خلافت، خلافتِ ملوکیت ہے۔ جیسا کہ حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق (الاعراف ع ٦) میں فرمایا کہ تمہیں قومِ نوح کے بعد اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا۔ اور سورہ اعراف رکوع ١٠ میں حضرت

صالح علیہ السلام کی زبانی فرمایا کہ اُس وقت کو یاد کرو کہ جب عاد اولیٰ کی تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنا جانشین بنایا۔(اور حکومت دی) کیونکہ آگے فرماتا ہے کہ تم زمین میں عدل و انصاف کو پیشِ نظر رکھ کر کام کرو ورنہ سزا کے مستحق ٹھہرو گے۔سورۃ مائدہ کے رکوع چار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے کہ اے میری قوم تم اللہ کے اُس احسان پر غور کرو جو اُس نے تم پر اُس وقت کیا تھا جب اُس نے تم میں نبی بھیجے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔گویا کہ خلافتِ نبوت اور خلافتِ ملوکیت دونوں یہود کو عطا ہوئیں۔تیسری خلافت نبی کے جانشین ہونے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔اِس میں نبی اور غیر نبی کی تخصیص نہیں۔یعنی یہ خلفاء اپنی ذات میں نبی بھی ہوسکتے ہیں،لیکن بہر حال نئی شریعت والے نبی نہیں بلکہ اپنے سے قبل کے شارع نبی کے احکامات اور کام کو آگے بڑھانے والے ہوتے ہیں۔جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اُن کے خلفاء میں عارف، ربانی، اور نبی ہر قسم کے خلفاء ہوئے ہیں۔زیرِ بحث آیت میں جس خلافت کا ذکر ہے، نبوت کے بعد والی خلافت ہے، راست نبوت والی یا ملوکیت والی خلافت نہیں۔گو کہ مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے بادشاہت کا بھی وعدہ کیا ہے لیکن اِس آیت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے قائم کردہ دین کو دنیا میں قائم کرکے رہے گا۔اُن کے دلوں میں اگر کوئی خوف کی حالت ہوگی تو اُسے امن اور سکینت سے بدل دے گا۔پھر یہ کہ وہ خلفاء صرف میری ہی عبادت کریں گے یعنی خالص موحد ہوں گے اور شرک سے مجتنب رہیں گے اور سب سے آخر میں یہ کہ جو لوگ اُن خلفاء کا انکار کریں وہ فاسق ہوجائیں گے۔یہ صرف روحانی خلفاء یعنی خلفائے نبوت کے ساتھ ہی مخصوص ہوسکتا ہے۔دنیوی بادشاہوں کے ساتھ نہیں۔یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہاں خلافتِ نبوت سے مُراد حضرت آدم و داوٗدؑ جیسی خلافت نبوت نہیں۔وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور بحیثیت نبی جو خلافت اُنھیں ملی تھی اُس کی

وجہ سے وہ خلیفہ کہلائے۔ جیسا کہ فرمایا تھا کہ ’’اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً‘‘ (البقرۃ:۳۱)

زیرِ بحث آیت میں جس خلافت کا ذکر ہے وہ خلافت وہ ہے جو نبوت کا تتمہّ ہوتی ہے۔جِسے ہم خلافت راشدہ کہتے ہیں اور جو نبی کے بعد اُس کی جانشینی کے طور پر شروع ہوتی ہے۔نبوت کا ظہور تو اُس وقت ہوتا ہے جب دنیا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (سورۃ الروم:۴۲) کا نمونہ بن جاتی ہے،لیکن خلافت کا قیام اُس وقت ہوتا ہے جبکہ قوم میں اکثریت ایمان لانے والوں اور عملِ صالح بجالانے والوں کی ہوتی ہے گویا کہ نبی لوگوں کے عقائد کو مضبوط کرنے کے لئے آتا ہے اور خلیفہ تنظیم کو مکمل کرنے یعنی نبوت ایمان کے اور عملِ صالح مٹ جانے پر آتی ہے اور خلافت اُس وقت جب اکثریت ایمان والوں اور عملِ صالح بجالانے والوں کی ہوتی ہے۔درمیانی زمانہ جبکہ دنیا نیکوں سے خالی ہوتی اور نہ ہی بدی سے پُر، دونوں حالتوں یعنی نبوت اور خلافت دونوں سے خالی ہوتا ہے۔کیونکہ نہ تو بیماری شدید ہوتی ہے کہ نبی آئے اور نہ تندرستی کامل ہوتی ہے کہ خلافت کا نظام قائم ہو۔اِس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خلافت کا فُقدان خلیفہ کے نقص یا غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ قوم اور جماعت کے نقص کی وجہ سے ہوتا ہے۔خلافت کا مٹ جانا خلیفہ کے گناہ گار ہونے کی دلیل نہیں بلکہ قوم کے گناہ گار ہونے کی دلیل ہے۔خداتعالیٰ کا وعدہ تو یہ ہے کہ جب تک اُمت مؤمنوں اور عملِ صالح بجالانے والوں سے بھری ہے،خلیفہ آتے رہیں گے۔جب اکثریت مؤمنوں اور عملِ صالح کرنے والوں سے عاری ہوجائے گی تو خلافت کا وعدہ بھی اُٹھالیا جائے گا۔خلیفہ سے یہ تو ممکن ہے ذاتی معاملات میں غلطی ہوجائے،لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسی کسی غلطی کا مرتکب ہو جو جماعت کی روحانی اور جسمانی ترقی پر اثرانداز ہو۔ایسی غلطی کا اگر اُس سے صدور بھی ہوجائے

تو اللہ تعالیٰ جماعت کی حفاظت فرماتا اور خلیفہ کو اُس کی غلطی پر مطلع کر کے اصلاح کا موقعہ دے دیتا ہے۔صوفیاء کی اصطلاح میں اِس قسم کی حفاظتِ خداوندی کو عصمتِ صغریٰ کہا جاتا ہے۔گویا کہ انبیاء کرام عصمتِ کُبریٰ کے حامل ہوتے ہیں اور خلفاء عصمتِ صغریٰ کے۔

دراصل معاشرے اور قوم کا بگاڑ مصلح اور قائد کی پوری زندگی کا طالب ہوتا ہے۔ظلم وفساد کا ہر گوشہ انسانی صلاحیت کی ہمہ گیر توجہ کا محتاج ہے اور اُس کے لئے الہام کی راہ نمائی لازمی ٹھہرتی ہے۔دنیا کی قابل ترین شخصیتیں بھی اگر فساد کے مختلف گوشوں میں سے ایک ایک گوشے کا انتخاب کرلیں اور ساری زندگی اُس کے سُدھار پر لگادیں جبکہ خدائی رہنمائی اُن کے ساتھ نہ ہوتو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔برائیوں اور کمزوریوں کی اصلاح ایک عمیق نفسیاتی تشخیص کی محتاج ہوتی ہے۔اور یہ عمیق تشخیص صرف خدا کی ذات ہی کرسکتی ہے۔اُس کے لئے صحیح لائحہ عمل تجویز کرنا اور مصلح یا قائد کو سُجھانا بھی اُسی کا کام ہے۔حکومت کو ہاتھ میں لے کر قوانین نافذ کر کے اور علمی وسائنسی تحقیق سے بُرائیوں کے مضر اثرات کو انسانوں پر واضح کر کے طبع انسانی سے اُن برائیوں کے خاتمے کی امید رکھنا کبھی بھی سودمند نہیں رہا۔سخت قوانین اور عملی گرفت برائیوں کے ارتکاب کے لئے متوازی دوسرے راستے کھول دیتی ہے۔گناہوں کی لذت اور اُس لذت کا جو چسکا انسان کو پڑ جاتا ہے، وہ سختی سے نہیں دور ہوسکتا۔سیاسی بصیرت زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتی ہے کہ ایک بگاڑ کو دور کر کے دوسرا بگاڑ اُس کی جگہ لے آئے۔ایک ناانصافی کو مٹا کر دوسری ناانصافی پیدا کردے۔ایک فاتح یہ تو کرسکتا ہے قوت کے بل بوتے پر ہمسایہ اقوام یا حکومتوں کو شکست یاب کر کے اپنی حکومت میں شامل کرلے۔وہاں کے عوام کو وہاں کی ظالمانہ حکومت سے نجات دلا کر اپنے ظالمانہ پنجے میں گرفتار کرلے لیکن دِلوں کی تسخیر اور قلوب کی فتح خدائی نصرت کے بغیر، خدائی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔

علماء میں بھی جب وہ بہت کام کر چکتے ہیں تو راج ہٹ، بال ہٹ اور تریا ہٹ کی طرح ایک مولوی ہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ منصب و اقتدار کی طرف نظر لگائے رہتے ہیں۔ اپنی علمی جستجو اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجہ میں حاصل کردہ شہرت اور ناموری اب اُنھیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ علمِ قیادت جو ادنیٰ مخلوق کے ہاتھ میں ہے، ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ لذتِ طاقت کی ہوس اور عِشرتِ اقتدار کی حِرص اس قدر غلبہ پالیتی ہے کہ کسی طرح اُن کی سیری ہی نہیں ہوتی۔ اپنی اِس حِرص و آز، اور ہوس کو وہ مذہب اور شریعت کا جامہ پہنانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اب پھر وہی وقت ساری دنیا پر آن پڑا ہے۔ جو اسلام سے پہلے ساری دنیا کے لاحقِ حال تھا۔ پھر اُسی کردار و عمل اور اخلاق و وصف کی ضرورت ہے جو وجدان و شعور اور فکر و نظر کو اپیل کرے۔ اسلام نے روح انسانی کو اوہام اور خرافات سے آزادی دلائی تھی۔ ذلت و غلامی، گندگی و ناپاکی و نیز کمزوری اور ناتوانی سے گلوخلاصی کی پھر ضرورت ہے۔ معاشرے کو ظلم و انتشار اور تہذیب انسانی کو تباہی سے بچانا، سماجی طبقہ واریت، زبردست کے زیرِ دستوں پر جور و ستم اور PRIEST - HOOD یعنی مذہبی اجارہ داری کی غلامی سے آزاد کروانا آج کا اہم تقاضا ہے۔ بالکل نئی بنیادوں پر دُنیا اور معاشرے کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ طہارت و پاکیزگی اور تعمیر و ایجاد کی نئی قدریں معاشرے کا مطالبہ ہے۔ یقین و معرفت، وثوق و اعتماد، عدل و انصاف اور خودداری و وقار آج عُنقاء ہیں۔ دُنیا کے صحیح نشوونما اور متوازن ارتقاء کے لئے پیہم، سعی مسلسل عزم و حوصلہ کا جو سبق اسلام نے دیا تھا، بُھلایا جا چکا ہے۔ پھر وقت آ گیا ہے کہ ہر چیز کو اُس کا صحیح مقام دیا جائے اور ہر ایک کو اُس مقام پر رکھا جائے جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا۔ تاریکی سے روشنی کی طرف لانا اور گمراہی و جاہلیت کے پُرفریب اندھیروں سے کھینچ کر

انسان کو علم و آگہی کے سر چشمہ سے سیراب کرنا ہم سے بڑی قربانیاں چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہالت اور بے علمی انسان کی کسی ایک خاص بے وقعتی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ عقل و خرد کی مخصوص بناوٹ اور ساخت کا نتیجہ ہے جو عموماً اُس وقت زیادہ اُبھرتی ہے جب خدا کا مقرر کردہ توازن برقرار نہیں رہتا اور صحیح اوزان ختم ہو جاتے ہیں اور بناوٹی اور مصنوعی معیار معاشرے میں جگہ بنا لیتے ہیں۔

کہتے ہیں تاریخ خود کو دوہراتی ہے۔ جماعتِ احمدیہ کے خلاف شور و غوغا اور مخالفتوں کے طوفان سب کچھ وہی ہیں، کفر کے فتوے، معاشی بائیکاٹ، نئے نئے انسانیت سوز قوانین وضع کر کے اُن کی سعی و کاوش اور کامیابیوں کے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا اور نہ صرف ایک ملک بلکہ جہاں تک بس چل سکتا ہے، اُن کا پیچھا کرنا اور اپنے تمام اثر ورسوخ کو اُن کے خلاف آزمانا، سب کچھ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور ہی کا طریقہ ہے۔ یعنی نام نہاد علماءِ اسلام نے خود کو اور اپنے حلقہ بگوشوں کو شرارت اور سعی میں اُس جگہ رکھا ہے، جہاں مخالفینِ اسلام اہلِ مکہ نے خود کو رکھا تھا اور احمدیوں کو وہ مقام اور جگہ دی ہے، جو مظلوم و مقہور مسلمانوں کو دی گئی تھی۔ جب بھی دنیا میں کوئی مامور آیا ہے، وہ قوم کے اور اکابرین قوم کے مزاج اور توقع کے خلاف ہی آیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب آف بھوپال نے جب اپنی کتاب حجج الکرامہ میں اُمتِ محمدیہؐ میں برپا ہونے والے تیرہ صدیوں کے مجددین کی فہرست ترتیب دی اور چودھویں صدی کے مجدد مہدی و مسیح کی آمد کا حساب اور اندازہ لگایا تو لکھا کہ بس اب چند ماہ ہی اُن کی آمد میں باقی ہیں۔ عین اُن کے حساب کے مطابق وہ مہدی و مسیح ظاہر ہوا اور اُس دعوے کے ساتھ کھڑا ہوا کہ اِس زمانے کے لئے خدا تعالیٰ نے اُسے مامور اور مقرر فرمایا و نیز یہ کہ اپنے بے شمار الہامات اور وحی کے ذریعہ اُس کی تائید کی ہے، تو مخالفتوں اور ہرزہ سرائیوں کا طوفان

کھڑا ہو گیا۔ کمال یہ ہے کہ اب ایک سو سال گزر جانے کے باوجود کوئی دوسرا اُس منصب کا دعویدار کھڑا ابھی نہیں ہوا۔ نواب صدیق حسن خان صاحب کو خود پسندی کے فریب نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ مَیں متوقع تھا کہ وہ منصب مجھے عطا ہو گا۔ یہی حال مودودی صاحب کا رہا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُس زمانے کی سیادت اُن کے سپرد ہو گی یا یہ کہ جو کام انہوں نے کیا ہے وہی اِس زمانے کی ضرورت تھی جسے انھوں نے پورا کر دیا ہے اور اُن کی شخصیت اور مقام کی حقیقت کو اُن کے بعد پہچانا جائے گا۔ اِس قدر کام کرنے کے باوجود انھیں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ الہام ہوا، نہ سچی خواب آئی اور نہ کسی طریق سے اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے اور بندوں کے درمیان رابطہ کے قابل سمجھا، تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ وحی والہام سب ایک ڈھونگ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا گیا ہے، حالانکہ امتِ مرحومہ میں بہت مثالیں اس کی ملتی ہیں اور مامورین کی بھی جنھوں نے اپنے دعوٰی ماموریت و مجددیت کو اللہ تعالیٰ کے الہام کے حوالے سے پیش کیا۔ مودودی صاحب کا یہ خیال رہا کہ اب دعوت واصلاح کا کام صرف علماء کے علم اور سوجھ بوجھ اور قابلیت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ صالح قوم اور معاشرہ کہاں ہے جو آپ کے کام کا لازمی نتیجہ ہونا چاہئے تھا۔ کیا پاکستان اور ہندوستان کے وہی اُن کے ماننے والے جنھیں تخریب کاری کا چسکا لگا دیا گیا ہے۔ جو خود فریبی اور خود پسندی میں بہت بڑھ چڑھ کر ہیں اور اپنے رہنما کے قول کے مطابق کہ جب تک طاقت اور حکومت ہاتھ میں نہ ہو، مثالی معاشرہ نہیں برپا ہو سکتا، وہ اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کے حصول کے لئے تمام تر ہتھکنڈوں کو آزمائے ہوئے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ حقیقی امام وقت نے اعلان کر دیا ہے، مودودی امت کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ کسی بھی منصب یا عہدے کے آرزومند کے لئے تو اسلام نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اُسے وہ عہدہ نہ

دو بلکہ آئندہ زندگی بھر اُسے کسی مقدمے یا معاملے میں گواہی کے لئے بھی موقعہ نہ دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمتِ محمدیہ کو امتِ موسوی سے مشابہت دی ہے۔ چنانچہ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے بعد خلافتِ روحانی کا سلسلہ شروع ہوا، ویسا ہی سلسلہ خلفائے راشدین کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امتِ محمدیہؐ میں بھی جاری ہوا۔ چونکہ وہ ایک وعدہ تھا، پیشگوئی نہیں تھی، اور وعدہ بھی مشروط تھا، اِس لئے شرط کے ختم ہوجانے پر مشروط بھی ختم ہو گیا۔ آج مسلمانوں میں قرآن موجود ہے۔ احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مہیا ہیں، علماء کی بھی کمی نہیں، محققین، مصنفین، واعظین، خَطّاب ومنّاد کسی کا بھی کال نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ معاشرہ اور وہ قوم تیار نہیں ہورہا ہے جو مفکرین اسلام کے ذہنوں میں ہے یا اُن کے دل چاہتے ہیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہر صدی کے سر پر مجدد دین کا سلسلہ احیاءِ دین کے لئے جاری رہے گا اور آخری زمانے میں یعنی چودھویں صدی کے سَرے پر جیسا کہ امتِ موسوی میں حضرت مسیح اصلاحِ امت کے لئے مبعوث ہوئے تھے، میری امت میں بھی مسیح ومہدی کا وُرود ہوگا، اور یہ دو نام ایک ہی وجود کے ہوں گے۔ وہ مسیح اور مہدی آچکا ہے، اُس نے اپنے آپ کو اللہ کے مامور کی حیثیت سے پیش کیا۔ قرآن اور حدیث سے اپنی ماموریت کا ثبوت دیا۔ امت میں جو نقائص، جو تاریکیاں اور جو کمی موجود تھی، اُن کے دور کرنے اور اصلاح کرنے کا بیڑہ اُٹھایا اور کام کئے گیا۔ اُس مسیح موعود کے گزر جانے کے بعد اُمتِ محمدیہؐ میں دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوئی۔ وہ کام کئے جارہی ہے۔ ایک ایسی قوم جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے اوصاف سے متصف ہے، تیار ہوچکی ہے اور ہورہی ہے۔ یہ کام جاری ہے، حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ کوئی ایک کام اور کسی ایک شخص پر اُنگلی رکھنے کی کسی کو مجال نہیں۔ تمام علماء جانتے ہیں کہ یہ وہی معاشرہ تشکیل پارہا ہے جس کی ضرورت تھی۔ مگر

چونکہ یہ کام اُن سے نہیں ہوسکا، اِس لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔ خصوصی قوانین وضع کر کے یا کروا کے پاکستان اور دیگر نام نہاد اسلامی ملکوں میں اُنھیں ایسی ایسی مصیبتوں اور اذیتوں سے دو چار کیا جارہا ہے، جن کی مثال صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے واقعات میں ہی مل سکتی ہے، انسانیت کے بنیادی حقوق سے انھیں محروم کر کے ظلم وستم کے کوہ گراں اُن پر توڑے جارہے ہیں اور وہ ہیں کہ اپنے خدا کی خاطر سب کچھ گوارا اور برداشت کئے جارہے ہیں اور کہتے تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اِسی کا تو اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا (البقرۃ: رکوع ۲۶) متوازن انسانی معاشرہ اور محض خدا کی خاطر انسانیت کو اونچے سے اونچا اُٹھانے اور دلوں میں خدائی محبت کی جوت جگانے کی لگن اگر دیکھنی ہو تو اِس معاشرے میں آ کر دیکھیں۔

۱۳/ مارچ: ۱۹۹۵ء

(7)

يُحْيِ الدِّيْنَ وَيُقِيْمُ الشَّرِيْعَةَ
(حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ (الذاریات:۵۷)

وجودِ انسانی کی غایت عبادت ہے، اور یہ ہر اُس فعل، عمل اور اِرادے سے ظاہر ہے، جس میں انسان کی توجہ اور نیت اللہ کی طرف رہے، انسان کا ہر عمل جو انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو اور اِس نیت سے ہو کہ اُس کے پیدا کرنے والے اور سب سے بڑے محسن و مربّی کی یہی خواہش ہے، تو وہ عبادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے منہ میں کھانے کا ایک لقمہ بھی اِس نیت سے ڈالتا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے بیوی کے ساتھ محبت سے پیش آنے کا حکم دیا ہے، تو یہ فعل عبادت ہے، رزق حلال کے لئے سعی کرنا، بیوی بچوں، ماں باپ اور اقرباء کے حقوق ادا کرنا، ملک وقوم کی بہبود کے کام انجام دینا، انسانیت کی بھلائی کے لئے کائنات کے راز دریافت کرنا، نئی نئی ایجادات عمل میں لانا، مصنوعی سیاروں کو فضاؤں میں بھجوانا کہ دیگر سیاروں اور ستاروں کی حقیقت آشکار ہو، ایٹم کو توڑنا اور اُس سے مختلف فلاحی کام لینا وغیرہ تمام کوششیں عبادت میں داخل ہیں اور انسان کے خلیفہ فی الارض ہونے کی دلیل ہیں، شرط یہی ہے کہ اُس کی خلافت اور اُس کی ذات اللہ کی رضا سے مشروط رہے۔ کوئی اور چیز اِس تعلق میں راہ نہ پائے۔ جس وقت بھی وہ اپنی نیت عمل میں اللہ کی طرف

متوجہ نہ رہے اور معاملات زندگی میں اپنے خالق کے احکامات سے انحراف کرے تو گویا وہ اِس حقیقت ثابتہ سے کہ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، خروج کرتا ہے اور اپنی تخلیق کی غرض و غایت سے منحرف ہوتا ہے۔ ؎

مائلِ دیر و حرم تونے یہ سوچا بھی کبھی
زندگی خود ہی عبادت ہے اگر ہوش رہے

اسلامی تصور یہ ہے کہ شریعت یعنی طریقِ زندگی کے اصول مُنزّ ل من اللہ ہیں، (اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں) اِن اصولوں اور طریق کو بکلی اختیار کر لینا اور اپنا لینا اور انہی کے لئے وقف ہوجانا ہی ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا'' (الروم:۳۱) کا حقیقی مفہوم ہے۔ اِس کو دوسرے معنوں میں ایک مستقل مرکز کے گرد مقررہ دائرے میں حرکت پذیر رہنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ صرف اسلامی تصور کا ہی خاصہ نہیں ہے بلکہ ساری کائنات ہی اِس کلیہ کے تابع ہے۔ ہر کُرہ، ہر سیارہ، ہر ستارہ، بلکہ کائناتِ عالَم کی ایک ایک چیز، خود انسانی جسم، اُس کے خلیات اور اُن کے اندر کا سارا نظام اسی کلیہ کے پابند ہیں اور زندگی کی بقا اور اُس کا قیام و استحکام اِسی حرکت پذیری میں مضمر ہے۔ ایٹم اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے جس کے گرد الیکٹرون اپنے مقررہ مدار پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ ہر سیارے اور ستارے کا اپنا ایک نظام گردش ہے اور وہ سب اپنے مرکز کے گرد مقررہ اصولوں پر محوِحرکت ہیں۔ اسلام نے انسان کے لئے یہ جو فعل مقرر فرمایا، کوئی انوکھا اور تعجب خیز امر نہیں، کیونکہ فطرت اسی کی متقاضی ہے اور یہ فعل کائنات کی عمومی فطرت کے اثرات اور مظاہر میں سے ہے۔ اِسی کلیہ کے تابع ہوکر انسان اِس زمین پر تبدیلی اور ترقی کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اِسی فطرت صحیحہ کا مظہر ہوکر وہ اپنے خلیفہ فی الارض ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ یعنی یہی خلافت ہے جو زمینی ارتقاء اور تغیر کے لئے انسان کی

حرکت پذیری اور ایک مرکز سے اُس کی وابستگی کا تقاضا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے انبیاء کا مشن بھٹکے ہوئے انسانوں کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے، اِس عزم اور نظم کے ساتھ کہ وہ ایک سِلک میں پروئے جائیں اور کائنات کے فطری اور آفاقی نظامِ گردش کا ایک نمونہ بن جائیں۔ظاہر ہے اس قدر بڑے اور ہمہ گیر منصوبے کے لئے خصوصی قواعد وضوابط اور ان پر سب کو عمل پیرا کروانے کے لئے خصوصی اخلاق وکردار کی ضرورت درپیش ہوگی۔پس! حیاتِ انسانی کے انہی ضابطوں اور قواعد کو اور اُن کے لئے مرتبہ تعلیم اخلاق کو شریعت کہا جاتا ہے۔

جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی عمارت چار ستونوں پر کھڑی ہوئی ہے۔(۱)عقائد(۲)عبادات (۳)معاملات اور(۴)اخلاق

عقائد اور عبادات کا تعلق بندے اور اُس کے خالق کے درمیان رابطے سے ہے۔جبکہ معاملات اور اخلاق ایک بندے کے دوسرے بندے کے ساتھ رابطہ وعلاقہ سے معنون ہیں۔ دین کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے اِن چاروں شعبوں کو جو قرآن نے ہمارے لئے مخصوص کئے ہیں،عملاً فعال بنایا اور برتا جائے،ظاہر ہے کہ دینی کاموں کی فعالیت اور قیامِ شریعت کے لئے ضروری ہے کہ ایک ضابطہ اور قانون بنایا جائے اور ایک جماعت تشکیل دی جائے جو اُس ضابطہ اور قانون کو نافذ کروائے اور اُس کی نگرانی کرے۔وہ ضابطہ اور قانون تو تیرہ سو سال پہلے ہی انسان کو عطا ہو چکا تھا اور اُس کی قوت واثر پذیری بھی مشاہدہ وعمل میں آچکی تھی،تاہم کمی ایک ہادی کی تھی،ایسے ہادی کی جو دورِ اول کی طرح علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو۔جس میں رنگ ونسل اور چھوٹے و بڑے کا امتیاز مٹا دیا جائے۔جس میں خدا تعالیٰ کے ساتھ رابطے کا بار بار اور مُسلسل مظاہرہ ہو،جیسا کہ قرنِ اول میں ہوتا رہا تھا،اور یہی سمجھ میں آئے کہ اُس کے پیچھے

خدائی ہاتھ ہے جو کشاں کشاں دین وملت کی اِس کشتی کو آگے دھکیلتا جا رہا ہے۔ ہر نئے دن کا نیا سورج جب اُس پر طلوع ہو تو اُسے اپنے پچھلے مقام سے بلندی پر دیکھے اور ہر آنے والی رات اُس پر گواہی دے کہ اُس نے اپنے مفوضہ کاموں کو پوری جانفشانی سے پورا کیا ہے اور سایہء رحمت اُس کا مقدر رہے۔

اب ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ آپ کی بعثت کا مقصد دعوتِ توحید، اصلاح اخلاق، تزکیہ نفوس اور تعلق باللہ کا قیام تھا۔ بادشاہت یا شہنشاہیت سے اِس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا کہ زمین پر ایک ہمہ گیر خلافت و نیابت کی بنیاد ڈالی جائے، یہ غرض پوری نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ ایک خاص جماعت کا قیام عمل میں نہ لایا جاتا۔ وہ جماعت اپنے فکر و عمل کے لحاظ سے ایسی ہوتی کہ اشاعتِ اسلام کا کام نہ صرف فکری بلکہ عملی نمونہ پیش کر کے پورا کرتی، اپنے اخلاق و کردار، اپنی تربیت، اپنے اصولوں اور اپنے خصوصی مزاج کے امتیاز کے باعث دوسری اقوام و ملل سے منفرد حیثیت کی حامل ہو کر نوعِ انسانی کی قیادت سنبھالتی اور کُرہ ارض پر نظامِ الٰہی کو قائم و نافذ کر کے انسانیت کو گمراہ کن تصورات، حقائق سے منحرف قیادت اور پُرفریب نظام حیات سے نجات دلاتی۔ دینِ اسلام کے خصائص میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ مسلمانوں کو تصورِ اسلام کے خصوصی مقصد اور اُس کی مبادیات کے مزاج سے آگاہ کر کے تربیت کا ایسا ماحول پیدا کرے کہ عملاً اسلام کی نشاۃ اور تعمیر و ترقی میں وہ اپنے منفرد کردار اور صلاحیتوں کے باعث ممتاز حیثیت کے حامل عنصر بن سکیں۔ قوت قیادت میں کوئی اُن کا ہم پلہ نہ ہو، دنیا کی نظر سوائے اُن کے کسی اور پر نہ ٹھہرے اور اُن کی راہ نمائی، انسانیت کو گمراہی کے قعرِ مذلت سے نکالنے، پُرفریب نظامِ حیات سے نجات دلانے اور پستی سے اُٹھا کر اوج تک پہونچانے کی صلاحیت رکھتی ہو، لیکن یہ کام جیسا کہ آج کل

کے نام نہاد مفکرینِ اسلام خیال کرتے ہیں، صرف انسانی عِلم و عقل، کوشش اور صلاحیت کے بَل بوتے پر تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا بلکہ ہمیشہ خدائی مامور کے ذریعہ ہی انجام پذیر ہوتا ہے۔ ؎

اگر اُٹھا بھی لے تیشہ بشغل تیشہ زنی
ہر ایک شخص کا حصہ نہیں ہے کوہ کنی

پس! رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اپنا مامور بنا کر بھیجا اور ایک قلیل مدت میں دنیا نے یہ معجزہ دیکھا کہ ایک حقیر و ذلیل اور راندۂ جہاں قوم، جس کے افعال و کردار میں انسانیت سے زیادہ حیوانیت کے عناصر کارفرما تھے اور وہ ذلت و خواری کے اِس مقام کو پہنچ گئی تھی جہاں عقل، فہم اور فراست اُس سے یوں جدا ہو چکے تھے جیسے رنگ پھول سے پرواز کر جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر پست و بالا شئے کو اُس نے خدائی کا درجہ دے رکھا تھا، کیا مٹی و پتھر اور کیا تاریکی و روشنی، ہر چیز اُس کے نزدیک خدائی کا مقام رکھتی تھی اور وہ اپنے وہم میں اُس سے ڈر کر یا خوف زدہ ہو کر اُسے پوجنے لگتی تھی۔ یہ انسانیت کا بہت بڑا المیہ ہے کہ جو دنیا میں خدائی شناخت کا ذریعہ بنا کر بھیجا گیا ہو، غیر خداؤں کے آگے سر بسجود ہو جائے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی نے بہت ہی مختصر مدت میں اُنھیں اُس مقام پر لا کھڑا کیا، جہاں سے ساری دنیا نے اُن سے تمدن، اخلاق و کردار، عمل و حوصلہ، عدل و راستبازی اور دلیری اور دیانت کے سبق لئے، وہ حیوان سے انسان، انسان سے بااخلاق انسان، بااخلاق سے باخدا اور باخدا سے خدا نما انسان بن گئے، جہاں گیری اور جہانبانی میں اُن کی نظیر نہ اُن سے پہلوں میں ملتی ہے اور نہ ہی اُن کے بعد آنے والی کسی قوم میں چشم بینا نے مشاہدہ کی۔

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حالات کا غور سے جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نو بہ نو کلام صرف رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم پر ہی نہیں، اصحاب کے قلب پر بھی وارد ہو رہا تھا۔ اُن کی سوچوں پر اُن کے خالق کی محبت کے پہرے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی سانسوں اور دھڑکنوں میں بول رہا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کا سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا غرضیکہ ہر کام محض اللہ ہو گیا۔ ضیائے ایمان اور نورِ یقین نے اُن کے چہروں کو وہ تابانی بخشی کہ اُن کے بے چراغ شہر، اُس تنویرِ ربانی سے جگمگا اُٹھے، ایک بے مایہ قوم اپنے وقت کے سینے کی دھڑکن بن گئی۔ احساس کے انداز کیا بدلے کہ انھوں نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا، اُن کی سانسوں کی صبا کاری نے تہذیب اور تمدن کے نئے نئے گلزار کھلائے۔ مانگے ہوئے سورج سے سویرا کرنے کے وہ قائل نہ رہے۔ کِشتِ سحر انھوں نے اپنے لہو سے سینچی اور انسانیت کو خوش نام کر کے دکھا دیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس قدر تیزی سے منظرِ عام پر آنے والی قوم کیونکر چند صدیوں میں اپنے اُفق سے اَوجھل ہو گئی؟ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا نے اُس نعمت خداوندی کی وہ قدر نہیں کی جس کی وہ حقدار تھی۔ خود انھوں نے بھی اپنے کیف وکم کا صحیح اندازہ نہیں لگایا، نتیجہ یہ نکلا کہ تین خلفائے راشدین مُسلسل شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی خفگی آخر خلافت کے خاتمے اور ملوکیت کی ابتداء پر منتج ہوئی۔ فتوحاتِ مُسلسل نے بے شمار نئی قوتوں اور نئی تہذیبوں سے اُنھیں متعارف کروایا۔ نت نئے سیاسی اور دیگر ہمہ قِسم کے مسائل وحادثات نے اُن کے عزم وحوصلہ کے اُفق کجلا دیئے۔ فکر ونظر اور مذہبی اختلافات کی مشکلیں راستے کی رکاوٹ بننے لگیں۔

یونانی فلسفہ اور مابعد الطبعیات مسائل نے اُنھیں ایسے مباحث میں اُلجھا دیا، جن کا تاروپود مسیحی عقائد تھے۔ سِتم یہ بھی ہوا کہ اُن فلسفوں کے عربی تراجم کثرت سے شائع ہوئے اور یوں ذہنی عیاشی کے دروازے کیا کُھلے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے انحراف اور عجیب وغریب افکار کی راہیں کُھل گئیں۔ حالانکہ اسلام کا مقصد انسان کو اِسی قسم کے انحرافات اور رجحانات سے

نجات دلا کر صحیح اور مثبت سمتوں میں رہنمائی کرنے کا تھا، تاکہ انسان اپنی تمام توانائیوں اور قوتوں کے ساتھ کارگاہِ حیات میں تعمیر وترقی اور سربلندی و پاکیزگی کی راہوں پر قدم مارتا چلا جائے۔ فلسفہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حقیقت کو الفاظ کا جامہ پہنا کر متعارف کروایا جائے جبکہ حقائق کے بنیادی پہلو اپنی سرشت میں انسانی فکر اور سوچ سے اِس قدر بلند ہوتے ہیں کہ فہم انسانی پوری طرح اُن کا اِدراک نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مذہب اور عقائد میں فلسفہ کے درآنے سے جُہدِ مسلسل کا وہ جذبہ جو اُن کی شناخت تھا، گمنامی کی نذر ہوگیا۔ ہجومِ ناشناساں میں گھر کر انھوں نے خود اپنی شناخت کھودی۔ ایسے میں آسماں سے ایک چادرِ شب اُتری اور سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹ لے گئی۔ ؎

وہ وقت بھی دیکھے ہیں تاریخ کی گھڑیوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی

بعد کے زمانوں میں دنیا نے بے شمار تجربے کئے۔ بادشاہت، شہنشاہیت، جمہوریت، آمریت، لیکن ذہنِ انسانی کو مطمئن نہ کرسکے۔ گزشتہ ایک صدی میں کمیونزم، سوشلزم، مارکسزم اور فاشزم قِسم کے بیسیوں ازم پیدا ہوئے۔ لیکن وقت نے اُن سے ہتھیار ڈلوا لئے۔ خود اُن کا طرزِ عمل اُن کا اعترافِ شکست تھا، سینکڑوں کتابیں اُن کے حُسن و قبح پر تصنیف ہوئیں۔ لیکن انجام کار ناکامی ہی اُن کا مُقدّر ٹھہری۔ دنیا کے بہترین دماغوں نے مل کر یو۔این۔او کا اِدارہ قائم کیا کہ اُس کے ذریعہ دنیا کی ہر پست و بلند قوم کو انصاف مہیا کیا جاکر، ایک اسٹیج اور ایک سطح پر لایا جائے، لیکن وائے بدنصیبی کہ تمام بہترین دماغوں کی مشترکہ کوششیں اپنی رایوں اور نفع انسانی کے لئے وضع کئے جانے والے اصولوں میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں پیش کرسکیں۔ جسے قرآن یا اسلام کے پیش کردہ اصولوں سے بہتر اور برتر قرار دیا جاسکے۔ بلکہ بعض خود پرست

اور خودغرض بڑی حکومتوں نے دھاندلی کر کے بعض ایسے قوانین بھی اِس عظیم ادارے سے اپنے حق میں وضع کروا لئے جن کا مقصد سراسر جمہوریت کا خون اور کمزوروں کی پامالی ہے۔عملاً متعدد بار اِس کا اظہار بھی ہو چکا ہے۔اسلام نے جہاں یو۔این۔او۔قِسم کے ادارے کی ضرورت کو پیش کیا تھا تو اُس کے لئے لازم قرار دیا تھا کہ وہ اپنی مالی اور عسکری قوت وطاقت میں کسی بھی عائلی انفرادی یا مشترکہ قوت وطاقت سے بڑھ کر ہوتا کہ اپنے فیصلوں کو منوانے اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی مؤثر کاروائی اور کوشش میں کوئی طاقت اُس کی مزاحم نہ ہو سکے۔دنیا کے عظیم مؤرخین جب معلومہ تمام زمانوں کا جائزہ لیتے ہیں اور مختلف تہذیبوں،اور تمدنوں کا مقابلہ وموازنہ کرتے ہیں تو بالآخر جہانبانی کے لئے بہترین دور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دس سالہ دور ہی کو قرار دیتے ہیں جس میں حکمران بذاتِ خود اپنی رعیت کا سب سے بڑا خادم تھا۔اُس کے جلال و جمال میں سادگی،اُس کا سب سے بڑا وصف تھی۔کمزور سے کمزور انسان بھی اُس دربار میں جب چاہتا رسائی حاصل کرسکتا تھا۔دُنیا کی بڑی بڑی مذہبی حکومتوں کے نمائندے جب مدینہ آتے تو سادگی اور مساوات کی اِس چھوٹی سی نگری میں خلیفہء وقت کو تلاش کرتے ہوئے اُن کی نظریں اکثر بھٹک جاتیں اور وہ شناخت نہیں کر پاتے،جب تک کہ اُنھیں بتایا نہ جاتا۔

یہ زمانہ خدا تعالیٰ کی خاص منشاء کے تحت جلد ہی دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔یہ ایک ہوشربا جلوۂ حُسن تھا کہ ایک جھلک دکھا کر روپوش ہوگیا۔بجلی کے کوندے کی طرح آنکھوں کے آگے لپکا اور اہلِ بصیرت کو ''لب تشنۂ تقریر'' چھوڑ گیا۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بارے میں اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر جو پیشگوئیاں فرمائی تھیں۔اُن کا مفہوم یہ تھا کہ سب سے اچھا دور وہ ہے جس میں مَیں ہوں۔میرے بعد آنے والا (خلفائے راشدین کا) دور

بھی برکتوں سے معمور ہوگا۔ روشنی اُن کے جلو میں چلے گی لیکن صرف تیس(30) سالوں تک۔ پھر حکومت کا دور دورہ ہوگا۔ جابر وظالم بادشاہ اسلام کے نام پر حکومت کریں گے۔ یہ دور بھی اسلام کی ترقی پذیری اور خوش نامی وخوش نظری کا دور ہوگا۔ دورِ سعادت کی روشنی شفق بن کر اُفقِ دنیا کو منور رکھے گی۔ یہ روشنی تین سوسال تک بہار دکھلائے گی۔ اُس کے بعد ایک ہزار سال کا دور اسلام پر تاریکی کا دور ہوگا۔ اِس دوران اللہ تعالیٰ مجددین کے ذریعہ باغِ اسلام کی آبیاری کا انتظام فرماتا رہے گا۔ تاہم وہ رونقیں نہیں لوٹ پائیں گی۔ رنگِ حِنا اُڑتا جائے گا یہاں تک کہ ہتھیلی سُونی اور بے رونق رہ جائے گی۔ لاکھ ٹوٹے ہوئے ستارے مل کر بھی ایک آفتاب نہ بنا سکیں گے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس تسلسل میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اِن حالات کے باوجود تم مایوس نہ ہونا۔ تاریکی کے اِس ایک ہزار سالہ دور کے بعد اسلام کی سچائی کا سورج دوبارہ شان سے چڑھے گا اور دنیا ایک بار پھر اسلام کی برکتوں سے حصہّ پائے گی۔ مسیح ومہدی کی آمد ہوگی۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ مسیح اور مہدی ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ ایک جگہ فرمایا کہ اُس مہدی کا نام محمدؐ ہوگا۔ اُس کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ۔ یہاں تک فرمایا کہ جب وہ فوت ہوگا تو میری ہی قبر میں دفن کیا جائے گا۔ گویا یہ بتایا کہ وہ کوئی اور نہیں، مَیں ہی ہوں گا۔ یعنی اُس کی اہمیت کو اپنے مساوی قرار دیا۔ یہاں تک فرمایا کہ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کا پہلا دور دوسرے سے بہتر ہے یا دوسرا پہلے سے۔ ؎

یہ سرخ کندن سی جو ہے رنگت، بدن کی ہے یا کہ پیرہن کی
شراب سے ہے یہ جام رنگین ،کہ جام سے ہے شراب رنگین

مہدی کا کام یہ بتایا کہ وہ دین کو زندہ اور شریعت کو قائم کریگا۔ ’’یحی الدین

ویقیم الشریعۃ‘‘ کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دین کو زندہ کرنا اور شریعت کو قائم کر دکھانا کس قدر جانکاہی اور جانفشانی کا متقاضی تھا؟ ایک طرف زمانے کا مزاج ہے جو دنیا داری اور مادیت سے مملُو ہے۔ دوسری طرف عِلم کا دور دورہ ہے۔ ہر باطل اور مُردہ مذہب بھی نئی نئی موشگافیوں اور دعووں کے ساتھ میدان میں کود پڑا ہے۔ عیسائی اور آریہ اپنے کاموں میں سرگرم ہیں۔ عیسائیت اپنے ناخن بڑھا رہی ہے تو آریہ اپنے دانت تیز کر رہے ہیں۔ اسلام کی شوکت اور عظمتِ رفتہ کا سب کو اندازہ ہے۔ اسلام کی موجودہ تہی دستی، بے مائیگی، اور تذلل اُنھیں اُکسا رہے ہیں کہ وہ میدان میں آئیں اور ایک کاری وار سے اِس کے تنِ نیم جاں کو لخت لخت کر دیں۔ ہندوستان میں خصوصاً آریہ سماج اور ساری دنیا میں بشمول ہندوستان وعرب ممالک، عیسائیت اپنے عِلم ودانائی، اپنے اثر ونفوذ، اپنے غلبہءِ حکومت اور مالی سطوت وبادشاہت کے زعم میں کوشاں اور پُراُمید ہے کہ چند ہی دنوں میں وہ اسلام کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے۔ اور تمام دنیا عیسائیت کی حلقہ بگوش ہوجائے گی۔ مسلمانوں کے عوام تو عوام، علماء اور خواص بھی عیسائیت کے آگے سرنگوں ہونے لگے۔ آریوں اور عیسائیوں نے کروڑوں کی تعداد میں اسلام دشمن لٹریچر شائع کروا کے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ سنجیدہ، تعلیم یافتہ اور بُردبار مسلمان حالات کی سنگینی سے خوف زدہ ہوگئے۔ بہتوں نے اسلام کا مرثیہ تک لکھ ڈالا۔ بیسیوں علماء اور شاہی مسجد کے امام وغیرہ عیسائی ہوگئے اور اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی میں تمام مخالفین سے بھی آگے نکل گئے۔ ’’ظھر الفساد فی البر والبحر‘‘ (الروم: ۴۲) کا نقشہ پھر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ حیاتِ مسیح کے عقیدے نے مسلمانوں کی علمی حالت کو اِس قدر نیچے گرا دیا کہ وہ عیسائیوں کے معمولی سوال وجواب پر گھبرا اُٹھتے تھے۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمان خود اپنے باطل اور غلط عقائد کے جال میں گرفتار ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ہستی اُٹھے

اور اُنھیں سہارا دے کر اونچا کرے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادئ پُرخار میں آوے

بعض نام نہاد مفکرینِ اسلام کا یہ سوچنا یا کہنا کہ اسلام پر باوجود ایک ہزار سال کی تنزلی کے، مسلمان اپنے عقیدہ اور عمل میں ایک مرکز کے گرد اور اپنے مقررہ دائرہ کار ہی میں گھومتے رہے ہیں۔ اور اُس سے باہر نہیں گئے، ایک طفل تسلی یا خوش فہمی سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں۔عقیدۂ وحدت، صفات الٰہیہ، رسولوں، فرشتوں، گزشتہ کتابوں وصحیفوں پر، یومِ آخرت اور جزا سزا پر ایمان وغیرہ گو کہ تمام مسلمانوں میں مشترک عقائد ہیں، لیکن اُن کے اقرار یا اُن پر ایمان سے اگر اسلام کی بعثت کی غرض پوری ہوجاتی تو ایک ہزار سال کا یہ دورتنزلی کا دور نہ کہلاتا۔خود حدیث کے الفاظ ''یحی الدین ویقیم الشریعة'' اِس پر دال ہیں۔دین کو زندہ کرنا اور شریعت کا قیام عمل میں لانا اِسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ دین مُردہ ہو چکا ہو اور شریعت کا عملاً دور دور تک بھی پتہ نہ ملے۔دراصل ضرورت اِس مرکزیت کی تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا۔ اُس مرکزیت کے ایک اشارے پر ہر شخص اُٹھتا اور ایک اشارے پر بیٹھتا تھا۔ بلکہ ایک اشارے پر جان، مال، عزت اور وقت کو قربان کرنے کیلئے تیار ہوجاتا تھا۔ظاہر ہے کہ یہ کام زبردست اور عظیم الشان لیڈر شپ کا متقاضی تھا۔اگر یہ زبردست لیڈر شپ علم وعقل کی برتری کے ذریعہ ممکن الحصول ہوتی تو اللہ کو اپنے رسول کو بھجوانے کی ضرورت نہیں تھی۔اپنے زعم میں عرب میں بھی بہت سے لوگ علم وعقل کی برتری کے دعویدار تھے۔اِسی لئے انھوں نے اللہ کے رسول کا مذاق اُڑایا اور اُس کے ساتھ اِستہزاء سے پیش آئے۔قرآن اور تاریخ اِن حوالوں سے بھرے پڑے ہیں۔سنت اللہ

یہی بتاتی ہے کہ یہ کام مامور من اللہ کے ذریعہ ہی پورا کیا جاتا ہے۔ اور مامور من اللہ وہ ہوتا ہے جو ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ مجھے اللہ نے ماموربنا کر بھیجا ہے۔ وہ مجھ سے بولتا ہے۔ مَیں لوگوں کے درمیان حَکَم ہوں اور میری سرکردگی ہی منزل کی طرف لے جانے والی ہے۔ پھر یہی ہوتا ہے کہ اُس کی مخالفت بڑے زور وشور سے شروع ہوجاتی ہے۔ ہر سیلابِ بلا اُسی کی طرف رخ کرتا ہے لیکن عوام وخواص میں سے ایک مخصوص طبقہ اپنے فطری میلانِ شرافت اور چند خصوصی صلاحیتوں کے باعث اُس کا حلقہ بگوش ہوتا جاتا ہے۔ جوں جوں مخالفت بڑھتی ہے، یہ حلقہء محبان وجان نثاران بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ظُلم کے پہاڑ اُن پر ٹوٹتے ہیں۔ رشتے منقطع ہوجاتے ہیں۔ یُسر عُسر میں بدل جاتا ہے۔ دنیوی راحتیں اور آرام چھین لئے جاتے ہیں۔ وجاہت ذلت میں تبدیل ہوجاتی ہے، لیکن اُن کے عزم وحوصلے کو کوئی پست نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے مرکز اور مدار سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اُن کی سرگرانی اور سرگردانی اپنی مفوضہ حرکت پذیری کے لئے وقف رہتی ہے۔ کائنات کا آفاقی کلیہ جذب وکشش اُن کے ہر ہر فعل سے مترشح ہوتا ہے اور وہ خود کو اُس مشینی نظام کا کارکرد پُرزہ بنا لیتے ہیں۔

اسلام کسی مخصوص، خطے، قبیلے یا علاقے کا مذہب نہیں ہے۔ یہ وہ واحد دین ہے جو اپنی رحمتوں اور برکتوں کی تقسیم میں کسی تخصیص کا روادار نہیں۔ ظلم وتعدی کی اِس دنیا میں جہاں سچ پا بستہ ملزم کے کٹہرے میں نظر آتا تھا اور باطل اپنی قوت اور اثر ونفوذ کے بل پر دندناتا پھر رہا تھا۔ انسانیت پھر اُسی طرح مغضوب ومقہور اور راندہ ہوگئی تھی۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تھی۔ گمراہی اور انحراف کی یہ صورت گری بڑے ماہرانہ اور عاقلانہ منصوبے کے تحت عمل پذیر ہوئی تھی اور نتائج کے اعتبار سے انسانیت پھر اُسی بوجھ تلے دبی ہوئی تھی جو قبل از اسلام بھی اُس پر لادا گیا تھا۔

ایک سے حالات آئے ہیں نظر ہر دور میں
رُک گئے مرے قدم یا وقت نے گردش نہ کی

پس! اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کام معمولی نوعیت کا حامل نہیں تھا۔ اُن تمام آثار و اَطوار کو زندہ کرنا اِس کی ذمہ داری تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا نے مشاہدہ کئے تھے۔ انسانی اخوت اور مساوات کے رشتوں کا قیام، علاقائی عصبیت اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق کا خاتمہ، نظم و ضبط کا وہ آفاقی مظاہرہ جو انبیاء کی جماعتوں کا خاصہّ ہوتا ہے۔ پھر اپنے عقیدے اور عمل میں ہم آہنگی اور اُستواری اور مسلسل تگ و دَو یہاں تک کہ دنیا اپنے خالق حقیقی کا چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، توحیدِ حقیقی کا قیام عمل میں آئے، انسانوں کے اخلاق کی اصلاح ہو، نفوس تزکیہ پا جائیں اور اللہ اور بندے کے درمیان ایک مضبوط تعلق جڑ پکڑ لے۔ میرؔ نے شاید اِسی موقعہ کے لئے کہا تھا۔ ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہہ شیشہ گری کا

یہ کام علماءِ ظواہر یا نام نہاد مفکرینِ اسلام اور مزاج دانانِ شریعت کے بس کا نہیں تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی۔ ضرورت تھی کہ کوئی بندہَ خدا اللہ کے اِذن سے کھڑا ہوتا اور ساری دنیا کو للکارتا کہ آؤ زندہ خدا کی تجلّی دیکھو۔ دوڑو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا مشاہدہ کرو۔ پہونچو اور قرآن کے انوار و معارف سے اپنے دامن بھر لو۔ دیکھو! یحی الدین ویقیم الشریعة کا زمانہ آن پہنچا ہے۔ خدا کا تخت زمین پر بچھنے والا ہے۔ آسمان سے روشنی کی لکیر چل پڑی ہے اور کوئی دم میں زمین کو چھونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بولنے کو بے تاب ہے۔ خالق اور بندے کے درمیان سے حجاب اُٹھنے کو اور رسم و رہ

دوستی اُستوار ہونے کو ہے۔ چنانچہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدیٔ معہود علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق کی آشکاری کا انتظام فرمایا۔ جلتی ہوئی حیات کو رحمت کے چھینٹوں نے فرحت بخشی۔ زیست کے نا آسودہ جذبے امنگوں اور ترنگوں سے ہمکنار ہو گئے۔ ہُمکتے ہوئے دلوں کو قرار آ گیا۔ دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ شیطان نے اپنی فوجوں کو بزن کہہ دیا۔ لیکن خدائی لشکر سے پنجہ آزمائی اُس کی طاقت سے باہر تھی۔ زندہ خدا، زندہ رسول اور زندہ کتاب کے نعرے جونہی بلند ہوئے، شیطان اپنی صفیں سمیٹنے لگا۔ پھر اُس کی پسپائی کا منظر بھی دنیا کی آنکھوں نے دیکھا۔ عیسائی پادری اور آریہ پنڈت آگے آگے بھاگ رہے ہیں اور فرزندانِ احمدیت اُن کا پیچھا کر رہے ہیں۔

غور فرمائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کے مطابق اسلام کی برتری اور تنزلی کا دور بھی ختم ہوا۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے مقرر کردہ وقت آیا بھی اور چلا بھی گیا اور اب تو اُس پر ایک سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اُس مخصوص منصب کا دعویدار صرف ایک ہی شخص ہوا ہے۔ اُس کے ذریعہ جس کام کی بنیاد ڈالی گئی تھی، وہ ہر نئے دن کے سورج کے ساتھ اپنے کل کے مقام سے آگے ہی نظر آتا ہے، فکر و عمل میں، اُس جماعت کا کوئی مقابل نہیں، پہلے عوام اور خواص کا طبقہ اُس سے خوف زدہ تھا۔ اب حکومتیں اُس کے اوج طالع سے فکرمند اور لرزاں ہیں۔ اپنے تمام مسائل اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اُس کی تباہی اور اُس کے مٹا دینے کے درپے ہیں۔ لیکن مخالفت کا ہر طوفان اُس کے عزم و حوصلے کو مہمیز کرتا اور اُس کی رفتارِ ترقی کو بڑھاتا جاتا ہے۔ اُس کی مثال گھڑی کی سوئی کی طرح نہیں ہے۔ جب وہ اوپر اُٹھتی ہے تو ایک مقام پر آ کر پھر گرنی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ تو اُس راکٹ کی مانند ہے، جو ہر آن بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اپنی منزل مُراد کو پالیتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں

مسلمانوں کے دیگر تمام فرقوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے مرکز کو چھوڑ کر اور اپنے محور سے کٹ کر یوں بے سہارا ڈول رہے ہیں، جیسے کوئی سیارہ اپنے مرکز سے نکل گیا ہو اور ہر لحظہ کسی نہ کسی تصادم کی زد پر ہو۔

اب ہم مختصراً آپ کے اُن ارشادات کو یہاں نقل کرتے ہیں جن سے آپ کی بعثت کی اغراض پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی بہت ہی مختصراً آپ کی تعلیمات کا خلاصہ بھی پیش کرتے ہیں۔

اپنی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

''چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ اِس لئے خدا نے یہ نہ چاہا کہ وحدتِ اقوامی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کمال تک پہنچ جائے کیونکہ یہ صورت آپ کے زمانے کے خاتمہ پر دلالت کرتی تھی۔ یعنی شبہ گزرتا تھا کہ آپ کا زمانہ وہیں ختم ہو گیا۔ کیونکہ جو آخری کام آپ کا تھا وہ اُسی زمانے میں انجام تک پہنچ گیا۔ اِس لئے خدا نے تکمیل اِس فعل کی جو تمام قوم کی طرح بن جائیں اور ایک ہی مذہب پر ہو جائیں۔ زمانہ محمدی کے آخری حصہ میں ڈال دی جو قربِ قیامت کا زمانہ ہے اور اُس تکمیل کے لئے اِسی اُمت میں سے ایک نائب مقرر کیا جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے اور اُسی کا نام خاتم الخلفاء ہے.... اُسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ (التوبۃ: ۳۲) یعنی خدا وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ایک کامل ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا اُس کو ہر ایک قسم کے دین پر غالب کر دے۔ یعنی ایک عالمگیر غلبہ اُس کو عطا کرے''۔

(چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد ۲۳، صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳)

اپنے ایک اشتہار ۴/مارچ/۱۸۸۹ء میں بیعت کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں۔

''یہ سلسلہ بیعت محض بمراد فراہمی طائفہ متقین یعنی تقوٰی شعار لوگوں کی جماعت کے جمع کرنے کے لئے ہے تا ایسے متقیوں کا ایک بھاری گروہ دنیا پر اپنا نیک اثر ڈالے اور اُن کا اتفاق اسلام کیلئے برکت وعظمت اور نتائج خیر کا موجب ہو۔ اور وہ بہ برکت کلمہ واحدہ پر متفق ہونے کے اسلام کی پاک اور مقدس خدمات میں کام آسکیں اور ایک کاہل اور بخیل اور بے مصرف مسلمان نہ ہوں اور نہ اُن نالائق لوگوں کی طرح جنھوں نے اپنے تفرقہ اور نا اتفاقی کی وجہ سے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اُس کے خوبصورت چہرہ کو اپنے فاسقانہ حالتوں سے داغ لگا دیا ہے۔ اور نہ ایسے غافل درویشوں اور گوشہ گزینوں کی طرح جن کو اسلامی ضرورتوں کی کچھ بھی خبر نہیں اور اپنے بھائیوں کی ہمدردی سے کچھ بھی غرض نہیں۔ اور بنی نوع کی بھلائی کے لئے کچھ جوش نہیں۔ بلکہ وہ ایسی قوم کے ہمدرد ہوں کہ غریبوں کی پناہ ہو جائیں۔ یتیموں کے لئے بطورِ باپوں کے بن جائیں اور اسلامی کاموں کے انجام دینے کیلئے عاشق زار کی طرح فدا ہونے کو تیار ہوں۔ اور تمام تر کوشش اِس بات کے لئے کریں کہ اُن کی عام برکات دنیا میں پھیلیں۔ اور محبت الٰہی اور ہمدردی بندگان کا پاک چشمہ ہر یک دل سے نکل کر اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک دریا کی صورت میں بہتا ہوا نظر آوے...... خدا تعالیٰ نے اِس گروہ کو اپنا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور اپنی قدرت دکھانے کے لئے پیدا کرنا اور پھر ترقی دینا چاہا ہے تا دنیا میں محبتِ الٰہی اور توبہ نصوح اور پاکیزگی اور حقیقی نیکی اور امن اور صلاحیت اور بنی نوع کی ہمدردی کو پھیلا دے۔ سو یہ گروہ اُس کا ایک خالص گروہ ہوگا اور وہ اُنہیں آپ اپنی روح سے قوت دے گا، اور انھیں گندی زیست سے صاف کرے گا اور اُن کی زندگی میں پاک تبدیلی بخشے گا۔ وہ

جیسا کہ اُس نے اپنی پاک پیشن گوئیوں میں وعدہ فرمایا ہے اِس گروہ کو بہت بڑھائے گا اور ہزار ہا صادقین کو اِس میں داخل کرے گا۔ وہ خود اُس کی آبپاشی کرے گا اور اُس کو نشوونما دے گا یہاں تک کہ اُن کی کثرت اور برکت نظروں میں عجیب ہوجائے گی۔ اور وہ اُس چراغ کی طرح جو اونچی جگہ رکھا جاتا ہے، دنیا کی چاروں طرف اپنی روشنی کو پھیلائیں گے اور اِسلامی برکات کے لئے بطورِ نمونہ کے ٹھہریں گے۔ وہ اِس سلسلہ کے کامل متبعین کو ہر ایک قسم کی برکت میں دوسرے سلسلہ والوں پر غلبہ دے گا اور ہمیشہ قیامت تک اُن میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کو قبولیت اور نصرت دی جائے گی۔ اُس ربِّ جلیل نے یہی چاہا ہے۔ وہ قادر ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، ہر ایک طاقت اور قوت اُسی کو ہے''۔

(مجموعہ اشتہارات جلد اوّل صفحہ 196 تا 198)

ایک اور جگہ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''خدا اِس جماعت کو ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جس کے نمونے سے لوگوں کو خدا یاد آوے اور جو تقویٰ اور طہارت کے درجہ اول پر قائم ہوں۔ اور جنھوں نے درحقیقت دین کو دنیا پر مقدم رکھ لیا ہو''

(تذکرۃ الشھادتین، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۷۷ تا ۷۸)

''تم خدا کی آخری جماعت ہو، سو وہ نیک عمل دکھلاؤ جو اپنے کمال میں انتہائی درجہ پر ہو، ہر ایک جو تم میں سے سست ہوجائے گا وہ ایک گندی چیز کی طرح جماعت سے پھینک دیا جائے گا''

(کشتی نوح۔ روحانی خزائن جلد 19 صفحہ 15)

اپنی تعلیمات کے تسلسل میں کشتی نوح میں ایک جگہ آپؑ فرماتے ہیں۔

''بڑے ہوکر چھوٹوں پر رحم کرو نہ اُن کی تحقیر اور عالم ہوکر نادانوں کو نصیحت کرو، نہ خود نمائی سے اُن کی تذلیل اور امیر ہوکر غریبوں کی خدمت کرو، نہ خود پسندی سے اُن پر تکبر۔ ہلاکت کی راہوں سے ڈرو۔ خدا سے ڈرتے رہو اور تقویٰ اختیار کرو..... نفسانیت کی فربہی چھوڑ دو کہ جس دروازے کے لئے تم بلائے گئے ہو اُس میں سے ایک فربہ انسان داخل نہیں ہوسکتا۔ کیا ہی بد قسمت وہ شخص ہے جو اِن باتوں کو نہیں مانتا جو خدا کے منہ سے نکلیں اور مَیں نے بیان کیں۔ تم اگر چاہتے ہو کہ آسماں پر تم سے خدا راضی ہو تو تم باہم ایسے نیک ہوجاؤ جیسے ایک پیٹ میں سے دو بھائی''

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد ۱۹، صفحہ ۱۲، ۱۳)

''اے تمام لوگو سُن رکھو! یہ اُس کی پیشگوئی ہے جس نے زمین و آسمان بنایا۔ وہ اپنی اِس جماعت کو تمام ملکوں میں پھیلا دے گا اور حجت اور بُرھان کی رو سے سب پر ان کو غلبہ بخشے گا۔ وہ دن آتے ہیں، بلکہ قریب ہیں کہ دنیا میں صرف ایک مذہب ہوگا جو عزّت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ خدا اِس مذہب اور اِس سلسلہ میں نہایت درجہ اور فوق العادت برکت ڈالے گا اور ہر ایک کو جو اِس کے معدوم کرنے کا فکر رکھتا ہے، نامُراد رکھے گا اور یہ غلبہ ہمیشہ رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔ اگر اب مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں تو اس ٹھٹھے سے کیا نقصان کیونکہ کوئی نبی نہیں جس سے ٹھٹھا نہیں کیا گیا۔ پس ضرور تھا کہ مسیح موعود سے بھی ٹھٹھا کیا جاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۚ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ○ (یس:۳۱) اس خدا کی طرف سے یہ نشانی ہے کہ ہر ایک نبی سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے۔ مگر ایسا آدمی جو تمام لوگوں کے روبرو آسمان سے اُترے اور فرشتے بھی اُس کے ساتھ ہوں اُس سے کون ٹھٹھا کرے گا۔ پس اس دلیل سے بھی عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مسیح موعود کا آسمان سے

اُترنا محض جھوٹا خیال ہے۔

یاد رکھو کہ کوئی آسمان سے نہیں اُترے گا۔ ہمارے سب مخالف جواب زندہ موجود ہیں وہ تمام مریں گے اور کوئی اُن میں سے عیسیٰؑ بن مریم کو آسمان سے اُترتے نہیں دیکھے گا۔ اور پھر ان کی اولاد جو باقی رہے گی وہ بھی مرے گی اور اُن میں سے بھی کوئی آدمی عیسیٰؑ بن مریم کو آسمان سے اُترتے نہیں دیکھے گا اور پھر اولاد کی اولاد مرے گی اور وہ بھی مریم کے بیٹے کو آسمان سے اُترتے نہیں دیکھے گی۔ تب خدا اُن کے دلوں میں گھبراہٹ ڈالے گا کہ زمانہ صلیب کے غلبہ کا بھی گزر گیا۔ اور دنیا دوسرے رنگ میں آ گئی مگر مریم کا بیٹا عیسیٰؑ اب تک آسمان سے نہ اُترا۔ تب دانشمند یک دفعہ اس عقیدہ سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہوگی کہ **عیسیٰ کے انتظار کرنے والے** کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑیں گے اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی پیشوا۔ مَیں تو ایک تخم ریزی کرنے آیا ہوں۔ سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا اور اب وہ بڑھے گا اور پھولے گا اور کوئی نہیں جو اُس کو روک سکے‘‘

(تذکرۃ الشہادتین۔ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۶۶ تا ۶۷)

قرآنِ مجید کا حقیقی مفہوم اور اُس کے مضامین کی ایسی اعلیٰ تفسیر آپ نے دُنیا کے سامنے پیش فرمائی کہ اُس کی نظیر تیرہ سو سالوں میں نہیں ملتی۔ مشکل آیات، ناسخ، منسوخ کا جھگڑا، قصص قرآن کی حقیقت اور قرآنی پیشگوئیوں کے معارف جو ’’کتابِ مکنون‘‘ کے رنگ میں پوشیدہ تھے، آپ کے ذریعہ دنیا پر کھولے گئے، آپ کی تفاسیر نے فضائے حرف وصوت کو عطر مزاج بنا دیا۔ لگتا ہے کسی حِنا نفس قلم کی گل کاریاں ہیں، اُن کے مطالعے سے جو محبت قرآنِ مجید کے ساتھ بڑھتی ہے، ایمان میں جو نکھار پیدا ہوتا ہے اور مفاہیم میں جو لذت وسُرور حاصل ہوتا ہے،

دنیا اُس سے محروم ہے، جماعت کا عملاً محوری نقطہ قرآنِ مجید ہی ہے اور اُسی کے رنگ میں زندگیوں کو ڈھالنا احباب جماعت کا نصب العین ہے۔ ؎

دل میں یہی ہے ہر دم تیرا صحیفہ چوموں
قرآں کے گرد گھوموں کعبہ میرا یہی ہے

(درّثمین)

احادیث کے متعلق آپ نے یہ فرمایا کہ نہ تو اُنھیں منکرینِ حدیث یا اہلِ قرآن کی طرح متروک ومہجور اور غیر ضروری سمجھا جائے اور نہ ہی اہلِ حدیث کی طرح اُنھیں قرآن پر فوقیت دی جائے۔ آپ کی تعلیم کے مطابق حدیث، قرآن کے بعد واجب العمل کا درجہ رکھتی ہے اور معیار یہ رکھا ہے کہ جو حدیث تعلیمِ قرآن سے مطابقت رکھتی ہے یا قرآنی حکم کے خلاف نہیں جاتی، یا پھر پیشگوئیوں کی صورت میں کسی حدیث کا وقوع پذیر ہونا ثابت اور مُسلّم ہے تو وہ حدیث یقیناً صحیح اور قابلِ استنباط ہے۔ اِس طرح قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ کی صورت آپ نے یکسر ختم کردی۔ قرآنِ مجید کی عظمتِ شان اور فوقیت بیان کو کئی طرح سے ثابت کیا جن میں ایک یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مذہب کے عالم کو اگر کوئی دعویٰ ہے تو وہ اپنا دعویٰ اپنی کتاب (مذہبی کتاب) سے پیش کرے اور اُس کی دلیل بھی اُسی کتاب سے دے۔ نہ تو دعویٰ من گھڑت ہو اور نہ دلیل طبع زاد، پھر اپنا دعویٰ پیش فرمایا کہ قرآنِ مجید جو بھی دعویٰ پیش کرتا ہے اُس کی دلیل بھی خود ہی دیتا ہے۔ اِس چیلنج پر دنیا کا کوئی مذہب آج تک آگے نہ آسکا۔ پھر قرآنِ مجید کی زندہ آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ اُس کا کامل متبع اللہ کی طرف سے مکالمہ ومخاطبہ کا شرف حاصل کرسکتا ہے اور اُس کا ثبوت خود اپنی ذات سے دیا۔ جبکہ دنیا کا کوئی اور مذہب یا اُس کا پیرو یہاں تک کہ خود مسلمان کہلانے والے علماء جو آپ کے منکر ہیں، وہ بھی اپنی زندگیوں

میں خدا تعالیٰ سے مکالمہ و مخاطبہ پانے کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکے اور کر بھی نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حال کے عُلماء نے صریحاً اُس بات سے ہی انکار کر دیا کہ اسلام کی رو سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ و مخاطبہ ممکن ہے۔ حالانکہ مکالمہ و مخاطبہ اور الہامِ الٰہی روحانی بارش کا وہ پانی ہے جس سے دلوں کی بنجر زمین سیراب ہوتی اور روحانی گندگی کے رُکے ہوئے نالے چل پڑتے ہیں۔ اِمساکِ باراں جس طرح نت نئی بیماریوں کی راہ کھول دیتا ہے، بالکل اُسی طرح روحانی بارش کا فُقدان روحانی بیماریوں کو عام کر دیتا ہے۔ آج کا مسلمان اِنہی بیماریوں کی زد پر ہے۔ مقابلةً ہم مولانا مودودی صاحب سے متعلق ایک حوالہ دینا یہاں ضروری سمجھتے ہیں۔ ''کسی نے سوال کیا کہ ''آپ کی تعلیم کا امتیاز کیا ہے؟'' کہنے لگے کہ ''میری تعلیم کشف اور الہام کی گمراہی سے پاک ہے''۔ ''اللہ اللہ کتنی بدنصیب ہے قوم''۔ (یہ الفاظ سوال کرنے والے نے جواب سُن کر کہے)

(بحوالہ روئداد جلسہ سالانہ مقامی ۱۰ ستمبر ۱۹۶۳)

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ کشف و الہام کو گمراہ بتلانے والا یہ شخص یہ بھی نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤیائے صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے۔ اُمت کے سینکڑوں، خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء اپنے کشوف اور الہامات کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ اور یہی ایک امتیاز ہے جو اُمتِ محمدیہ کو دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے مقابلے میں حاصل ہے۔ یہی چیز اب آگے بڑھ کر احمدیوں اور عام مسلمانوں میں مابہ الامتیاز ہے۔ امامِ وقت کے انکار کی وجہ سے یہ سرمایہء افتخار اُن سے چھین لیا گیا ہے۔ اُن کی سماعتیں خدائی سرگوشیوں سے تہی ہیں۔ اور اُن کے دامن نصرتِ الٰہی سے خالی، دشمنوں پر اُن کا ہر وار اوچھا پڑتا ہے۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ کوئی امید بر نہیں آتی۔ تمام حربے اُن کے ٹوٹ چکے، اور سارے ہتھیار کند ہو چکے

ہیں۔ وہ موعودمہدی بھی آنہیں چکتا جس کے انتظار میں اِن کی خالی تجوریاں چشم براہ ہیں۔ ؎

حسرتیں دل کی مُجسّم نہیں ہونے پاتیں
خواب بننے نہیں پاتا بکھر جاتا ہے

آپ کی کتابیں جو روحانی خزائن سے بھری پڑی ہیں، دعوت مطالعہ دے رہی ہیں۔ آپ کی تحریروں میں نیم شبانہ دعاؤں کا خلوص ہے تو مفہوم میں قبولیت کا شہد اثر۔ حرف حرف جادو تو لفظ لفظ سحر، جیسے زخم دل ہیں کہ لودینے لگے ہیں اور حرفوں میں روشنی اُتر آئی ہے۔ ریشم ریشم باتیں، باتوں میں ایمان کی حلاوت، پیرایہء بیان گویا خلوص و پیار کی قندیل ہے کہ خانہء دل کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ معرفت کی باتیں جو سرگوشیوں میں کہی جاتی تھیں۔ یہاں مشکوں لُنڈھائی جارہی ہیں اور اسرارِ شریعت کے الجھے تار ناخن ہوش و خرد کے آگے کھلے جارہے ہیں۔ دلوں کی بنجر زمین علوم روحانی کے پانی سے سیراب و سرشار اور بہکے فلسفے نکاتِ معانی کے آگے سرنگوں ہیں۔ فلسفہء حیات کھلے آسمان کی طرح روشن اور شفاف۔ اپنے پیدا کرنے والے کی ذات میں یقین کی گرمی اور عمل کی تحریک ہے، فعالیت کی تلقین اور خلوصِ ایمان کی تفسیر۔

ایک سو سال کا عرصہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں بہت لمبا عرصہ نہیں، تاہم جس خلوص اور لگن کے ساتھ یہ کام عروج و کامرانی کی نئی نئی منزلیں طے کرتا جارہا ہے۔ وہ نا قابلِ اعتناء ہی نہیں، قرآنِ مجید کی تفسیر کا کام اب بہت آگے بڑھایا جاچکا ہے۔ تفسیرِ کبیر اور تفسیرِ صغیر کے نام سے علوم کے خزانے دنیا کے آگے ڈھیر کردئے گئے ہیں۔ یہی وہ خزائن تھے جن کے مہدی کے ذریعہ دئے جانے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا تھا۔ اسلامی فکر و فلسفہ پر مضبوط کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ قرآنی علوم اور اُن کی نکات آفرینی کا کام جاری

ہے اور جاری رہے گا کیونکہ اللہ کے کام میں وہ رمز پنہاں ہیں جو ضرورت زمانہ کے ساتھ آشکار اور ظہور پذیر ہوتے اور تشنگانِ علم وعمل کو سیراب و فیضاب کرتے رہیں گے۔ قرآنِ مجید کے تراجم کا کام سوزبانوں سے آگے بڑھ چکا ہے اور انجام کے قریب ہے۔ یورپ کے تثلیث کدوں میں مساجد کی تعمیر اور مشن ہاؤسز کا قیام اپنی اثر آفرینی اور جاذبیت کی وجہ سے محلِ نظر ہے۔ افریقہ کے جاہل اور پسماندہ عوام کی تعلیم اور صحت کی ترقی کے لئے سینکڑوں مدرسے اور ہسپتال وہاں کام کررہے ہیں۔ اشاعتِ لٹریچر کا کام روز افزوں ہے۔ خلیفہ وقت کی نگرانی میں ترقی و بہبود انسانی کی نت نئی اسکیمیں آئے دن منظرِ عام پر آتی اور دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہونچائی جاتی ہیں۔ لیکن یہی تو ہماری منزل نہیں ہے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ اور آپ کی سنت کا قیام عملی صورت میں جماعتی رنگ میں ہو چکا ہے۔ امامِ وقت کے خطبے اور تقاریر جو اصلاحِ اخلاق، تربیتِ قلب ونظر اور تزکیۂ نفوس سے متعلق ہوتے ہیں، وسعت پذیر ہیں۔ علومِ قرآنی اور معارفِ ربانی کا ایک سیلِ رواں ہے جو آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعہ ساری دنیا میں پہونچایا جاتا ہے۔ یہ وہ مائدہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے دنیا کی تمام تشنہ اور بھوکی روحوں کے لئے، جو حق کی جویا ہیں، بچھایا ہے اور اقوامِ عالم اُس سے اپنے روحانی کام ودہن کی آسائش کررہی ہیں۔ قرنِ اول میں مسلمانوں میں کمزوری کے جو آثار پیدا ہوئے، اُن کی صاف وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ نئے نئے فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد و افکار کو الجھا دیا تھا، عقائد میں اُلجھن اور تردّد نے اُن کی عملی قوتوں کو زائل کرنا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ سلب ہو کر رہ گئیں۔ درحقیقت ضرورت اِس بات کی تھی کہ بجائے یونانی یا عیسائی مابعد الطبعیاتی مباحث میں الجھنے کے، راست قرآنِ مجید سے مسائل استنباط کئے جاتے اور قرآن ہی کو سرچشمۂ فکر وعمل بنایا

جاتا۔مہدیء آخر الزماں کے ذریعہ جس علم الکلام کی بنیاد اب ڈالی گئی ہے۔وہ اصالتًا قرآنِ کریم ہی کا اکتساب ہے۔ یحی الدین ویقیم الشریعۃ کی تکمیل ہو چکی ہے۔اخلاق اور دعاؤں کے ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو چاہتے ہوئے، ساری دنیا کو اب ایک جھنڈے تلے جمع کیا جارہا ہے۔یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا ہے جس کے سایہ میں ہی عافیت اور امن کی ضمانت ہے۔آج امام جماعتِ احمدیہ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے والے اور آپ کی نصائح پر کان دھرنے والے، محسوس کرنے لگے ہیں کہ اُنھیں علم وعرفان کے نئے نئے جہانوں کی سیر کروائی جارہی ہے۔کائنات عالم کی وسعتیں اللہ کے اِذن سے ایک نقطہ پر مرکوز ہوتی جارہی ہیں۔غیر فانی مسرتوں کے وہ جام یہاں لُنڈھائے جارہے ہیں جن کا مزہ اِبتدائے اِسلام میں انسان نے چکھا تھا۔روح کی سرشاری اور تعلق باللہ کی وہ سرمدی کیفیتیں یہاں عام ہیں۔جن کی تلاش اور جستجو میں اسلام سے قبل اور گزشتہ ڈیڑھ صدی میں متلاشیانِ حق کے بے شمار قافلے دم توڑ چکے ہیں۔

احمدیت اِس دور کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔کاروانِ احمدیت کے غبارِ راہ میں ہی انسانیت کی عظمتیں پوشیدہ ہیں۔آنے والے ادوار میں امن وآشتی اور آزادی انسانیت کے متلاشی اِسی کارواں کے نشانِ راہ سے اپنا راستہ متعین کریں گے۔اِس کارواں کے غریب سے غریب اور معمولی پڑھے لکھے مگر مخلص شخص کے چہرے پر عزم ویقین کی وہ کِرن ہے جس سے عام نگاہیں آشنا نہیں، حالانکہ وہ کِرن مستقبل کی نئی نئی منزلوں کی طرف راہ نمائی کر رہی ہے۔دنیا کے گوشے گوشے میں جویائے حق، اِسی کارواں کے منتظر ہیں۔کوئی مخلص اور خدا ترس انسان جسے خدا کا خوف اور انسانیت سے پیار ہے۔اِس تحریک پر لبیک کہنے سے رہ نہیں سکتا۔ضرورت مؤثر رہنمائی اور تبلیغ کی ہے۔

ہم حقیقت ہیں تو تسلیم نہ کرنے کا سبب
ہاں ، اگر حرفِ غلط ہیں تو مِٹادو ہم کو

اور مِٹانے کی یہ کوششیں ایک سوسال سے جاری ہیں۔عوامی سطح سے ہٹ کراب حکومتی سطحوں پر اِن کوششوں کو وسعت دی جا چکی ہے۔حرفِ غلط ہوتا تو کبھی کا مِٹایا جا چکا ہوتا۔ یہ تو نقش کا لحجر ہے۔ ماضی قریب میں پاکستان میں استعماریت کی علمبردار دوحکومتیں اور دونوں سر براہانِ حکومت اپنے انجام کو پہونچ چکے ہیں۔اُن ادوار میں روا رکھے گئے ظلم وتعدی کے شعلے ابھی تک سرد نہیں ہوئے ہیں اور اب بھی اپنی سُرخ زبانیں نکالے موقعہ کی تلاش میں ہیں کہ احمدیوں کو چاٹ جائیں۔واقعی آدمی بڑا زودفراموش ہے۔دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتا۔جیسے اپنے حُسن وشباب پر اِترانے والا عبرتِ انجام سے بے نیاز ہوتا ہے۔لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حُسن کا یہ غرور اگر بڑھ کر استہزاء کا اور اذیت پسندی کا رنگ اختیار کرلے تو بہت جلد گرفت میں آجاتا ہے۔محُسن کش بھٹو بھی وقت کی آواز سے بے خبر تھا۔حُسنِ تدبیر، حُسنِ قوت اور حُسنِ اثر کے غرور نے اُسے کھلونا بنا رکھا تھا۔وقت کی وہ خاموش آواز جسے صرف اہلِ دل ہی سُن پاتے ہیں گونجتی رہی۔ ؎

کوئی مغرورِ حُسن سے کہہ دے
وقت سب سے خِراج لیتا ہے

بھٹو پر بھی خراج کی ادائی کا موسم آیا اور بہت جلد آیا۔ ماضی قریب کی تمام خوشگواریاں یوں لگیں جیسے بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔جیسے افق کے اُس پار ہی چھوٹ گئی تھیں۔اِس زمین میں سے جیسے علاقہ ہی نہیں رہا تھا کبھی اُن کا۔وقت نے قطرہ قطرہ خراج کی کشید شروع کی۔ایک ایک لمحہ صدیوں کا مثیل بن گیا۔حُسن کے تمام تیور اُجڑ گئے یہاں تک کہ پھوک رہ گیا جسے ہوا اڑا

لے گئی۔ ؎

اے چرخ کہن تیری تقسیم عجب ہے

دستار اُنھیں دی ہے جو سر بھی نہیں رکھتے

ایک عامرِ وقت نے حکومت پر اپنا پنجہ گاڑ دیا۔ یقیناً صورتِ حال درسِ عبرت تھی۔ خود آمر کے لئے بھی۔ لیکن آمر تو صرف ہنسنا جانتا ہے۔ دوسروں پر۔ خود سے بے خبر۔ لیکن قدرت کا اپنا ایک قانون ہے جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ؎

پژمردگیٔ گل پہ ہنسی جب کوئی کلی

آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

لیکن آمر کب پرواہ کرتے ہیں، ہنسی بڑھتی رہی یہاں تک کہ استہزاء کا رنگ اختیار کر گئی۔ بے نوا اور بے کس احمدی اَذانوں اور نمازوں سے روکے جانے لگے۔ سینکڑوں مکان اور جائیدادیں جلا کر رکھدی گئیں۔ احمدیوں کو اُن کے اپنے ہی گھروں میں محبوس کر کے سپردِ آگ کیا جانے لگا۔ کوئی جان بچا کر نکل آتا تو بارودی قہقہے اُس کا استقبال کرتے۔ جائز انسانی حقوق سے بھی اُنھیں محروم کر دیا گیا۔ درجنوں احمدی مرد و زن کیا بچے اور کیا جوان و بوڑھے، تاک تاک کر جھوٹے مقدموں میں پھنسائے اور پھانسی کے سزاوار ٹھہرائے گئے۔ جیلیں بے گناہوں سے بھر گئیں۔ لیکن حکومت کے تمام حربے ملکر بھی احمدیوں کے عزم اور وقار کو شکست نہ دے سکے۔ ؎

تاب و تواں نہیں ہے مگر حوصلے تو دیکھ

شیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

ظلم کا جھکڑ چلتا رہا، لیکن ظلم نے پہلے کب فتح پائی تھی کہ اب کامراں ہوتی۔ بے گناہ

جب بھی سردار نظر آتے ہیں، اک نئے دور کے آثار نظر آتے ہیں، یہاں بھی وہی ہوا۔ دستِ غیب نے اپنا ہنر آزمایا۔ قضا کا پنجہ کُھلا اور آمرِ وقت اُس میں بند ہو گیا۔ اُس کی ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چل سکا۔ نہ تو زمین اُسے قبول کرنے پر راضی ہوئی نہ آسمان۔ ایک اور صف لپیٹی گئی اور اہلِ دل کی دھڑکنیں گنگناتی رہیں۔

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

اِس ظلم و بے انصافی کے خلاف جو مختلف اِزموں اور مکاتیب کے نام پر دنیا میں روا رکھے جا رہے ہیں۔ جب احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی فتح ہوگی تو قوم، خطے یا قبیلے کو نہیں بلکہ اُن لوگوں کی فتح ہوگی جنھیں نظر انداز کیا گیا تھا۔ یا پھر دانستہ غلط راستے پر ڈالا گیا تھا۔ یہ اُن کروڑوں انسانوں کی بھی فتح ہوگی جو عدل و انصاف، نیکی و راستبازی، امن و سلامتی اور اخوت و مساوات کے طلب گار ہیں۔

(8)

سیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتائیے۔ آپ نے فرمایا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنَ یعنی آپ کے اخلاق وہی تھے جو قرآن نے بیان کئے تھے۔ یعنی قرآن نے مؤمن کے جو اخلاق بیان کئے ہیں، اُن ہی اخلاق پر آپ کاربند تھے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے اور سچے عاشق تھے۔ اس لئے آپ نے ہر معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اور حضور کے اخلاق کو زندہ کر کے دکھایا۔ آپ کی دعویٰ سے پہلے کی زندگی ایسی ہی پاک اور شفاف تھی۔

۱) مشہور لیڈر ظفر علی خان کے والد منشی سراج الدین صاحب حضور کے قیام سیالکوٹ 1864 تا 1868 کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ’’ہم چشم دید شہادت سے کہہ سکتے ہیں کہ جوانی میں بھی نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے۔ کاروبار ملازمت کے بعد ان کا تمام وقت مطالعہ دینیات میں صرف ہوتا تھا۔ عوام سے کم ملتے تھے‘‘۔

(اخبار زمیندار مئی ۱۹۰۸ء بحوالہ تاریخ احمدیت جلد ا صفحہ ۹۴)

۲) دوسری گواہی مئی 1908ء قادیان کے ایک مدرس پنڈت دیال رام کی ہے۔ انہوں نے حلفیہ تحریر کیا ہے۔ ’’مَیں نے مرزا صاحب کی طبیعت میں کبھی غصہ نہیں دیکھا، جھوٹ سے ہمیشہ نفرت کرتے تھے، مرزا غلام احمد صاحب کی نسبت مَیں نے کبھی نہیں سنا کہ انہوں نے

چھوٹی عمر میں کوئی برا کام خلافِ شریعت یا مذہب کیا ہو اور نہ ہی دیکھا تھا۔ مَیں نے مرزا صاحب کو نہ کبھی بدنظری کرتے دیکھا اور نہ سنا بلکہ وہ بدنظری کو ناپسند فرماتے اور دوسروں کو روکتے تھے، کبھی کسی میلہ یا کسی تماشہ یا کسی اور مجلس میں نہ جایا کرتے تھے۔ میری موجودگی میں مرزا غلام احمد صاحب نے کبھی کوئی عیب نہیں کیا اور نہ کبھی مَیں نے اس وقت سنا تھا۔‘‘

(سیرۃ المہدی جلد نمبر ۳ صفحہ 183)

۳) تیسری گواہی آپ کے بڑے بیٹے مرزا سلطان احمد صاحب کی ہے جو بہت بعد میں 1932ء میں جماعتِ احمدیہ میں شامل ہوئے۔ بیعت سے بہت پہلے اپنے والد کے ابتدائی حالات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ’’والد صاحب جوانی میں دین کی خدمت میں لگے رہتے تھے، گاؤں والے آپ پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ شریک جو ویسے ہی مخالف تھے اُن کی نیکی کے اِتنے قائل تھے کہ جھگڑوں میں کہہ دیتے تھے کہ جو کچھ یہ کہہ دیں گے ہم کو منظور ہے۔ ہر شخص آپ کو امین جانتا تھا‘‘۔ (سیرۃ المہدی جلد نمبر ا صفحہ 200)

۴) حضرت قاضی امیر حسین صاحب بیان کرتے ہیں۔

’’ایک دفعہ ہم نے حضور سے دریافت کیا کہ حدیث میں آتا ہے سب نبیوں نے بکریاں چرائی ہیں کبھی حضور نے بھی چرائی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ مَیں ایک دفعہ باہر کھیتوں میں گیا۔ وہاں ایک شخص بکریاں چرا رہا تھا، اُس نے کہا کہ مَیں ذرا ایک کام سے جاتا ہوں، آپ میری بکریوں کا خیال رکھیں۔ مگر وہ ایسا گیا کہ بس شام کو واپس آیا اور اُس کے آنے تک مجھے ہی اُس کی بکریاں چرانی پڑی تھیں۔‘‘ (سیرۃ المہدی جلد نمبر ۳ صفحہ 81)

۲۹/اکتوبر/۲۰۰۵

(9)

سیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام (۲)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑھ کر عاشق اور آپ کے اخلاق اور سیرۃ کو اپنے وجود کے ذریعہ دوبارہ زندہ اور قائم کرنے والے تھے۔ اسلام کے مٹتے ہوئے آثار اور مسلمانوں کی شکست اور پستی آپ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ جب دنیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور کردار کو بھلا چکی تھی اور عیسائیوں، آریوں اور یہودیوں وغیرہ دشمنوں کے خلاف کچھ نہ کرسکتی تھی، آپ اسلام کی اور بانئ اسلام کی غیرت لے کر کھڑے ہوئے اور نعرہ لگایا کہ اسلام کا خدا ہی زندہ خدا ہے۔ اسلام کا رسول ہی زندہ نبی ہے، اور اسلام کی کتاب یعنی قرآنِ مجید ہی ایک زندہ کتاب باقی ہے۔ دنیا بھر میں اسلام کے جتنے دشمن تھے اُنھیں آپ نے چیلنج دیا۔ بہت سے دشمنوں سے آپ کے علمی مقابلے ہوئے۔ اُن سب کو آپ نے شکست دی۔ بلکہ شکست بھی ایسی کہ وہ دوبارہ سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔ آج دنیا میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مشن ہیں اور علم وفن کے ایسے ماہرین اُن کے پاس ہیں کہ دنیا اُن کا جواب لانے سے عاجز ہے۔ لیکن مذہبی معاملے میں اُن کا بڑے سے بڑے مناد اور پادری احمدیوں کے ایک معمولی عالم سے مقابلہ کرنے سے گھبراتا ہے۔ بلکہ مشنری کی جانب سے اُنھیں ہدایت ہے کہ سب کو چیلنج دو اور سب کے چیلنج قبول کرو لیکن احمدیوں سے دور رہو۔ چنانچہ عیسائی پادری ہوں یا آریہ سماج کے پنڈت، برہمو، یہودی اور دیگر تمام فلسفوں اور مذاہب والے احمدیوں سے علمی مقابلہ میں اپنے عجز اور کمزوری کا اظہار کرچکے ہیں۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ڈھاک اُن پر بیٹھ چکی ہے کہ وہ کھلم کھلا اسلام کے خلاف دعویٰ کرنے سے ڈرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام حسن واحسان میں اپنے آقا ومطاع رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی نمونہ اور کردار وعمل میں آپ کی حقیقی تصویر تھے۔ وہی تڑپ اور وہی لگن کہ اللہ کا نام بلند ہو۔ اللہ کی حکومت جیسی آسمان پر ہے ویسی ہی زمین پر بھی آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ مسلمان کے قول وفعل سے ظاہر ہو۔ دنیا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین چہرے کو پہچان لے انسانیت سے پیار اور اُس کی بلندی، وسرفرازی کے لئے ایک جوش ایک ولولہ اور ایک لگن آپ کے سینے میں موجزن تھی۔ ساری زندگی آپ نے اللہ کی صفات کو جلوہ گر کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوبصورت چہرے کو دنیا سے روشناس کرانے میں گزار دی اور اپنے پیچھے ایک ایسی تنظیم اور ایک ایسی فعال جماعت چھوڑ گئے جو اسلام کے علَم کو دنیا میں سب سے اونچا لہرانے میں دن رات ایک کئے ہوئے ہے۔

اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد

۞۞۞

۲۵/اکتوبر/۱۹۹۶ء

(10)

سراپائے اقدسؐ

سراپاپہ جس جا نظر کیجئے　　وہیں عُمر ساری بسر کیجئے

میرؔ

شعورِ آدمیت ناز کر اُس ذات اقدس پر　　تیری عظمت کا باعث ہے محمدؐ کا بشر ہونا

میرے پیارے آقا، آقائے نامدار، حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم، اپنی صفات جلال و جمال میں ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ ساری مخلوقات میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کے مماثل ہو یا آپ سے مقابلہ کر سکے۔ آپ کی مثال اگر تلاش کی جاسکتی ہے تو آپ کی امت کے اندر اور آپ کے غلاموں میں، وہ بھی علیٰ قدرِ مراتب، اور اُن سب میں بھی آپ سے قریب ترین درجہ اور مماثلت پر فائز آپ کے کامل متبع، آپ کے سب سے زیادہ باوفا، حُسن واحسان میں آپ کے مثیل، حضرت مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ باصفات ہے۔ یہ جو میرؔ کا شعر ابھی مَیں نے پڑھا وہ اپنے محبوب کے سراپا کی تعریف میں ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک کسی حصہ جسم پر آپ حَصر کریں مثلاً آنکھوں پر یا لب ورخسار پر، اور خوبیوں اور خوبصورتیوں کو بیان کرتے چلے جائیں تو ساری عمر بیت جائے گی۔ لیکن حُسن بیان اور خوبیاں ختم نہیں ہوں گی۔ یہ شعر ہمارے آقا و مولا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل چسپاں ہوتا ہے۔ ہم اپنے مضمون کو آپ کے سرِ اقدس سے شروع کرتے ہیں۔

سرِ مبارک:۔

آپ کے سرِ مبارک کی توصیف اِن الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ ”حضورؐ کا سرِ مبارک بڑا

تھا'' سر کا بڑا ہونا، بزرگی، وفورِ عقل اور جودتِ فکر کی طرف اشارہ ہے۔

موئے مبارک:۔

حضرت انسؓ کا قول ہے کہ ''حضور کے بال نصف کانوں تک تھے''۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق ''آپ کے بال نہ بڑے تھے اور نہ چھوٹے بلکہ متوسط تھے'' اس کی تائید حضرت براءؓ نے بھی کی ہے کہ ''حضور کے بال نہ پیچیدہ تھے نہ بالکل کھلے ہوئے بلکہ تھوڑی سی پیچیدگی لئے ہوئے تھے یعنی معمولی گھنگریالے تھے اور کانوں کو چھوتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالوں میں مانگ نہیں نکالتے تھے بلکہ یونہی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مشرکین مکہ مانگ نکالا کرتے تھے۔ ابتداء میں حضور کا طریق یہ تھا کہ جب تک کسی معاملے میں واضح احکام نہیں ملتے تھے۔ آپ اہلِ کتاب کے طریق پر عمل فرماتے تھے۔ بعد میں یہ عمل منسوخ ہو گیا تھا۔ اوپر کی روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بال بڑھنے والی چیز ہیں۔ کسی نے اس حال میں آپ کو دیکھا کہ بال بڑھے ہوئے تھے اور کسی نے اِس حال میں کہ بال گھٹے ہوئے تھے۔ آپ کی ریش مبارک گھنی تھی۔ آپ اُس میں کنگھی بھی کیا کرتے تھے۔ آپ آئینہ دیکھا کرتے تھے۔ سونے سے پہلے آنکھوں میں تین بار سُرمہ لگایا کرتے تھے۔ شوارب (مونچھ) کو کٹوایا کرتے تھے اور فرماتے تھے، مشرکین کی مخالفت کرو۔ عُمرِ شریف کے آخری دنوں میں آپ کی داڑھی میں بیس بال سفید تھے۔ گلے اور ناف کے درمیان بالوں کا باریک خط تھا۔ شکم اور پستانوں پر بال نہ تھے۔ دونوں بازوؤں، شانوں اور سینہ کے بالائی حصہ میں بال زیادہ تھے۔

چهره انور:۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ''مَیں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

زیادہ حسین چیز کوئی نہیں دیکھی۔ چہرہ پُرگوشت اور قدرے گول تھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جسے دیکھتے ہی عبداللہ بن سلام پکار اُٹھے تھے کہ ''آپ کا چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے''۔

ابنِ عساکرؒ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے۔

''مَیں سحری کے وقت کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ مجھ سے سوئی گر پڑی۔ ہر چند کہ بہت تلاش کی مگر نہیں ملی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کے روئے مبارک کی ضیا میں وہ نظر آئی۔''

جبین مبارک:۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ کہ آپ کی پیشانی کشادہ تھی۔ اہلِ سیَر بیان کرتے ہیں کہ آپ کی پیشانی سے سعادت مندی اور وفورِ ایزدی کی بارش ہوتی تھی۔

حضرت حسان بن ثابت فرماتے ہیں کہ ''جب اندھیری رات میں اُس کی پیشانی ظاہر ہوتی تو اندھیرے کے روشن چراغ کی طرح چمکتی'' یہ وہی پیشانی مبارک تھی کہ جب وحی کا نزول ہوتا تو پیشانی عرق آلود ہوجایا کرتی تھی۔ جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا قول تھا کہ ''مثل الجمان'' یعنی پیشانی پر موتی ڈھلکتے تھے''۔

ابروئے مبارک:۔

حضور کی بَھویں لمبی اور باریک تھیں۔ درمیان میں دونوں اِس قدر ملی ہوئی تھیں کہ دور سے باہم متصل دکھائی دیتی تھیں۔ اِن دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت خون سے بھر کر حرکت میں آجاتی تھی۔ اسی بات کو حضرت علیؓ نے ''**واضح الجبین، مقرون الحاجبین**'' کشادہ پیشانی اور ملی ہوئی بَھویں کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ آپ کی بَھوؤں کے چند بالوں کا اتصال تھا۔ حضرت ہند ابن

ابی ہارنے اس بات کو ''ازج الحواجب'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ایک دوسری روایت میں اس بات کو ''ازج الحواجب سوابغ'' یعنی کشیدہ ابرو اور گھنے بال سے یاد کیا گیا ہے۔بیہقی کی کتاب سُنن الکبریٰ میں خدامِ رسالت نے کہا کہ آپ کا چہرہ نہایت حسین، پیشانی بلند اور ابرو باریک تھے۔

چشم مبارک:۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ حضور کی آنکھیں بڑی اور پلکیں دراز تھیں۔ ہاں آنکھوں کے بڑی ہونے کا مطلب تنگی اور کوتاہی کی نفی کرنا ہے۔یعنی نہ چھوٹی تھیں نہ اتنی بڑی کہ باہر کو نکلی ہوئی معلوم ہوں۔آنکھوں کی سفیدی میں باریک سُرخ ڈورے تھے۔ چنانچہ احادیث میں اِسے اثیکل العینین کے نام سے پکارا گیا ہے۔بعض احادیث میں اشھل العینین بتاتی تھی۔ چنانچہ پچیس سال کی عمر میں جب آپ حضرت خدیجہؓ کا مالِ تجارت لے کر میسَرہ غلام کے ساتھ شام کی طرف گئے ہیں تو وہاں ایک عیسائی راہب نے میسَرہ سے آپ کے بارہ میں یہی پوچھا تھا کہ ''کیا آپ کی آنکھوں میں سُرخی جھلکتی ہے؟میسَرہ نے یہی جواب دیا تھا کہ ہاں! یہ سرخی آپ سے کبھی غیر مُنفک (علیحدہ) نہیں ہوتی۔

گوشِ مبارک:۔

حضور کے ہر دو گوش کامل وتام تھے۔قوتِ بصر کی طرح آپ کی سماعت بھی غیر معمولی تھی۔ حدیث میں آیا ہے ''مَیں ایسی چیزوں کو دیکھ لیتا ہوں ،جنھیں تم نہیں دیکھتے اور مَیں وہ آوازیں بھی سن لیتا ہوں جسے تم نہیں سُن سکتے۔مَیں آسمان کی آواز ''اطیط'' بھی سن لیتا ہوں۔ یہ آپ کی قوت سماعت کا کمال تھا کہ ایک بار حضرت جبریل آپ کی خدمت میں حاضر تھے کہ کسی آواز پر آپ نے اوپر دیکھا۔حضرت جبریل نے فرمایا، یہ آسمان کے ایک دروازے کے کھلنے

کی آواز ہے جو آج پہلی بار کھولا گیا ہے۔

بینی مبارک:۔

بینی فارسی لفظ ہے۔جس کے معنی ہیں ناک۔عربی میں ناک کو انف کہتے ہیں۔آپ کی ناک بہت خوبصورت اور دراز تھی اور درمیانی ابھار نمایاں تھا۔روایت میں اِس کے متعلق آتا ہے۔ اقنی الانف و اقنی العزیمن عرنین کے معنی ہیں بلندی جو موئے ابرو کے نیچے ہے۔اقنی کے معنی ہیں درمیان سے اُبھری ہوئی۔ اِس سے مراد لمبائی اور باریکی کے درمیان ایک گونہ ہمواری کے ہیں۔حضور کی ناک ایسی نورانی اور روشن تھی کہ دیکھنے والا جب تک غور سے نہ دیکھے یہی گمان کرتا تھا کہ بینی شریف بلند ہے۔ حالانکہ وہ بلند نہیں بلکہ وہ بلندی نور کی تھی جو اُسے ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔

دھانِ مبارک:۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشادہ دہن تھے۔آپ کا دہن فراخ، رخسار ہموار، دندان ہائے پیش کشادہ اور روشن و تاباں تھے۔آپ جب کلام فرماتے تو اگلے دانتوں سے نور کے فوارے پھوٹتے نظر آتے تھے۔جب حضور مسرور ہوتے تو رخِ انور کی دیواریں روشن ہو جاتیں۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے آپ کو کبھی جماہی نہیں آتی تھی۔ جماہی دراصل سستی اور کسلمندی کی علامت ہے۔

زبانِ مبارک:۔

خود حضور کا فرمان ہے کہ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور میرے ادب کو اچھا کر دیا۔ یہ تادیبِ خداوندی کا نتیجہ تھا کہ آپ فصیح اللسان تھے۔آپ کے جوامع الکلم، بدائع حکم، امثال سائرہ، درمنثور، مکاتیب و مواعظ مشہور آفاق ہیں۔جن کی خوبیوں کا بیان زبانِ قلم

سے ادا کرنا ممکن نہیں۔ایک بار حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کی ''یارسول اللہ آپ کبھی یہاں سے باہر نہیں گئے اور نہ غیروں میں آپ کی نشست و برخاست رہی، پھر آپ ایسی فصاحت کہاں سے لے آئے۔آپ نے فرمایا۔حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی لغت اور محاورہ جو ناپید اور فنا ہو چکا تھا۔حضرت جبریل کے ذریعہ مجھ تک پہنچا، اور میں نے اُسے یاد کرلیا۔'' پھر یہ بھی فرمایا۔ ''میری تربیت قبیلہ بنو سعد میں ہوئی ہے پورے عرب میں فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ تھا'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور کا کلام تمہارے کلام کی طرح نہ تھا کہ بوجہ عجلت سامع پر ملتبس ہوجاتا بلکہ آپ کا کلام نہایت واضح اور بیّن ہوا کرتا تھا کہ سُننے والا چاہتا تو اچھی طرح یاد کرلیتا۔حضرت امِّ معبدؓ فرماتی ہیں کہ آپ کا کلام شیریں، حق و باطل میں فرق کرنے والا، نہ کم نہ زیادہ بلکہ درمنثور ہوا کرتا تھا۔

گردنِ مبارک:۔

گردن کیا تھی بُت عاج (ہاتھی دانت) کی گردن تھی گویا ہاتھی دانت سے تراشی ہوئی پتلی گردن تھی۔حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ حضور کی گردن ایسی شفاف اور چمکیلی تھی، جیسے چاندی کی بنی ہوئی ہو۔

آوازِ مبارک:۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیائے کرام سے زیادہ خوبرو اور خوش آواز تھے۔آپ کی آواز ذرا بھاری تھی اور آپ کے اوصافِ حمیدہ میں شمار ہوتی تھی۔آپ جہیر الصوت تھے۔آواز میں بلندی اتنی تھی کہ جہاں تک آپ کی آواز پہنچتی تھی، کسی اور کی نہیں پہنچ پاتی تھی۔خصوصاً خطبات میں آپ کی آواز اتنی بلند ہوتی تھی کہ گھروں میں پردہ نشین خواتین بھی بآسانی سن لیا کرتی تھیں۔حضرت عبدالرحمان بن معاذ فرماتے ہیں کہ منیٰ میں حضور نے خطبہ پڑھا تو

ہمارے کان کھل گئے اور ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھے بآسانی سنتے رہے۔

تبسم شریف:۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ”مَیں نے حضور کو کبھی قہقہہ لگا کر ہنستے نہیں دیکھا۔ آپ ہمیشہ تبسم فرمایا کرتے تھے جس سے دانتوں کی سفیدی ظاہر ہوجاتی تھی۔حافظ ابن حجرؒ کا قول ہے کہ حضور جب بے حد مسرور ہوتے تب بھی اظہارِ مسرت کے لئے تبسم سے آگے تجاوز نہ فرماتے تھے۔بیہقی کی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی گئی ہے جب حضور ضحک فرماتے تھے تو دیواریں روشن ہوجاتی تھیں۔اور اُن پر آپ کے دانتوں کا نور آفتاب کی کرنوں کی طرح جلوہ ریز ہوجاتا تھا۔آپ قہقہہ کبھی نہ لگاتے کہ مکروہ ہے۔ نیز آپ کبھی جماہی نہ لیتے کیونکہ کسلمندی اور اعضاء کی سستی کی علامت ہے۔

گِریہ مبارک:۔

آپ کا گریہ بھی تبسم کی طرح تھا کہ آواز بلند نہ ہوتی تھی، البتہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے تھے۔اور سینہ اطہر سے ایک خاص قسم کی آواز سنائی دیتی تھی جو ابلتی ہوئی دیگ کی آواز سے مشابہ ہوتی تھی۔آپ کا گریہ جلالِ الٰہی کی تجلی، امت پر شفقت اور رحمت کے سبب ہوا کرتا تھا، اور اکثر قرآنِ کریم کے استماع اور شب گیر دُعاؤں کے موقعہ پر ہوتا تھا۔

دستِ مبارک:۔

حضور کے بازو اور کف دست پُر گوشت تھے۔حضرت سعد بن وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت میری عیادت کے لئے تشریف لائے، اپنا دستِ مبارک میری پیشانی پر رکھا اور میرے چہرے، سینے اور پیٹ پر مسح فرمایا۔ مَیں آج تک آپ کے دستِ اقدس کی ٹھنڈک اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔حضرت یزید بن اسودؓ فرماتے ہیں۔”حضورِ اکرم نے اپنا دست

مبارک میرے ہاتھ میں دیا تو مجھے برف سے زیادہ ٹھنڈا اور مُشک سے زیادہ خوشبودار محسوس ہوا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ "مَیں نے ریشم یا دیبا کو آپ کے کفِ مبارک سے زیادہ نرم نہیں پایا، اور نہ کسی خوشبو کو اُس سے بڑھ کر۔

پائے مبارک:۔

حضور کے مبارک پاؤں پُرگوشت اور نہایت خوبصورت تھے۔ نرم اور صاف ایسے کہ اُن پر پانی نہیں ٹھہرتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ آپ جب چلتے تو پورا قدم رکھ کر چلتے یعنی آپ کے پائے میں اخمص (اُبھار) نہ تھا۔ ایڑیاں کم گوشت تھیں۔ ہر دو ساقِ مبارک باریک سفید اور لطیف تھے۔ جب آپ چلتے تو قدم مبارک قوت، تثبت، وقار اور تواضع سے اُٹھاتے جیسا کہ اہلِ ہمت وشجاعت کا قاعدہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور سے بڑھ کر کسی اور کو چلنے میں تیز تر نہیں پایا۔ آپ چلتے تو معلوم ہوتا کہ زمین آپ کے لئے لپیٹی چلی جارہی ہے۔ ہم دوڑا کرتے اور تیز چلنے میں مشقت اُٹھاتے۔ اور آپ بآسانی بے تکلف چلتے، پھر بھی سب سے آگے رہتے۔

قامتِ زیبا:۔

آپ کا قدِ مبارک لطیف اور موزوں تھا۔ نہ کوتاہ نہ بہت دراز، اگرچہ مائل بدراز تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ متوسط القامت تھے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ پستہ قد سے طویل قامت اور طویل قامت سے کوتاہ تھے۔

۲/اپریل/۲۰۰۷ء

(حوالہ جات فی جمع الوسائل فی شرح الشمائل تالیف علی بن سلطان محمد القادری طبعۃ الاولیٰ ۱۳۱۷ ہجری)

(11)

حضرت الحاج سیٹھ محمد معین الدین صاحب

(چنتہ کنٹہ)

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں　　بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

خندہ رو، خندہ لب، خندہ ذہن، دلربا شخصیت، نیت پارسائی اوڑھے ہوئے، ہردم یہی آرزو کہ جماعت کا اور اہلِ جماعت کا فائدہ ہو۔ لاکھوں کمائے، لیکن جائز ضروریات کے علاوہ، اپنے لئے کچھ نہیں رکھا۔سوائے ایک مکان کے، جس میں سارا کنبہ مشترکہ زندگی گزارتا تھا۔کوئی زمین، کوئی جائداد شہر میں نہیں بنائی۔حتی الامکان یہی کوشش رہی کہ جماعت پرخرچ کیا جائے۔درویشانِ قادیان سے بہت لگاؤ تھا۔جس قدر ممکن ہوا، اُن کی مدد کی، خدمت کی۔جلسہ سالانہ قادیان پر پابندی اور اہتمام سے جاتے۔جلسہ پر جانے والوں کے لئے ڈھیر ساری چیزیں پکوا کرلے جاتے۔کئی احباب کے ٹکٹ کا خود انتظام کرتے۔اندازاً چالیس سال بلاناغہ جلسہ میں شرکت کرتے رہے۔اپنے پوتے عظیم الدین کی شادی کے موقعہ پر انہیں فالج کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ایک پاؤں مفلوج ہوگیا۔لیکن جلسہ سالانہ میں شرکت سے باز نہ رہے۔اُسی حالت میں اپنے معمول کے مطابق ورنگل نومبائعین کی جماعتوں کا دورہ کیا اور وہاں تقریر بھی کی۔اُن کی ضعیفی میں نوجوان نسلوں کے لئے عمل کے کئی درس تھے۔جلسہ سالانہ

قادیان سے لوٹ کر گھر آتے تو کہا کرتے کہ مجھے تو سال بھر کی روزی مل گئی ہے۔ اُن کی فعالیت میں اُن کی اہلیہ احمدی بیگم صاحبہ کا تعاون اور اُن کی نیک طبعی کا بڑا دخل تھا۔ دونوں کا ایک دوسرے سے اُنس اور اِعتماد و بھروسہ لازوال تھے۔ اُس نے ان کی زندگیوں کو ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ مکمل نمونہ بنادیا تھا۔ جہاں بھی جاتے اپنی اہلیہ کو ساتھ رکھتے تھے۔ نہایت وضعدار آدمی تھے۔ لیکن بے حد سادگی وانکساری کا مجسمہ۔ نیچے بیٹھنے میں کوئی عار نہ تھا۔ دسترخوان ہمیشہ نیچے ہی بچھاتے تھے۔ میز کرسی پر کھانا پسند نہیں تھا، خاکساری اور خاک نشینی ان کا تیور تھا۔ مریضوں کی عیادت کو بڑی نیکی جانتے تھے ۔اولاد سے بہت محبت تھی اور اَكْرِمُوْا اَوْلَادَكُمْ ہمیشہ پیشِ نظر رہتا تھا۔ کسی بھی اہم معاملے میں چھوٹوں سے بھی مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ قادیان کی یا مقامی کوئی تحریک ایسی نہ جاتی تھی کہ اُس میں اپنا نام نہ لکھواتے۔

درویشانِ قادیان کے لئے ہر سال گرم کمبل اور دیگر استعمال کی ضروری اشیاء لے کر جاتے تھے اور اُن کی ذاتی اغراض میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ چندوں وغیرہ کی کوئی تحریک ہوتی، ضرور حصہ لیتے اور کسی ایک مد میں بھی حصہ لینے سے محروم رہنا پسند نہ فرماتے۔ چنتہ کنٹہ ابتداً جو بیڑی کا کارخانہ تھا وہ حضرت شیخ حسنؓ کا لگایا ہوا تھا اور سیٹھ محمد حسین صاحب جو سیٹھ شیخ حسنؓ کے برادر نسبتی تھے اُس کے انچارج، مینیجر اور پارٹنر تھے۔ سیٹھ محمد معین الدین صاحب نے ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی پھر حضرت شیخ حسن صاحب کے خرچ پر اُس اکیاون لڑکوں کے بیچ میں شامل ہوکر قادیان چلے گئے، جو تعلیم کی غرض سے بھجوایا گیا تھا۔ وہاں کے نیک اور پاک ماحول میں، خصوصاً اپنے استاد حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب جٹؓ کی خصوصی محبت اور توجہ کی وجہ سے نمازوں کی پابندی اور اطاعتِ نظام کی اہمیت کو سمجھنے کے اہل ہوگئے۔

چند سال بعد تعلیم مکمل کئے بغیر اپنے گاؤں چنتہ کنٹہ واپس آ گئے۔ یہ اوائل جوانی کا زمانہ تھا۔ اپنے والد کے ساتھ اُن کے کارخانے میں ملازم ہو گئے۔ اور بہت معمولی تنخواہ پر کام کرنے لگے۔ دس گیارہ سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایمانداری اور دیانت اُن کا شیوہ تھا۔ کاروبار ترقی کرنے لگا۔ جب چوبیس پچیس سال عمر ہوئی تو جڑ چرلہ کے ایک مخلص خاندان میں محترم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی منجھلی صاحبزادی، احمدی بیگم سے اُن کی شادی ہوگئی۔ ۱۹۳۵ء میں اُن کے ہاں پہلا لڑکا تولد ہوا جس کا نام محمد بشیر الدین رکھا گیا۔ چونکہ اپنی محنت اور دیانت داری کی وجہ سے وہ حضرت شیخ حسن صاحبؒ کی نظر میں آ چکے تھے۔ اس لئے اُن ہی کے مشورہ پر اُن کے والد سیٹھ محمد حسین صاحب نے کچھ تمبا کو اور پتہ دے کر انہیں علیحدہ کارخانہ لگا لینے کا مشورہ دیا۔ اِن کے ایک چھوٹے بھائی محمد اعظم صاحب دائم المریض تھے، اور اُن کی نیکی کی وجہ سے اُن کے بڑے بھائی محمد معین الدین صاحب اُنہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس لئے اُن کے نام پر ''اعظم بیڑی'' کے نام سے انہوں نے نیا کاروبار شروع کیا اور ایک نئے کارخانہ کا قیام عمل میں آیا۔

لگن سچی ہو اور محنت و دلچسپی شدید، تو اللہ تعالیٰ منزل کو قریب کر دیتا ہے کسی کا قول ہے کہ خوش بختی محنت کی اولاد ہے۔ اعظم بیڑی کا برانڈ دِن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ واضح ہو کہ یہ کاروبار اِن کا اپنا تھا اور اُن کی کاوشوں کا مرہون تھا۔ دوسرے چاروں بھائی اور دو بہنیں چھوٹے تھے اور سب کے سب ایک ہی گھر میں مشترک رہتے تھے۔ جب اُن کے والد سیٹھ محمد حسین صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کا کاروبار جو دراصل یادگیر کے سیٹھ شیخ حسن صاحبؒ کا کاروبار تھا۔ وہ راست یادگیر والوں کے قبضہ اور تصرف میں آ گیا اور سیٹھ محمد اسمٰعیل صاحب چونکہ سیٹھ شیخ حسن صاحب یادگیر کے داماد تھے اس لئے چنتہ کنٹہ کے کاروبار کی نگرانی اُن کے

سپرد ہوگئی۔ سیٹھ محمد اعظم صاحب جو تیسرے بھائی تھے، جوانی میں فوت ہو گئے تھے، اور اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو کم عمر لڑکیوں کو چھوڑ گئے تھے۔ وہ سب اور دو چھوٹے بھائی محمود احمد صاحب اور رشید احمد صاحب راست اِن کی کفالت میں آ گئے۔ محمود احمد صاحب بڑے بھائی کے ساتھ، اعظم بیڑی میں کام کرنے لگے اور رشید احمد صاحب تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چند سالوں بعد جب یہ دونوں بھائی شادی شدہ ہو چکے تھے تو سیٹھ محمود احمد صاحب چنتہ کنٹہ میں اعظم بیڑی سے ہی وابستہ رہے۔ لیکن رشید احمد صاحب کو جلال کوچہ کا مکان اور کارخانہ دیدیا اور اُن کو علیحدہ کر دیا۔ سیٹھ محمد اعظم صاحب مرحوم کی بیوہ اور دونوں لڑکیوں کو ایک علیحدہ مکان بنوادیا اور بعد میں لڑکیوں کی شادی کے بعد انہیں علیحدہ کر دیا۔ سیٹھ محمود احمد صاحب نے اپنا کاروبار علیحدہ شروع کر دیا۔ سیٹھ محمد معین الدین صاحب نے اپنا پرانا کارخانہ اور بلڈنگ سیٹھ محمود احمد صاحب کے حوالہ کر کے، دوسری جگہ اپنا کارخانہ، گودام اور بلڈنگ کا انتظام کر لیا۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور عمر اسی سال کے قریب تھی۔ اُن ہی دنوں اپنے تمام کاروبار، مکان، گاؤں کی زمینات اور جائداد وغیرہ کی اپنی اولاد میں منصفانہ تقسیم کر کے، خود ایک چھوٹا مکان کرایہ پر لے کر اُس میں منتقل ہو گئے۔

انسان کی فطری خواہش میں ایک خواہش یہ عادت ہے کہ ہر انسان خود پسند اور خود پرست واقع ہوتا ہے۔ اور سکھ چاہتا ہے۔ فرق نظریہ کا ہوتا ہے۔ کوئی دولت کو سکھ سمجھتا ہے تو کسی کو عورت اور شراب میں سکھ اور آرام کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کسی کو ایثار اور قربانی سکھ اور آرام پہنچاتی ہے۔ حضرت سیٹھ صاحب ایثار و قربانی کے جویا تھے۔ دنیوی تعیّشات اور جائدادیں بنانے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فرمایا کرتے تھے قادیان کے ساتھیوں میں ایک محمد اسمٰعیل صاحب وکیل یادگیر تھے۔ اُن کو اکثر یاد کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ وہ ایک سچے اور مخلص

دوست تھے اور سچے ہمدرد بھی تھے۔

ایک دفعہ قادیان جلسہ پر جانے کا موقعہ آیا تو وکیل صاحب نے مشورہ دیا کہ چنچل گوڑہ جیل سے جانمازیں سستی مل جاتی ہیں۔ قادیان کی مسجد مبارک کے لئے لے چلو۔ مَیں نے ان کا مشورہ قبول کرلیا۔ پھر ایسا چسکہ پڑ گیا کہ قادیان اور اہلِ قادیان کے لئے ہر ممکنہ اعانت اور اُن کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھنا ایک عادت بن گئی اور ایک لطف کا سامان ہو گیا۔

ساری جماعت کے اکٹھے رہنے، ان کی خصوصی تربیت اور آرام کے خیال سے ایک کالونی آباد کرنے کا انہیں خیال آیا۔ باسٹھ ایکڑ زمین کا ایک قطعہ پسند کیا اور اُس کی خریدی پر کئی لاکھ روپئے خرچ کردئے۔ اہلِ جماعت نے بھی وہاں اکٹھے رہنے کے خیال کو سراہا۔ تھوڑی تھوڑی پیشگی ادائی کر کے بعض لوگوں نے اپنے لئے زمینیں بھی بُک کروائیں۔ نوٹری بھی کروائی۔ لیکن بعض احباب نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ غلط مشوروں نے معاملے کو مؤخر کردیا۔ اسی دوران کچھ حصہ زمین حکومت نے ہتھیا لیا حکومت وہاں پولیس کالونی تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ رجسٹری وقت پر نہ کروانے کی وجہ سے اور بھی دشواریاں لاحق ہوگئیں۔ اور وہ زمین ہاتھ سے نکل گئی۔ سیٹھ صاحب کو ہمیشہ اس کا قلق رہا۔ وہ ایک قومی اور معاشرتی پراجکٹ تھا جو ضائع ہوگیا۔ اگر کالونی بن جاتی تو وہاں مسجدیں، مدرسے۔ شاپنگ سنٹر، کھیل کے میدان، سڑکیں، پارکس اور ہوٹل و ریستوران وغیرہ اچھا خاصا شہر آباد ہوجاتا اور احبابِ جماعت کے وقار اور شہرت میں اضافہ کا موجب ہوتا۔

حیدرآباد سے باہر مضافات میں جو نومبائعین کی کالونیاں آباد ہوئیں، اُن میں سیٹھ صاحب کی ذاتی دلچسپی کا سب سے زیادہ دخل تھا۔ حیدرآباد کے مبلغ جماعت مکرم مولانا حمید الدین صاحب شمس کے علاوہ چند اور لوگ بھی تھے، جنہوں نے اس کام میں دلچسپی لی، لیکن

حضرت سیٹھ صاحب وہ واحد شخص تھے جنہوں نے دامے، درہمے اور سخنے اُس میں اپنی دلچسپی ہمیشہ قائم رکھی۔ اپنے پیسے سے لوگوں کی شادیاں کروائیں، دکھ درد میں خرچ کیا، مکانات بنانے میں لوگوں کی مدد کی۔ مہینہ، ڈیڑھ مہینہ دورے کرتے، مولانا شمس صاحب کو اور بعض دوسرے احباب کو اپنی جیپ پر ساتھ لے جاتے اور معمول میں کبھی فرق نہ آنے دیتے۔

سیٹھ صاحب کی وفات پر نومبائعین نے برملا کہا کہ آج ہمارا باپ فوت ہو گیا ہے۔ لوگوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ موقعہ کی کوئی اچھی زمین نظر میں آئے تو بتانا تا کہ مسجد کیلئے خرید کی جا سکے۔ جوبلی ہال اور فلک نما کی مسجدیں کچھ دنوں بعد ناکافی گنجائش کی وجہ سے تنگ ہو جائیں گی۔ حضرت سیٹھ صاحب کا مزاج اِس شعر کا مصداق تھا۔ ؎

ہمارے شوق انوکھے ہیں، مزاج اپنا نرالا ہے
غموں کو دل میں رکھتے ہیں، خوشی خیرات کرتے ہیں

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت سیٹھ صاحب میں صبر اور برداشت کا مادہ معمول سے بڑھکر تھا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی اُن کے لئے مالی تنگی اور سخت آزمائش لے کر آئی۔ صبر وشکیب اور عزم وحوصلہ اُن کے دیرینہ دوست اور دائمی ساتھی تھے۔ دعاؤں میں مشغول ہو گئے۔ حیدرآباد کی امارت کے علاوہ وہ ساؤتھ انڈیا کے نیشنل امیر بھی تھے۔ ساتھ ہی صدر انجمن احمدیہ کے ممبر بھی۔ اُن ہی دنوں انہوں نے خواب دیکھا کہ اُن کی زندگی کا خاتمہ قریب ہے۔ بلکہ معین سال اور مہینہ بھی انہیں دکھایا گیا اور یہ رؤیا انہیں کئی بار دکھایا گیا۔ ۱۹۰۹ء اُن کی پیدائش کا سال تھا۔ اب وہ اسی سال کے ہو چکے تھے۔ ذیابیطس کا عارضہ بھی لاحقِ حال تھا۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع

رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں ۱۹۸۹ء میں ایک عریضہ بھجوایا اور اوپر کی تمام باتیں مخالفانہ حالات کی باتیں تحریر کیں۔ ساتھ ہی لکھا کہ مجھے نسیان نے بھی گھیرا ہوا ہے۔ اگر حضور مناسب فرمائیں تو مجھے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش فرمادیں۔ حضور نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے خواب کی تعبیر وہ نہیں ہے جو آپ کو دکھائی گئی ہے۔ آپ کی عمر اُس سے زیادہ ہوگی جو آپ نے سمجھی ہے۔ یہ بھی لکھا کہ کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ اس حالت میں فوت ہوں کہ آپ جماعت کے امیر ہوں؟ حضور کے خط سے آپ کو گونا تسلی ہوئی اور آپ نے سبکدوشی کے خیال کو ترک کر دیا۔ شخصیت کی تعمیر میں تصورات، اوہام، اور عزم وحوصلے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد گو کہ آپ کافی کمزور ہو چکے تھے۔ لیکن ایک نئے عزم اور ولولے نے آپ کے قدموں کو ثبات بخشا اور تادمِ وفات آپ مجوزہ خدماتِ سلسلہ پر مامور رہے۔ ۱۹۸۹ء میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کاروبار میں برکت دینی شروع کی سارے دلدّر دور ہو گئے۔ بچوں کے کاروبار کو بھی آپ نے سنبھالا دیا۔ وہ وقت بھی گزر گیا جسے آپ وقتِ آخری سمجھنے لگے تھے۔ اُن کے خواب کی تفہیم پر تین سال گزر گئے اور ۱۹۹۱ء کا آخری سرا قریب آ گیا۔ ۱۹۹۱ء ڈسمبر کے جلسہ سالانہ پر خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی متوقع آمد قریب آتی گئی۔ آپ نے قادیان اطلاع بھجوائی کہ مَیں ۲۳ ر ڈسمبر تک قادیان پہونچ جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کا منشاء کچھ اور تھا۔ ۲۳ ر ڈسمبر کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں آپ نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

جنازہ گھر لایا گیا۔ قادیان اطلاع بھجوائی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے قادیان میں آپ کا جنازہ غائب پڑھا۔ آپ کو اپنے مولد چنتہ کنٹہ میں امانتاً دفن کیا گیا اور یوں تاریخ کا ایک روشن باب بند ہوا۔ دوسرے سال آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا تابوت قادیان لے جایا گیا اور بہشتی مقبرہ میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

دنیا میں یوں تو جلوہ نما تھے ہزاروں لوگ

تیرا جدا تھا رنگ ، جہاں تک نظر گئی

دنیا میں روزانہ لاکھوں لوگ مرتے ہیں اور لاکھوں ہی روزانہ پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے کام رکتے نہیں، جاری رہتے ہیں، لیکن بعض لوگ دلوں کے اندر بستے ہیں، خون کی گردش بے قابو رہتی ہے، کچھ سوجھتا نہیں، لیکن بہرحال وقت مرہم ثابت ہوتا ہے اور پھر سب کچھ معمول پر آجاتا ہے۔ یہ بھی اللہ جل شانہ کا ایک گراں نما احسان اور عطا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آدمی جیتے جی مرجاتے اور دنیا کی رونقیں ملیامیٹ ہوجاتیں۔ حضرت سیٹھ صاحب کے انتقال کو آج تیئیس (۲۳) سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے، لیکن کاسۂ دل میں کھٹک آج بھی انہیں کھوجتی ہے۔ وہ نزاکتیں وہ رعنائیاں اور طبیعت کی وہ بوقلمونی اب نایاب ہے۔ بہت کچھ کیا جانا چاہئے تھا، لیکن کیا نہیں گیا۔ لفظوں اور حرفوں سے آشنائی متروک ہوئی جارہی ہے۔

❀❀❀

حیدرآباد۔ دکن۔ ۸/اپریل/۲۰۰۷

(12)

غلامی

غلامی کی تاریخ کم از کم دس ہزار سال پُرانی ہے۔اِس کی ابتداء جنگوں کے نتیجہ میں ہوئی۔ ابتداء میں یہ اُصول رہا کہ فاتح قوم، مفتوح قوم کے مَردوں کو توقتل کردیتی تھی، لیکن عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ جوں جوں غلامی کی رسم عام ہوئی، اِس کے فائدے عوام پر کُھلتے گئے۔ چنانچہ بعد میں غلام مَردوں کو قتل کردینے کا طریق ختم ہو گیا اور مفتوح قوم کے تمام افراد بشمولی مَرد و زن اور بچے، سب کے سب غلام بنالئے جانے لگے۔اُن سے کھیتی باڑی، کان کنی اور محنت کے ہمہ قِسم کے کام لئے جاتے۔گھریلو مشقت کے کاموں کے علاوہ، دستی صنعت کے کام بھی اُن کے سُپُرد تھے۔انسان کے اندر جو ایک وحشی چھپا ہوا ہے، جسے صرف مذہبی عمدہ تعلیم ہی لگام دے سکتی اور زِیر کرسکتی ہے، غلاموں کے خلاف اپنی وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہمیشہ آزاد رہا۔نت نئے اور گونا گوں سِتم اُن پر توڑے جاتے اور ہر قِسم کا کام اُن سے لیا جاتا تھا۔کھانے اور پہننے کے معاملے میں بہت ہی قلیل اُنہیں دیا جاتا، بلکہ نہ بھی دیا جاتا تو ظُلم نہیں سمجھا جاتا تھا۔تعدی اور حیوانیت کے یہ سلوک اپنے حقوق، برتری، رُعب اور دبدبے کے اظہار کے لئے لازم گردانے جاتے تھے۔غلاموں کی نسلیں بھی غلام ہی سمجھی جاتی تھیں۔ کِسی بھی قوم اور ملک کے پاس اُن کے دیوانی یا فوجداری قوانین میں غلاموں کے تحفظ یا کم از کم اُن کی عزتِ نفس کے متعلق کسی قِسم کی رعایت کا کوئی قانون نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مالک کے لئے غلاموں کا قتل بھی ہر مؤاخذہ سے مُبرّا تھا۔غلاموں کا یہ رواج اِس قدر منفعت

بخش ثابت ہوا کہ، بلا کسی قسم کی اُجرت ادا کرنے کے، ہر کام اُن سے لیا جانے لگا اور یوں غلاموں اور خدمت گاروں کی مانگ ایک بین الاقوامی رنگ اختیار کر گئی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ممالک میں غلاموں کی تعداد اصل باشندوں سے بڑھ گئی تھی، غلاموں کے مانگ اور نفع رسانی کے پیشِ نظر، بغیر جنگوں کے کسی بھی کمزور قوم یا قبیلے پر چھاپے مارے جاتے، اور مرد وزَن، بچے و بوڑھے سب غلام بنا لئے جاتے جیسی مرضی مالک کی ہوتی اُنہیں ویسا رکھتا اور جب جی چاہتا، بیچ بھی دیتا۔ بعض جگہوں پر اگر لوگ قرضوں کی ادائی نہ کر پاتے تو بدلے میں اُنہیں غلام بنا لیا جاتا۔ کوئی جرائم کا مرتکب ہوتا تو اُسے بھی غلام بنا لیتے۔ غلاموں کے بچوں کو اُن سے جدا کر کے فروخت کر دئے جانے کی دھمکی دے کر، ہرِ قسم کے سخت، شرمناک اور اُن کی طاقت سے بالا کام بھی اُن سے لئے جاتے اور اُنہیں کسی طرح بھی رحم کا مُستحق نہ سمجھا جاتا۔ ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح میں عِراق کے بعض علاقوں میں غلامی بڑے عُروج پر تھی۔ آشوری، بابلی، مصری، ایرانی و نیز خطہ شرق الاوسط کی سوسائٹیوں میں غلامی کا بڑا رواج تھا۔ چین اور ہندوستان کے باشندے، افریقہ کے کالے اور امریکہ کے ریڈ انڈین، غلامی کے لئے آسان شکار ثابت ہوتے تھے۔ جوں جوں تجارت اور صنعت نے ترقی کی، غلاموں کی مانگ بھی بڑھتی گئی اور یورپ و امریکہ غلاموں کی سب سے بڑی منڈی بن گئے۔ بعض علاقوں میں غلاموں کو شادی کی اجازت نہیں ملتی تھی، مبادا کہ اُن کی تعداد بڑھ کر کسی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو، کورٹ میں غلاموں کی شادی کی تصدیق کا کوئی قانون نہیں تھا اور غلاموں کو جائیداد بنانے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔

جب اِسلام کا ظہور ہوا، اُس وقت تک دنیا میں غلامی کا رواج نہایت قد آور ہو چکا تھا۔ اسلام گو کہ غلامی کے استیصال اور خاتمے کا دعوٰی لے کر اُٹھا تھا، لیکن جیسا کہ اِسلام

کے ہر حکم اور اُس حکم کے نفاذ کے پیچھے ایک منطق، ایک فلسفہ اور ایک گہری حکمت چھپی ہوئی ہے۔ اِس بدرسم کے مٹانے کے لئے بھی اِسلام نے ایک دُوررَس اور ناکامی سے مُعرّا منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ غلاموں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک اور اُن کے آزاد کئے جانے کی تحریک، ابتدائے اسلام ہی سے وجود میں آچکے تھے۔ سورۃ البلد آیت ۱۱۔۱۴ میں غلاموں کے آزاد کئے جانے کو ایک بڑی نیکی قرار دیا گیا تھا۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں غلاموں پر جو اثر اسلام کا پڑا، وہ اِسی تحریک کا نتیجہ تھا۔ سینکڑوں سالوں سے ظلم وستم کی چکی میں پیسے جانے والے غلام، ہمارے پیارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں ایک نجات دہندہ کو پاکر، مستقبل کے اُفق پر اپنے لئے روشنی کو پھیلتے محسوس کرنے لگے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں غلاموں کی تعداد مسلمان ہونے والے آزاد لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسلام کی سوسائٹی میں غلام ہرگز ذلیل اور کمتر نہیں سمجھے جاتے تھے۔ جوں جوں اسلامی تعلیمات نازل ہوتی گئیں، غلاموں کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی گئی اور سوائے اِس کے اور کوئی فرق باقی نہ رہ گیا کہ اگر ایک افسر ہوتا تھا تو دوسرا ماتحت، ساتھ ساتھ غلاموں کی آزادی کی تحریک بھی مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے نبی کی پُرزور تعلیم اور آپ کے پاک نمونہ کے ماتحت اِس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلمانوں میں آزاد مرد اور عورتوں نے جس قدر غلام آزاد کئے اور جس طرح غلاموں کی آزادی کی تحریک کو حصولِ ثواب اور خدا کی رضا کا ذریعہ سمجھا، اُس سے قبل یا اُس کے بعد، اسلام سے باہر کبھی بھی ایسا نہیں ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلاموں سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کیا یہاں تک آ کر رُک گئی تھی؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ یکلخت اور بہ یک جُنبشِ قلم غلامی کی رسم پر خطِ تنسیخ پھیر دیا گیا؟

آج مغربی سوسائٹی اِس بات پر بڑا فخر محسوس کرتی ہے کہ غلامی کے جوئے کو انسانوں

کی گردن سے اُتار پھینکنے کا سہرا اُن کے سر ہے۔اِس معاملے میں سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مغرب کے اِس جرأت آفریں فعل کا اُن کے مذہب عیسائیت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔غلامی کے خاتمہ کی تحریک خالصتاً، ایک تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی اور کچھ کچھ سیاسی تحریک تھی۔جس طرح آئے دن سیاسی تحریکیں اُبھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں، اُسی طرح یہ تحریک بھی اپنے پیچھے بعض مقاصد لئے اُٹھی، گو کہ اِس تحریک نے قانوناً غلامی کا خاتمہ کر کے چھوڑا، لیکن کیا حقیقت میں مغربی معاشرے نے دِل سے غلامی کے خاتمے کو قبول بھی کر لیا؟ کیا آج بھی مغرب میں ہوٹلوں، کلبوں کے باہر یہ بورڈ لکھے نظر نہیں آتے کہ یہاں کتوں اور کالوں کا داخلہ ممنوع ہے؟ کیا اِس قسم کے اعلانات کے خلاف آئے دن مقدمے بازیاں نہیں ہوتی ہیں؟ اور کیا آج گورے نے کالے کو دِل سے قبول کر لیا اور اپنے برابر کا درجہ دیدیا ہے؟ ہرگز نہیں! کالوں کے ساتھ ناروا اور ہتک آمیز سلوک آج بھی قدم قدم پر دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے۔اِس کی وجہ محض یہی ہے کہ دُوررَس نتائج کا اندازہ لگائے بغیر اور غلامی کے بے حد پرانے ناسور کے پیدا کردہ کیڑوں کو ہلاک کئے بغیر، دنیا میں اپنی ساکھ کو بہتر بنانے کے خیال سے، عُجلت میں فیصلہ کر لیا گیا اور غلامی کے خاتمے کا قانون نافذ کر دیا گیا، لیکن غلاموں کے اندر دَنایت، بزدلی، تعصب، منافقت، انتقام اور احساسِ کمتری کے جو بے شمار زخم تھے، انہوں نے تمدنی اور معاشرتی ڈھانچے کو لخت لخت کرنا شروع کر دیا۔وہ زخم آج بھی ہرے اور مرہم کے منتظر ہیں۔

اِسلام پہلا مذہب ہے جس نے غلامی کو انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ اور قبیح رسم کے طور پر محسوس کیا اور اُس کے ہزاروں سالوں پھیلے ہوئے اثرات کے خاتمے کے لئے ایک مکمل بے داغ منصوبہ بندی کی۔اگر اِسلام نے بھی ویسے ہی عُجلت میں اور بغیر منصوبہ بندی کے غلامی کے خاتمے کا اعلان کر دیا ہوتا تو اُس کے بدنتائج اور اثرات قوم اور سوسائٹی پر اُس

سے کہیں زیادہ مُہیب اور گہرے پڑتے جس قدر کہ گزشتہ امریکہ اور مغربی اقوام کے غلاموں کی آزادی کے قوانین کے باعث رونما ہوئے۔ آج سے چودہ صدیوں قبل کا زمانہ، حالیہ ڈیڑھ سو سالوں کے مقابلے میں نہایت مختلف اور فکر انگیز تھا۔ مغرب کے غلامی کے خاتمے کے قانون تک آتے آتے تو انسانیت نے بے شمار تدریجی ترقی کے مراحل طے کر لئے تھے اور بہرحال یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تہذیب وتمدن کے یہ مظاہر اسلام کی تعلیم ہی کے عطا کردہ اور رسولِ اسلام ہی کے اسوۂ وعَمل کے خوشہ چین تھے۔ مغربی حکومتوں کے آزادئی انسانیت اور ترقی آدمیت کے قوانین کے باوجود، آج تک مغرب کے فرد نے اور نہ ہی سوسائٹی نے دِل سے کالوں کو برابری کا درجہ دیا اور نہ ہی اُن سے نفرت اور اُن کے مقابلے میں اپنے برتری کے احساس سے آج تک آزاد ہوئے۔ گو کہ غلاموں کو قانوناً آزاد قرار دے دیا گیا، لیکن عموماً گورے اپنی طبیعتوں کے میلان اور نخوت وغرور نیز کالوں سے نفرت کی ترجیحات کے آج بھی غلام ہیں۔ گویا کہ دانشورانِ حکومت نے کالوں کو غلامی سے آزاد کیا لیکن فرد اور قوم کو ذہنی طور پر اپنے رنگ ونسل کے احساسِ برتری کا غلام رہنے دیا۔ کوئی قانون اور نہ ہی کوئی اخلاقی تعلیم گوروں کے ذہنوں سے خود عائد کردہ اِس غلامی کو کھرچ کر پھینک سکی۔ چنانچہ کالوں سے گوروں کی نفرت اور اپنے خول کے اندر اُن کا نسلی برتری کا احساس، اخلاقی پستی کے ایک سِرے پر انہیں جھکائے جا رہا ہے تو دوسرے کنارے پر کالے، ردِعمل کے طور پر تعصب، انتقام اور شدید احساسِ کمتری کے ماتحت، معاشرتی بہت سے جرائم سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کروا پا رہے ہیں۔

۱۹۰۷ء کا برٹش پارلیمنٹ کا قانون جس کے ذریعہ برٹش کالونیوں میں غلامی کو غیر قانونی قرار دیا گیا یا پھر ۱۹۰۸ء عیسوی کا امریکی کانگریس کا قانون کہ افریقہ سے غلاموں کی

امریکہ میں درآمد پر پابندی عائد کردی گئی، یہ سب سینکڑوں سالوں بعد کی باتیں ہیں۔ ۱۸۰۰ء کی ابتداء میں جب اسپین اور لاطینی امریکہ کی کالونیوں میں حصولِ آزادی کے لئے جنگیں شروع ہوئیں تو انہوں نے غلامی کے خلاف اور غلاموں کی مرحلہ وار آزادی کی تائید میں قانون پاس کئے۔ ۱۸۳۴ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان برٹش کالونیز میں غلامی کو ختم کر دیا گیا۔ فرانس نے اپنی کالونیوں میں سے غلاموں کی آزادی کا اعلان ۱۸۴۸ء میں کیا، لیکن برازیل، کیوبا اور شمالی امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں غلامی بدستور برقرار رہی۔ سول وار میں شمالی فوجوں نے غلاموں کو آزاد کرنے کی مُہم شروع کی۔ کیونکہ شمال والوں نے، غلاموں کی وجہ سے جنوب کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مضبوط معیشت کے پیشِ نظر، سیاست میں اُن کے درآنے کے ڈر سے پلاننگ شروع کردی تھی۔ قانون میں تیرہویں ترمیم نے ۱۸۶۵ء میں غلامی کو امریکہ سے ختم کر دیا۔ اسپین نے ۱۸۷۳ء میں، کیوبا نے ۱۸۸۶ء میں اور برازیل نے ۱۸۸۸ء میں غلامی کے رواج کو قانون کی لگام دی اور اُسے ممنوع قرار دیدیا۔

ساتویں صدی عیسوی سے جب اسلام منظرِ عام پر آیا، اُنیسویں صدی کے وسط تک تقریباً تیرہ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ جہالت اور کم علمی کا زمانہ تھا جبکہ اُنیسویں صدی ساری دنیا میں علم و آگہی کی وسعت اور پھیلاؤ کے لئے مشہور ہے۔ جب اسلام نے غلامی کے خلاف جدوجہد شروع کی، اُس وقت تک دنیا میں غلامی نہایت عام اور بے حد منفعت بخش کاروبار بن چکی تھی اور جس زمانے میں اسلام نے غلامی کے خلاف مکمل کنٹرول حاصل کرلیا، اُس کے بہت عرصے بعد مغربی دنیا نے غلامی کے لئے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی غلاموں کی آزادی کی تحریک اِس قدر سُرعت سے عام ہوئی اور اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونے نے ایسا

انقلاب آفریں اثر دکھایا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سعادت میں، ہزاروں غلام آزاد ہوکر بڑے بڑے مناصب پر فائز ہو چکے تھے۔ پھر وہ دینی مبلغ، فوجی جرنیل، جنگوں کے فاتح، معلم اخلاق، قانون دان بنے، غلامی سے آزادی کی تحریکیں شروع ہوئی ہیں، اُن سے بہت پہلے اسلام میں غلام آزاد کئے جا کر مختلف خطہ ہائے زمین پر آزاد حکمران، بادشاہ، شہنشاہ وغیرہ جلیل القدر حیثیتوں کے حامل رہ چکے تھے۔

اِسلام نے غلاموں کی تہذیبی، تمدنی اور اخلاقی بلندیوں تک پہنچانے کیلئے ابتداء میں نرم قانون اور اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ سے یہ تحریک کی کہ اُنہیں اپنے برابر درجہ دو۔ جو خود کھاؤ وہی اُنہیں کھلاؤ، جو خود پہنو، وہی اُنہیں بھی پہناؤ، مرد غلاموں سے عورتیں پردہ نہ کریں تاکہ اُن میں اپنائیت اور خلوص کا احساس پیدا ہو اور اُن کا احساسِ کمتری آپ اپنی موت مر جائے۔ غلام عورتیں یعنی لونڈیوں سے شادی اور نکاح کی تحریکیں مختلف عنوانات سے پیش کی گئیں۔ جرائم میں غلاموں کی سزا، آزاد کے مقابلے میں آدھی رکھی گئی، شادی کے بعد اُن کے صاحبِ اولاد ہوجانے پر، خواہ اُن کی اولاد زندہ رہی ہو یا فوت ہوگئی یا اسقاط کا سانحہ پیش آ گیا۔ لونڈیوں کو آزاد مسلمان عورتوں کا درجہ دیدیا گیا، (کشف الغمہ) یہ طریق اپنایا گیا کہ جوں جوں وہ اِسلامی سوسائٹی کے اُصولوں سے واقف اور اُس کے خوگر ہوتے جائیں، اُنہیں آزادی ملتی جائے، یہاں تک کہ سوسائٹی سے غلامی کا داغ بالکل ختم ہوجائے، مغرب کے قانون کی طرح اگر یکلخت اُن کی آزادی کا اعلان کر دیا جاتا تو لازم تھا کہ اپنی بے علمی اور بے ہنری کے باعث لاکھوں غلام، اپنے مالک کی پرورش سے آزاد ہوتے ہی، بیروزگار ہوجاتے، معیشت کا عدم توازن اور بوجھ اُن میں ہمہ قِسم کی اخلاقی برائیوں اور جرائم کو جنم دیتا اور وہ سوسائٹی کا ناسور بن جاتے۔ اِسلام کی عدل گُستری اور منطق پر مبنی حکمتِ عملی نے ابتداء ہی

سے سوسائٹی میں غلاموں کے لئے احترام اور مساوات کی فضا پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ دو واقعات مثال کے طور پر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

۱) ابونوازجوسوتی کپڑوں کے تاجر تھے، روایت کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت علیؓ اپنے غلام کے ساتھ اُن کی دوکان پر آئے اور دوسوتی قمیصیں خریدیں اور اپنے غلام سے کہا کہ اُن میں سے جو قمیص تمہیں پسند ہے، وہ تم لے لو، چنانچہ غلام نے پہلے ایک قمیص پسند کر لی۔ جو بچ گئی وہ حضرت علیؓ نے پہن لی۔ (اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۲۴)

۲) دوسرا واقعہ یوں ہے کہ عبادہ بن ولیدؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ابوالیسرؓ کو ملے۔ اُن کا ایک غلام بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ایک سادی اور ایک دھاری دار یمنی چادر اُن کے جسم پر تھی اور بالکل اُسی طرح کی ایک سادی اور دوسری دھاری دار یمنی چادر اُن کے غلام کے جسم پر تھی۔ ہم نے اُن سے کہا کہ چچا! آپ اپنے آدمی سے (غلام سے) کوئی ایک چادر بدل لیں تا کہ دونوں کے جسم پر ایک قسم کے جوڑے ہو جائیں۔ ابوالیسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، بھتیجے! میری اِن آنکھوں نے دیکھا ہے اور میرے کانوں نے سُنا ہے اور میرے دل نے اُسے اپنے اندر جگہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اپنے غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ پس مَیں پسند کرتا ہوں کہ اِس دنیا میں اپنے حال سے اپنے غلام کو برابر کا حصہ دوں تا کہ قیامت کے دن میرے ثواب میں کمی نہ ہو۔ (مسلم)

اِس روایت سے بھی صحابہؓ کی باریک بینی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر خلوصِ دل سے عمل پیرا ہونے کا سبق ملتا ہے۔

اِسلام نے غلاموں کے جو حقوق قائم کئے وہ صرف سفارشی رنگ نہیں رکھتے تھے بلکہ

شرعی اور سیاسی احکام تھے۔حکومتِ اِسلامی سختی کے ساتھ غلاموں کے حقوق کی نگران رہتی تھی۔ حضرت امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ طریق تھا کہ آپ ہر ہفتہ مدینہ کے مضافات کا دورہ کیا کرتے تھے۔اگر اُنہیں کوئی ایسا غلام نظر آتا جسے اُس کی طاقت سے زیادہ کام دیا گیا ہوتا تو آپ حُکماً اُس کام میں تخفیف کروادیا کرتے تھے۔

(مؤطاامام مالک۔باب الامر بالرفق للملوک)

ایک اُصول یہ بھی تھا کہ اگر کوئی مالک اپنے غلام کی شادی کروادے تو پھر مالک کو اختیار نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُس غلام کی شادی جب چاہے تڑوادے۔ یا فسخ کروادے۔آزاد مسلمان کی طرح صرف اُس غلام شوہر ہی کو حق حاصل ہوتا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔

(ابن ماجہ کتاب الطلاق)

ایک اُصول اور قانون یہ بھی تھا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے غلام کو مارے تو پھر وہ غلام آزاد ہے۔ (مسلم کتاب الایمان باب ۳۵)

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اے مسلمانو! تم یوں نہ کہا کرو کہ میرا غلام یا میری لونڈی بلکہ کہا کرو ''میرا آدمی یا میری عورت''اسی طرح غلاموں کو بھی ہدایت کی کہ تم اپنے مالک کو آقا یا مالک کہنے کے بجائے سیدنا یا بزرگ کہا کرو۔

(بخاری کتاب العتق)

اِس تعلیمِ اسلامی کا منشاء یہ تھا کہ غلاموں اور مالکوں کے طرزِ معاشرت، تمدن اور انسانیت کے عطا کردہ عزتِ نفس کے جذبہ کو مساویانہ درجہ پر لاکر غلاموں کو جلد تر اِس قابل

بنادیا جائے کہ وہ آزاد ہو کر ملک اور قوم کے لئے مفید وجود بن جائیں۔حضور اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کے ابتدائی دنوں میں ہی یہ کلام الٰہی نازل ہوا تھا کہ ’’مَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ o فَكُّ رَقَبَةٍ ‘‘(البلد: ۱۳۔۱۴) یعنی اے رسول! کیا تم جانتے ہو کہ دین کے راستے میں ایک بڑی گھاٹی والی چڑھائی کونسی ہے۔جس پر چڑھ کر انسان قربِ الٰہی کی بلندیوں کو چھولیتا ہے؟ اگر تم نہیں جانتے تو ہم بتاتے ہیں کہ وہ غلام کا آزاد کرنا ہے۔

سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۷۸ میں فرمایا کہ ’’کامل نیک شخص وہ ہے جو اللہ، روزِ آخرت، ملائکہ، (الٰہی) کتاب اور سب نبیوں پر ایمان لایا اور اُس (اللہ) کی محبت کی وجہ سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کو اور سوالیوں کو نیز غلاموں (کی آزادی) کے لئے (اپنا) مال دیا...‘‘

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی مسلمان غلام آزاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اُسے دوزخ سے مکمل نجات عطا کردے گا۔

(بخاری کتاب الایمان والنذور)

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک اعرابی حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے سیدھا جنت میں پہنچادے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم کوئی غلام آزاد کرو اور اگر اکیلے نہ کرسکو تو کسی کے ساتھ مل کر کرو۔

(بیہقی شعب الایمان بحوالہ مشکوۃ کتاب العتق)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کے پاس ایک لونڈی ہو اور وہ اچھی طرح اُس کی تعلیم و تربیت کرے اور پھر اُسے آزاد کر کے خود اُس سے شادی کرلے تو

ایسا شخص خدا کے حضور دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔

(بخاری کتاب النکاح)

اِسی طرح اِسلامی تعلیموں نے بعض غلطیوں اور گناہوں کا کفارہ غلام کا آزاد کرنا قرار دیا۔

''اگر کوئی شخص غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کر دے تو اُس کی سزا ایک غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اگر کوئی غلام نہ مل سکے تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔ آگے فرمایا کہ اگر مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہے اور تم سے برسرِ پیکار ہے اور مقتول مؤمن بھی تھا تو اُس کی سزا صرف یہ ہے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے۔ اور اگر غلام نہ مل سکے تو لگاتار دو ماہ کے روزے رکھے جائیں۔ پھر مزید فرمایا کہ اگر مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ اور پیمان ہے تو خواہ مقتول کافر ہی ہو، قاتل کی سزا یہ ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا بھی ادا کرے اور اگر غلام نہ پائے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے''۔ (النساء:۹۳)

''اگر کوئی شخص خدا کی قسم کھا کر پھر اُسے توڑ دے تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اپنی حیثیت کے مطابق کھانا کھلائے، یا دس مسکینوں کے لباس کا انتظام کرے، یا ایک غلام آزاد کرے اور اگر غلام نہ ملے تو تین دن کے روزے رکھے''۔ (مائدہ:۹۰)

جو لوگ اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد کر لیتے ہیں اور پھر بعض وجوہ کی بناء پر اُن سے رُجوع کرنا چاہتے ہیں تو اُن کا کفارہ بھی ایک غلام کا آزاد کرنا اور اگر غلام نہ مل سکے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا اور اگر روزوں کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا مقرر کیا۔

(المجادلۃ:۴،۵)

حضرت ابنِ عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اگر کسی شخص کے قبضہ میں ایسا غلام آجائے جو اُس کا رشتہ دار ہو تو وہ غلام خود بخود آزاد سمجھا جائے گا۔

(ابن ماجہ باب العتق)

حضرت اسماء بنتِ ابوبکرؓ روایت کرتی ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو حُکم دیا کرتے تھے کہ سورج گرہن کے موقعہ پر غلام آزاد کیا کریں۔

(بخاری کتاب العتق)

یہ جو مختلف آیاتِ قرآنیہ میں بار بار آتا ہے کہ غلام نہ مل سکے تو روزے رکھے جائیں وغیرہ تو یہ دراصل اُس یقین اور شرح صدر کا اظہار ہے کہ اسلامی تعلیم کے نتیجہ میں یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا کہ کوئی غلام باقی نہ رہے گا۔ سب آزاد ہو چکے ہوں گے۔ یہی غلاموں کے بارہ میں انتہائے مقصود تھا۔

یہ تمام حوالے جو قرآن و حدیث کے اوپر دئے گئے ہیں، موجودالوقت غلاموں کی آزادی کے لئے ایک سفارشی رنگ رکھتے تھے۔ دوسرا طریق جبری نوعیت کا تھا جس کے ذریعہ موجودہ غلامی کی رسم کو مٹانے اور غلاموں کو آزاد کرنے کیلئے سہولتی قانون بنادئے گئے۔

۱:۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو طمانچہ بھی مارے تو وہ غلام آزاد سمجھا جائے گا۔

(مسلم کتاب الایمان)

۲:۔ اگر کسی کے حصہ میں ایسا غلام آجائے جو اُس کا رشتہ دار ہو تو خود بخود وہ غلام آزاد سمجھا جائے گا۔

۳:۔ حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی غلام کی ملکیت میں دوسروں کے ساتھ حصہ دار ہو اور وہ اپنے غلام کو آزاد کر دے تو اُس

کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کے حصہ کی رقم بھی اپنی جیب سے ادا کر کے اُس غلام کی مکمل آزادی کے سامان کرے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو تب بھی شرکاء میں سے ایک شریک کے آزاد کئے جانے پر ہی وہ غلام آزاد متصور ہوگا۔ مگر اِس شرط کے ساتھ کہ وہ غلام اپنی کوشش سے دوسرے شرکاء کو رقم کی ادائیگی بسہولت کرتا رہے گا اور یوں پوری ادائیگی کے بعد کلی طور پر آزاد ہو جائے گا۔ اِس ادائیگی کے لئے ہر قسم کی سہولت کا اُس غلام کو دیا جانا ضروری ہے۔

(بخاری کتاب العتق)

۴:۔ اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کے ساتھ شادی کر لے اور اُسے آزاد نہ کرے، تب بھی جونہی وہ لونڈی صاحبِ اولاد ہو گی، آزاد متصور ہو گی۔ دوسری روایت میں ہے کہ اگر اولاد کی پیدائش اسقاطِ حمل کی صورت میں بھی ہو تو وہ عورت آزاد سمجھی جائے گی۔

(کشف الغمہ باب امہات الاولاد)

اوپر جو دو طریق سفارشی اور جبری بیان کئے گئے ہیں، اُن کے باوجود بہت سے غلام ایسے رہ جاتے تھے، جو اِن دونوں طریق سے بھی فائدہ نہ اُٹھا سکنے کے باعث غلام ہی رہ جاتے تھے۔ اِس لئے ضروری تھا کہ کوئی مؤثر، مستقل اور پختہ ایسا انتظام بھی کیا جاتا کہ موجود الوقت غلام زیادہ سے زیادہ اُس سے فائدہ اُٹھا سکتے اور آزادی کے حامل ہوتے جاتے۔ اُس کے لئے جو بنیادی اور مضبوط قانون شریعتِ اسلامیہ نے عطا کیا، وہ مکاتبت کا قانون ہے۔ اِس میں مالک اِس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر غلام اپنے حالات کے لحاظ سے (اور اُن حالات کا تعین حکومت اور عدالت کے ہاتھ میں ہوتا ہے، نہ کہ مالک کے ہاتھ میں) آزادی کی اہلیت کو پہنچ چکا ہو تو وہ اپنے مالک سے مناسب رقم پیدا کرنے کی شرط کے ساتھ آزاد کر دیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ محنت مزدوری یا تجارت کر کے وہ رقم ادا کرتا رہتا ہے۔ اور پوری رقم کی ادائیگی کے بعد

مکمل آزاد ہوجاتا ہے۔(النور: ۳۴)

مکاتبت کے اِس قانون میں مالک کو یہ بھی حکم ہے کہ غلام کی آزادی میں فراہمی کی رقم کی دشواریوں کی صورت میں مالک خود بھی اُس کی مدد کرے اور مناسب سہولتوں سے گریز نہ کرے اور مکاتبت کی رقم میں سے حسبِ ضرورت غلام کو بھی دے۔ غلام کی طرف سے مکاتبت کا مطالبہ ہونے پر مالک کے لئے ممکن نہیں کہ وہ حیلہ یا عُذر سے کام لے۔ یہ کام حکومت اور عدالت کے ذمہ ہوگا کہ اگر غلام آزادی کے قابل ہو چکا ہے تو ضرور اُسے مکاتبت کا حق دلایا جائے۔

یحیٰ بن کثیر سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو قرآن شریف میں آتا ہے کہ ''اگر تم غلاموں میں بھلائی پاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ تم مکاتبت سے انکار نہ کرو'' تو اِس میں بھلائی سے مراد پیشہ یا حرفت کی اہلیت ہے۔یعنی مقصود یہ ہے کہ ایسے غلاموں کے ساتھ مکاتبت ضروری ہے۔ جو کوئی کام، پیشہ یا ہنر جانتے ہوں یا جلد سیکھ کر مکاتبت کے مُطابق ادائیگی کر سکتے ہوں۔تاکہ وہ اس طریق سے جلد از جلد آزادی بھی حاصل کرلیں اور معاشرے پر بوجھ بھی نہ بنیں۔

(ابوداؤد بحوالہ تفسیر ابن کثیر زیرِ آیت مکاتبت)

غلاموں کی آزادی صرف افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اسلامی حکومت کے فرائض میں یہ داخل تھا کہ وہ قومی بیت المال میں سے ایک بڑا حصہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے صرف کرے۔سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔''زکوٰۃ کے اموال فقراء اور مساکین پر خرچ ہونے چاہئیں اور محکمہ زکوٰۃ کے عاملین پر، کمزور نومسلموں پر بھی اور غلاموں کو آزاد کرانے میں بھی۔ اِسی طرح مقروضوں کے قرض کی ادائیگی اور اشاعت دین کے لئے اور مسافروں کو آرام

پہنچانے کے لئے بھی۔ یہ ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ (سورۃ التوبہ:٦٠)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست اور دور اندیشی کا اِس سے اندازہ کیجئے کہ غلاموں کی آزادی کے اِس انتظام میں یہ بات بھی ملحوظ رکھی کہ آزاد ہونے کے بعد بھی آزاد شدہ غلام بالکل بے سہارا، بے یار ومددگار اور اکیلے نہ رہ جائیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا انتظام فرمایا کہ آزاد شدہ غلام ایک دوسرے کے ''مولیٰ'' یعنی دوست اور مددگار کہلاتے تھے تاکہ دونوں کے دلوں میں یہ خیال رہے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور وقتِ ضرورت ہمیں ایک دوسرے کے کام آنا ہے۔ اِسی کے مطابق اگر غلام بے وارث مرجاتا تو اُس کا ترکہ اُس کے سابق آقا کو جاتا تھا اور اگر وہ آقا اور مالک بے وارث رہ جاتا تو اُس کا ورثہ آزاد شدہ غلام کو ملتا تھا۔

(ترمذی ابواب الفرائض ابوداؤد وابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ)

مندرجہ بالا موروثیت کی بنیاد مالی اور اقتصادی خیالات پر مبنی نہیں تھی بلکہ اِس کا اصل منشاء مالک اور آزاد شدہ غلام کے درمیان باہمی تعلقات کو قائم رکھنا اور فروغ دینا تھا۔ اِسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد شدہ غلام اور آقا کے حقِ موروث کی خرید وفروخت اور اُس کے ہبہ وغیرہ سے منع فرمایا ہے۔

(بخاری کتاب العتق)

باستفادہ سیرت خاتم النبیین ؐ مؤلفہ حضرت مرزا بشیر احمدؓ ایم۔اے

(13)

اسلام میں لونڈی کی حیثیت اور مقام

اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات اور انسانیت کی تشنہ روحوں کیلئے آبِ بقا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اُس نے کامل رہنمائی نہ فرمائی ہو اور منطقی اعتبار سے روح کی سیرابی اور سرشاری کا پورا انتظام نہ کیا ہو۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی ہمہ پہلو سے رہبری میں کسی اور مذہب کے اسلام کا مقابلہ کرنے کا سوال تو کیا، بلکہ دیگر تمام مذاہب کے سارے مثبت پہلو اور سارے رہنما احکام کو الگ بھی کرلیا جائے، تب بھی مقابلتاً وہ سب اس ہمہ گیر، ہمہ پہلو اور ہمہ جہت مذہب کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ کوئی نری گپ اور زبانی دعوٰی نہیں بلکہ ثابت شدہ حقیقت ہے۔ ہمارا یہ مضمون کوئی تقابلی جائزے سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کا مقصد اسلام کے کسی شعبہ تعلیم کی برتری کا اظہار ہے۔ تاہم ایک ایسے موضوع کا سرسری مطالعہ ہمارا مطمحِ نظر ہے۔ جو متنازعہ بھی ہے اور اپنی حساسیت کے اعتبار سے گونا گوں دلچسپیوں اور اہمیت کا حامل بھی۔ ہمارے عوام تو عوام، خواص بھی، بلکہ ہمارے ستون یعنی علماء کا غالب اکثریتی طبقہ بھی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اسلام میں لونڈی کی حیثیت سراسر غلامانہ ہے اور اُسے بغیر نکاح کے گھر میں ڈالے رکھنا اور تمتع حاصل کرنا جائز ہے۔ انہی خیالات، تصریحات اور فتاوٰی کا نتیجہ تھا کہ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں بلکہ آج بھی اُمراء اور شاہوں کے حرم حسن وشباب کی مہک سے معمور ہیں۔ اِس موضوع پر وہ ایسے یقین اور اپنی دانست میں مدلل یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک عام تعلیم یافتہ آدمی جو فلسفہء اسلامیہ کا زیادہ درک نہیں رکھتا، فوراً چونکتا

ہے۔اور اسلام کے بارہ میں اُس کا یقین تزلزل کا شکار ہوجاتا ہے۔مخالفینِ اسلام تو ہماری اِس تعلیم کو مضحک اور عیاشانہ رجحانات کی پرزور سفارش کا نام دیتے ہی ہیں۔لیکن ہمارے علماء کے دلائل اور بے رحمانہ تائید، بجائے دفاع کے، اسلام کے اُجلے اور حسین چہرے کو داغدار بنانے میں مد ہوتی ہے۔اسلام کی ہر تعلیم اپنے فلسفیانہ اور منطقی دلائل کے ساتھ، انسانی ذہن کو مطمئن کرنے اور اِسلام کے حسن کو فروغ دینے کا موجب ہوتی ہے۔علماءِ کرام کی ذمہ داری تو یہ تھی کہ وہ ہر اُس وار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یا آپ کی تعلیم پر کیا جاتا، آگے بڑھکر اپنے سینے پر روکتے اور خاموش نہ بیٹھتے، جب تک کہ اپنے پیارے رسولؐ، اس کی تعلیم اور اس کے عمل کی خوبصورتی اور سحر انگیزی کو مخالف سے منوانہ لیتے۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر علماء کی بظاہر خشک اور سنگلاخ زندگی، رنگینوں اور گلیمر کا جواز ڈھونڈتی رہتی ہے۔جبکہ کبھی بعد الموت ملنے والی جنت، حورانِ بہشت، غلمانِ فردوس اور کنیز ولونڈی کے ذکر کا انہیں موقعہ ملتا ہے، ذہنی عیاشی کے ہوشربا افسانے تخلیق کرنے شروع کردیتے ہیں۔ یہ خیال انہیں چھوکر بھی نہیں گزرتا کہ مخالفینِ اسلام بلکہ خود مسلمانوں کے نیم پختہ اور کچے ذہن اِن باتوں کا کیا اثر قبول کریں گے۔اسلام تو اخلاقی اور روحانی آسودگی سے بھرپور زندگی کی طرف رہنمائی کرنے کا دعویدار ہے۔ اِس میں جنسی آسودگی کے غیر اخلاقی پہلوؤں جیسے تضاد کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ جنسی آسودگی گو کہ زندگی کی سرشاری اور اطمینانِ قلب کے حصول کا ذریعہ ہے۔لیکن حصول کے ذرائع اور اُن کے قواعد وضوابط بھی خود شارع اعظم نے برت کر دکھادئے اور دیگر تمام اُن راستوں کو جو بدی کی طرف لے جانے والے اور قلبی ناآسودگیوں پر مُنتج ہونے والے ہیں، بند کردیا ہے۔اُن بند راہوں میں رخنے تلاش کرنا اور جواز کی گنجائش نکال کر اِسلام کو بدنام کرنے کی غیر شعوری کوشش کرنا اپنے خنجر سے

آپ ہی خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔

کنیز یا لونڈی قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اُس عورت کو کہتے ہیں جو مذہبی جنگ میں، عین میدانِ جنگ میں قید اور گرفتار ہوکر مسلمانوں کے ہاتھ آئی ہو۔ ''مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ'' (سورۃ الانفال: ۶۸) (کسی نبی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی پُرامن قوم میں سے مرد جنگی قیدی یا عورت جنگی قیدی پکڑ لائے۔ جب تک کہ اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان خونریز جنگ نہ ہو لے) جس قوم سے جنگ ہو رہی ہو اُس کے افراد کو بجائے میدانِ جنگ کے کسی اور جگہ سے بعد میں پکڑنا بھی جائز نہیں۔ اسلام غلامی کی اجازت نہیں دیتا۔ مذہبی جنگی قیدیوں میں ہاتھ آنے والے مردوں اور عورتوں کو یہ جو غلام اور لونڈی کہا گیا ہے، اس سے مراد وہ غلامی نہیں ہے جو عام معنوں میں مستعمل اور مروج ہے۔ اُن کو غلام اور لونڈی صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ جب تک فدیہ ادا کر کے یا دوسری سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر آزاد نہیں ہوجاتے، اپنے آقا اور مالک کے ماتحت ہیں۔ وہاں بھی یہ شرط رکھی کہ جو تم کھاؤ وہی انہیں بھی کھلاؤ۔ جو تم پہنو وہی انہیں بھی پہناؤ۔ ایسا کوئی کام ان سے نہ لو جو اُن کی قوت اور برداشت سے باہر ہو۔ جب کوئی کام ان کے سپرد کرو تو خود بھی مل کر وہ کام کر لیا کرو (تا کہ غلام کو ندامت نہ ہو) حضرت معرور بن سویدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذرؓ کو ایک خوبصورت جوڑا پہنے ہوئے دیکھا۔ ان کے غلام نے بھی ایسا ہی جوڑا پہن رکھا تھا۔ میں نے تعجّب سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہوں نے اپنے غلام کو بُرا بھلا کہا اور اس کی ماں کے عیب بیان کر کے اسے شرم دلائی۔ حضوؐر کو جب اس کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔ تم میں جہالت کی رگ ابھی باقی ہے۔ یعنی یہ جہالت کی حرکت ہے۔ یہ غلام تمہارے بھائی ہیں وہ تمہارے خادم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

انہیں تمہاری نگرانی میں دیا۔جس شخص کے ماتحت اس کا بھائی ہو وہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے۔وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے۔اپنے غلاموں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔اگر تم کوئی مشکل کام ان کے سپرد کرو تو اس کام میں خود بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ اور ان کی مدد کرو۔

(مسلم کتاب الایمان باب اطعام الملوك مما یأکل ولباسه مما یلبس)

غلام یا لونڈی کو مستقل ماتحت بنائے رکھنے کی بھی اجازت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ ''فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً ''(محمد:۵)(۱)(یعنی بعد میں انہیں احسان کے طور پر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر) یہ فدیہ قاضی مقرر کرتا ہے۔(۲) اگر وہ فدیہ ادا کرنے کے قابل نہ ہوں تو ان کی قوم فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لے جائے۔(جیسا کہ جنگِ بدر کے قیدیوں کے ساتھ ہوا) اگر یہ ممکن نہ ہو۔(۳) اسلامی حکومت بطورِ احسان انہیں آزاد کر دے۔یا پھر (۴) زکوٰۃ فنڈ سے ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں آزاد کر دیا جائے۔(سورۃ التوبہ:ع۸)(۵) قیدی کو مکاتبت کا حق دیا جائے۔''وَالَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِمَّا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا''(النور:۳۴) یعنی اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتبت کا مطالبہ کریں، اگر تم اُن میں بھلائی دیکھو تو مکاتبت کر لو۔یہ جو فرمایا کہ ''اگر تم ان میں بھلائی دیکھو''اِس سے مراد یہ ہے کہ وہ آوارہ اور مال لٹانے والے نہ ہوں۔مالک کی مرضی اور اختیارِ کلی پر نہیں چھوڑا گیا۔اگر مالک راضی نہ ہو تو مکاتبت چاہنے والے غلام یا لونڈی قاضی سے رجوع کر سکتے ہیں۔اور آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔مکاتبت کا مفہوم یہ ہے کہ قیدی اپنے مالک سے کہے کہ مجھے آزاد کر دو تو مَیں اتنی مدت میں محنت مزدوری یا تجارت کر کے فدیہ ادا کر دوں گا۔اور اس وقت تک اپنے کاروبار میں آزاد سمجھا جاؤں گا جب تک کہ فدیہ ادا نہیں کر دیتا۔اسلامی ملک کے اندر رہنے اور باہر نہ جانے کا وہ پابند رہے گا۔

پھر آگے فرماتا ہے۔ ''وَاٰتُوْهُمْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰكُمْ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَیٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا'' (النور: ۳۴) یعنی اور اگر اُن کے پاس پورا مال نہ ہوتو) جو اللہ نے تم کو مال دیا ہے اُس میں سے کچھ مال دے کر (ان کی آزادی کو ممکن بنا) دو۔ اور تم اپنی لونڈی کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ نیک رہنا چاہتی ہوں (یعنی اگر لونڈیوں کی خواہش ہو کہ وہ نکاح کر لیں تو اس سے انہیں روکو نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ یقیناً فسق و فجور ہوگا) ایک جگہ فرمایا۔ ''وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ'' (النور: ۳۳) یعنی اور اپنے میں سے جو بیوائیں ہیں جو اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نیک ہوں، ان کی شادیاں کر دیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ اِن تمام سہولتوں سے بھی کوئی لونڈی فائدہ اٹھانا نہ چاہے، وہ اپنے گھر یا ملک کو واپس جانا کسی وجہ سے اپنے لئے خطرناک سمجھتی ہے۔ اگر اس کی قوم، اس کی حکومت، یا اس کے رشتہ دار اُسے چھڑانے نہ آئیں، اور وہ مکاتبت پر بھی راضی نہ ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ عورت مسلمان گھرانے کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ آخری موقعہ اُسے شادی کا پیغام دیا جاتا ہے۔ خواہ مالک خود اس سے شادی کرنا چاہے یا کہیں اور اس کی شادی کا بندوبست کر دے۔ اگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوتی ہے تو پھر زبردستی اس کی شادی کر دینے یا زبردستی اس سے شادی کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ دوسری صورت میں وہ معاشرے میں بدکاری اور گند پھیلانے کا موجب بن سکتی ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تین عورتیں ایسی آئی ہیں۔ جن کا حصول جنگوں کے نتیجہ میں تھا۔ (۱) حضرت جویریہؓ یہ قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں اور ایک غزوہ میں گرفتار ہوئی تھیں۔ (۲) حضرت صفیہؓ۔ یہ خیبر کے یہودی رئیس حیّ بن اخطب کی صاحبزادی تھیں اور جنگِ خیبر میں قید ہوئی تھیں۔ (۳)

حضرت ریحانہؓ بنت زید۔(زادالمعاد) ان کا تعلق بنوقریظہ سے تھا اور یہ جنگ احزاب میں لے آئی تھیں۔اُن تینوں کا قرعہ فال آخرکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نکلا تھا۔حضورؐ نے ان تینوں سے نکاح کیا تھا۔اگر یہ کہا جائے کہ انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا تو یہی سنتِ رسولؐ کسی بھی مسلمان کے لئے لازمِ تقلید ہے۔یہاں اصل نکتہ زیرِ بحث 'نکاح' ہے۔اِن تینوں کا نکاح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے دوسرے مسلمانوں کے لئے لونڈی بغیر نکاح کے جائز ہے؟اس موقعہ پر سب سے زیادہ قوی ثبوت کے طور پر سورۃ المؤمنون کی ساتویں آیت کو پیش کیا جاتا ہے کہ وہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ مؤمن اپنے فروج کی حفاظت کیا کرتے ہیں یعنی اپنی شرم گاہوں کو چھپاتے ہیں اور نہیں ظاہر کرتے۔''سوائے اپنی بیویوں پر یا اُن پر جوان کی لونڈیاں ہیں'' یعنی یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یہاں منکوحہ بیویوں سے لونڈیوں کو الگ رکھا گیا ہے۔اگر لونڈی سے نکاح ضروری اور لازم ہوتا تو نکاح کے بعد وہ بھی شرعی بیوی بن جاتی ہے۔پھر اس کا ذکر الگ کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔وہ سلسلہ آیات یہ ہے۔''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَo الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَo .... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَo اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَo (المؤمنون: آیت ۲ تا ۷) یعنی اور وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور نہیں ظاہر کرتے سوائے اپنی بیویوں یا لونڈیوں کے کسی اور پر۔پس ایسے لوگوں کو کوئی ملامت نہیں کی جائے گی۔یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حکمت سے پُر کلام ہے۔یہاں پر بیویوں اور لونڈیوں کا ذکر علیحدہ کرنا ہی حکمت تھی۔وہ یہ کہ بیوی اپنے نکاح میں اپنی رضا میں آزاد ہوتی ہے۔اور لونڈی آزاد نہیں ہوتی۔اُس سے نکاح زبردستی کیا جاتا ہے تا کہ معاشرہ گندگی سے محفوظ رہے۔نکاح کے باوجود اس کی حیثیت لونڈی

کی ہی رہتی ہے۔ اور وہ آزاد بیوی کے حقوق کا مقابلہ نہیں کر سکتی جب تک کہ صاحبِ اولاد نہیں ہو جاتی اولاد ہونے کے بعد پھر وہ آزاد ہو جاتی ہے اور اُن تمام حقوق کی مساوی مالک بن جاتی ہے جو آزاد بیوی کو حاصل ہوتے ہیں۔

غور فرمایئے!

کہ اسلام نے غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کے لئے کس قدر زور دیا ہے۔ تمام ممکنہ سہولتیں انہیں دی گئی ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھا کر وہ آزادی کی نعمت حاصل کر سکتے ہیں۔ آزاد بیوی اور مملوک بیوی (لونڈی) میں یہی فرق ہے کہ آزاد بیوی شادی میں اپنی پسند اور ناپسند کا حق محفوظ رکھتی ہے، جبکہ مملوکہ پابند ہوتی ہے، اسے دی گئی تمام ممکنہ سہولتوں سے فائدہ نہ اٹھا کر اور انہیں ٹھکرا کر وہ اپنا حق کھو بیٹھتی ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ زبردستی شادی کر لی جاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ صاحبِ اولاد بن جاتی ہے، آزاد کہلاتی ہے، اس کے بیچنے کا تو اسلام میں تصور ہی نہیں ہے۔ غلامی یا تجارتِ مملوک تو اسلام میں سخت ناپسندیدہ اور ناجائز ہے۔

(محلّٰی ابن حزم جلد ۹ صفحہ ۲۱۷)

غلاموں اور قیدی عورتوں کی آزادی کے لئے اس قدر سہولتوں کا دیا جانا اور معاشرت میں ان کو برابری کا درجہ دئے جانے کا تاکیدی حکم یہی ثابت کرتا ہے کہ انہیں قیدی بنانا کسی خاص مجبوری کے ماتحت ہے۔ ورنہ اِسلام اس کی بھی اجازت نہ دیتا کہ جنگوں میں قیدی بنائے جائیں۔ وہ مجبوری یہی تھی کہ اُس زمانے میں دونوں طرف تنخواہ دار فوجوں کا رواج نہیں تھا۔ لوگ اپنے جیب سے خرچ کر کے جنگوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ چونکہ ہر آدمی رضا کارانہ جنگ میں حصہ لیتا تھا اور اپنا خرچ خود اٹھاتا تھا، اس لئے قیدیوں کو بھی رضا کاروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا کہ وہ فدیہ کی شکل میں ان سے اپنا جنگی خرچ وصول کر سکے۔ آج کل جنگوں کی

نوعیت بدل چکی ہے۔ اس لئے تاوانِ جنگ بھی بجائے افراد کے حکومت اور قوم سے اجتماعی رنگ میں وصول کیا جاتا ہے۔

ان امور پر غور کرنے سے چند باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ وہ یہ کہ بہت سے قیدی ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آزاد ہو جاتے تھے اور معدودے چند ہی رہ جاتے تھے جو دانستہ فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے اور اسلامی حدود میں اپنے لئے زیادہ تحفظ محسوس کرتے تھے۔ قیدی عورتوں پر ظاہر ہے کہ کنواری، شادی شدہ، بچوں والی سبھی قسم کی عورتیں شامل ہوتی تھیں، ایسی صورت میں اگر زبردستی اور جبراً اُن سے جنسی روابط کی استواری کو جائز قرار دیدیا جاتا تو کیا وہ اُسے اپنے لئے تحفظ کا قائم مقام قرار دے سکتی تھیں؟ ہرگز نہیں۔ آگے ان آیات میں لونڈیوں کے متعلق کسی قدر واضح رنگ میں نکاح کی ہدایات موجود ہیں۔

''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ..... (النساء: ۲۴) وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۔ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۔ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ ۔ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۔ (النساء: ۲۵) یعنی تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں تم پر حرام ہیں۔...... اور پہلے سے منکوحہ عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) استثناء ان عورتوں کے جو تمہاری ملکیت میں آجائیں۔ اللہ نے تم پر یہ فرض کیا ہے۔ اور جو اِن اوپر کی بیان کردہ عورتوں) کے سوا ہوں وہ تمہارے لئے بعد نکاح حلال ہیں۔ (یعنی اس طرح سے کہ) تم اپنے مالوں کے ذریعہ سے (انہیں) طلب کرو بشرطیکہ تم شادی کرنے والے ہو، زنا کرنے والے نہ ہو۔ (یہ مطلب نہیں کہ مؤمن زنا کرے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہم مؤمن سے یہی امید رکھتے ہیں کہ وہ شادی کے وقت تقوٰی کی تمام راہوں کو پیشِ نظر رکھے گا اور زنا کی صورت کے قریب نہ جائے گا) اِن آیات کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ عورتیں جن سے نکاح جائز ہے وہ تو نکاح کے بعد جائز ہو گئیں اور اوپر سورۃ النساء کے رکوع ۴ میں ابتداً جو لسٹ (فہرست) دی گئی ہے یعنی مائیں، بیٹیاں اور بہنیں وغیرہ، وہ نکاح کے بعد بھی جائز نہیں ہو سکتیں، ہاں وہ جو تمہاری ملکیت میں ہیں (یعنی تمہاری لونڈیاں) خواہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہوں، نکاح کے بعد جائز ہو سکتی ہیں۔ جبکہ غیر مملوکہ عورتیں اگر وہ شادی شدہ ہوں تو نکاح کے بعد بھی تمہارے لئے جائز نہیں ہو سکتیں۔☆

☆ لونڈیوں سے نکاح کرنے یا بغیر نکاح کے تعلقات زوجیت قائم کرنے کے متعلق کتاب ھٰذا کے صفحہ ۱۶۰ تا ۱۷۳ میں جو وضاحت اور نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ لونڈی بغیر نکاح جائز نہیں ہو سکتی۔ یہ نصّ قرآنی اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ سے متضاد نظر آتا ہے۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔اے رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لکھا ہے کہ

''یہ سوال کہ آیا لونڈیوں کے ساتھ باقاعدہ رسمی نکاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ اوّل جبکہ کسی لونڈی اور غلام کے آپس کے رشتہ کا سوال ہو۔ دوم جبکہ کسی لونڈی اور ایسے مرد کے رشتہ کا سوال ہو جو اس کا مالک اور آقا نہیں ہے۔ سوم جبکہ کسی غلام اور آزاد عورت سے رشتہ کا سوال ہو۔ چہارم جبکہ کسی لونڈی اور اس کے اپنے آقا و مالک کے رشتہ کا سوال ہو۔ ان چاروں امکانی صورتوں میں سے پہلی تین صورتوں میں مسلمہ طور پر رسمی نکاح ضروری سمجھا گیا ہے۔ اور اس کے بغیر رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن چوتھی صورت میں اکثر علماء آقا اور لونڈی کے رشتہ کے معاملے میں رسمی نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ آقا کو لونڈی پر حق ملکیت حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے قانونی رنگ میں یہی حق نکاح کا قائم مقام سمجھا جانا چاہئے اور کسی الگ رسمی نکاح کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اخلاقی اور تمدنی اور نسلی حفاظت جو رسمی نکاح میں ملحوظ ہے وہ اس رشتہ میں بھی جو حق ملکیت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔'' (سیرت خاتم النبیینؐ: صفحہ ۴۱۹)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترجمۃ القرآن کلاس میں سورۃ نساء کی آیت ۲۵ میں اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

(جاری ہے)

''وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ‌ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ‌ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ‌ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ۔ (النساء:۲۶) یعنی اور جو (کوئی) تم میں سے آزاد مؤمن عورتوں سے شادی کرنے کی بالکل استطاعت نہ رکھتا ہو (وہ) تمہاری مملوکہ (عورتوں) یعنی تمہاری مؤمن لونڈیوں میں سے کسی سے نکاح کرلے۔اور اللہ تمہارے ایمان کوسب سے زیادہ جانتا ہے۔تم ایک دوسرے سے (تعلق رکھتے) ہو پس ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو اور ان کے مہر جبکہ وہ پاکباز ہوں نہ کہ زنا کار اور مخفی دوست بنانے والیاں، دستور کے مطابق ادا کرو (مہر ادا کرنے کے تعلق سے جو حکم ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکباز ہوں تو مہر دو، ورنہ، نہ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی ہی لونڈیوں سے نکاح کرو جن

(بقیہ حاشیہ) جنگی قیدیوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ عورتیں بھی پکڑی جاتی تھیں جنہیں لونڈیاں کہا جاتا تھا۔مسلمان منکوحہ عورتوں کے ساتھ جو کفار کے قبضہ میں چلی جاتی تھیں، جو سلوک کفار کی طرف سے ہوا کرتا تھا، اسی طرح کا سلوک مسلمان بھی کفار لونڈیوں کے ساتھ کرنے کے مجاز تھے۔کفار کے پاس تو کوئی ضابطہ اخلاق اور شریعت نہ تھا۔لیکن مسلمانوں کو خداتعالیٰ نے یہ تعلیم دی کہ آزاد معاشرہ سے آنے والی یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ کو خراب کرنے کے موجب نہ بنیں۔اس لئے قومی طور پر یہ لونڈیاں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔وہ کہاں سے پتہ کرتے کہ یہ کن کفار کی بیویاں ہیں۔پھر یہ کہ ان سے طلاق دلوائی جائے پھر نکاح کیا جائے۔وغیرہ۔

یہ سب باتیں ناقابل عمل تھیں اس لئے جس مسلمان کی ملکیت میں یہ لونڈی دی جاتی، اس کیلئے خواہ وہ پہلے سے ہی منکوحہ کیوں نہ ہو بغیر کسی طلاق یا نئے نکاح کے جائز کر دی گئی۔یہ صرف کفار جنگی لونڈیوں کیلئے حکم ہے۔اور استثنائی حالات کی ہی باتیں ہیں۔ (ناشر)

کی پاکدامنی تم پر ثابت ہو۔ پھر ان کے مہر، آزاد عورتوں کی طرح ادا کرو) ہر جگہ نکاح کا ذکر ہے۔ بغیر نکاح حلال ہونے کا کہیں ذکر نہیں۔ اسی سورۃ النساء: آیت ۴ میں فرماتا ہے۔

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ۝ ۔ (النساء: آیت ۴) یعنی اور اگر تمہیں (یہ) خوف ہو کہ تم یتیموں (کے بارے) میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو (صورت) تمہیں پسند ہو (کرلو، یعنی غیر یتیم) عورتوں میں سے دو دو (سے) اور تین تین (سے) اور چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمہیں (یہ) خوف ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی (عورت) سے یا ان (لونڈیوں) سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں نکاح کرلو (یہ طریق اس بات کے) بہت قریب ہے کہ تم ظالم نہ ہو جاؤ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یتیم عورتوں سے ایک سے زیادہ شادیاں کرنی اچھی نہیں کیونکہ بے انصافی کا ڈر ہے۔ ہاں ان کے سوا دوسری عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار سے نکاح کر سکتے ہو کیونکہ اُن کے ولی اُن کے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ اِس طریق پر عمل کر کے تم ظلم اور گناہ کے خطرہ سے بہت حد تک محفوظ ہو جاؤ گے۔

یہ موضوع جسے ہم نے چھیڑا ہے، نہایت اہم ہے اور اس پر دوٹوک بات ہونی ضروری ہے۔ یہ کوئی ایسا گنجلک موضوع نہیں، ہاں! صدیوں کے ایک عقیدے نے اسے بظاہر پیچیدہ اور لاینحل بنا دیا ہے۔ صاحبِ علم اور صاحبِ بصیرت احباب کو چاہئے کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اگر اس عام عقیدے کو روا رکھا جائے کہ لونڈی کو بغیر نکاح کے گھر میں ڈالے رکھنا جائز اور حلال ہے۔ تو مُتعہ کی حلّت اس سے کہیں اولیٰ درجہ پر ثابت ہو جاتی ہے۔ وہاں کم از کم دونوں فریق اپنے فعل پر ایک دوسرے سے راضی ہوتے ہیں۔ جبکہ یہاں معاملہ یکطرفہ جبر کا

ہے۔اسی یکطرفہ جبر کا نام دراصل غلامی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام، غلامی کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔کجا یہ الزام کہ اسلام نے غلامی کو فروغ دیا ہے۔رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تو بہت جلد حضرت خدیجہؓ نے محسوس کرلیا کہ آپ کے شوہر کا حساس دل یہ برداشت نہیں کر سکے گا کہ بیوی تو مالدار رہے اور شوہر اس کا محتاج ہو۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ اپنا تمام مال اور اپنے تمام غلام آپؐ کی خدمت میں پیش کردینا چاہتی ہیں۔حضورؐ کے تصدیق چاہنے پر جب انہوں نے دوبارہ اپنی اس تجویز کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا میرا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ مَیں تمام غلاموں کو آزاد کروں گا۔ چنانچہ آپؐ نے تمام غلام آزاد کردئے۔اور مال کا بیشتر حصہ غرباء اور مساکین میں تقسیم فرمادیا۔یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آپ خلعتِ نبوت سے ابھی سرفراز نہیں ہوئے تھے۔کفار اور مسلمانوں کے مابین ہونے والی پہلی جنگ، جنگِ بدر میں گرفتار ہوکر آنے والے قیدیوں کو فدیہ کی ادائیگی کے طور پر یہ سہولت بھی دی گئی کہ تعلیم یافتہ قیدی، ناخواندہ مسلمانوں کو پڑھنے لکھنے کے لائق بنا کر اپنا اپنا پروانہء آزادی حاصل کرلیں۔یہ جو عام طور پر ہمارے تمدن کا حصہ رہا ہے کہ کمزور ہمسایہ اقوام میں سے اٹھائی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے کھلے عام فروخت کے لئے نیلام بازار سجائے جاتے تھے۔دولت مندی اور سرمایہ دار، خصوصاً سردارانِ قوم اور شاہانِ حکومت اُن خریداریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اسلام کی تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔اب گو کہ زمانہ بدل چکا ہے، انسانی آزادی اور حقوقِ آزادی کے لئے قوانین، کمیٹیاں اور انجمنیں بن چکی ہیں۔تاہم دنیا میں قحبہ گری اب بھی ہوتی ہے۔علمی ترقی کے باوصف، انسانی خود غرضی آج بھی جوان ہے۔اور سرمایہ داری کی استحصالی قوتیں پہلے کی نسبت بہت زیادہ قدآور ہوچکی ہیں۔جو درجہ اور جو حیثیت غلاموں اور لونڈیوں کو اسلام نے دیا ہے۔اُس تعلیم کا عُشرِ

عشیر بھی کسی اور مذہب کی تعلیمات میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس مختصر سے مضمون میں دلیل اور بحث کی اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ حقیقتاً یہ موضوع ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔ انسان دراصل خوف اور لالچ سے ہی میانہ رو اور دائرہ ضبط و اثر میں رہتا ہے جونہی اقتدار اور دولت کی قوت حاصل ہوجاتی ہے، خوف اور لالچ دونوں بے مایہ اور بے دست و پا ہوجاتے ہیں اور آفت کا یہ پرکالہ اخلاقی اور ایمانی حدود کو پھلانگنے کے وہ وہ ڈھنگ اور طور ایجاد کرتا ہے کہ ابلیس بھی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتا ہے۔ گزشتہ صدیوں میں اسلام کے نام پر اس عنوان کے تحت جو کھیل سامنے آئے ہیں وہ سب انسانی فطرت کی اسی بوقلمونی اور حدضبط اور وضع احتیاط سے فرار کا شاخسانہ ہیں۔ اقتدار اور دولت کے ملنے کے بعد ہی معیار کی اصل جانچ اور پرکھ ہوتی ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ اور خلفاء رضوان اللہ علیہم کی زندگیوں میں باوجود اقتدار اور قوت و دولت کے حصول کے، نظم وضبط، استغناء، اپنے پیدا کرنے والے پر پختہ ایمان، اس کی بے ریا محبت، اس کا حقیقی خوف، اِک حرفِ یقین اور موت کے خوف سے بے نیازی کے جو طور انسانی آنکھ نے دیکھے وہی اسلام کی اصل تصویر ہیں اور اُسی سے اُن کے سر آج بھی سرافراز ہیں۔

اِسلام نے زنا کو نہایت ناپسندیدہ اور ناقابلِ برداشت گناہ قرار دیا ہے۔ سخت تعزیریں مقرر کی ہیں۔ اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھنا کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح ضروری نہیں اور وہ ویسے ہی حلال ہیں۔ زنا کے لئے ایک جواز پیدا کرنا ہے۔ اِسلام نے جہاں زنا کو ناپسندیدہ اور حرام قرار دیا ہے وہیں زانیہ کے اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد کے حقوق کو قائم نہ کرکے، ان کے مستقبل کو ایک گھور اندھیرے کی طرح ڈراؤنا بنا دیا ہے اور اس فعل کے ارتکاب کی جسارت کو ہمت شکن، اگر لونڈیوں اور کنیزوں کے ساتھ نکاح کے بغیر تعلقات قائم کرنا اور اُن

سے تمتع حاصل کرنا جائز ہے تو پھر اُن کے اور ان کی اولاد کے لئے شرع نے ورثہ کے کیا حقوق بتائے ہیں؟ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں۔ یہ سکوت خود علامت ہے اس فعل کے ناجائز اور حرام ہونے کی۔ دراصل دنیوی علوم کی ترقی نے آہستہ آہستہ افعالِ شنیعہ کو اس قدر سائنٹفک بنادیا ہے کہ وہ اب فن کا درجہ حاصل کرتے جارہے ہیں۔ قتل، انتقام، اپنے دشمنوں یا ناپسندیدہ افراد کو سازشوں اور ہتھکنڈوں کے ذریعہ ساری قوم اور ملک کے لئے دشمن اور ناپسندیدہ ثابت کردکھانا اور بلیک میلنگ وغیرہ اُمور اب فن بن چکے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغربی اقوام کی طرف سے انسانیت کو یہ سب چیزیں بطورِ تحفہ عطا ہوئی ہیں۔ اُن کی ترویج اور ترقی کے لئے باضابطہ اِدارے قائم کئے جاتے ہیں۔ لیکن غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی برے کام کو فن کی معراج بنادینا فاسق مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کا جو دور رونما ہوا، اس نے آگے چل کر دنیا اور اس کے وسائل پر جوں جوں گرفت مضبوط کی، وہیں اخلاق اور سیرت کی باگ پر اُن کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔ لونڈیوں اور کنیزوں کی تجارت کو عام کرکے زناکاری اور اس سے متعلقہ شعبوں میں نِت نئے تجربے کئے گئے۔ یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ اسلام کے ساتھ یہ بھیانک مذاق کب تک روا رہے گا؟ علماء یا یوں کہہ لیجئے کہ نام نہاد اور مادّہ پرست علماء کے ایمان کب تک بِکتے رہیں گے۔ اور وہ ہاتھ کب رونما ہوگا جس کا ایک کاری وار زنا کے اِس تناور درخت کو دونیم کردے گا؟۔

(14)

اسلام میں عورت کا مقام

عورت انسانیت کا ایک عظیم اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اِسلام نے جس طرح عورت کے مقام کو رفیع الدرجات بنا دیا، کسی اور مذہب کو اِس کی توفیق نہیں مل سکی۔ اِسلام سے قبل جس قدر معروف اور بڑے مذاہب دنیا میں رائج تھے، اُن کے نزدیک عورت ایک کم ترین مخلوق اور ذلیل وجود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اگر ہندو اِسے محض مَرد کا کھلونا قرار دیتے تھے تو عیسائیت اِسے گناہوں کی پوٹ، بے حیثیت اور انسانیت کا بوجھ سمجھتی تھی۔ آدم کے گناہ کا سبب عورت ہی کو قرار دیا جاتا تھا۔ اسلام واحد مذہب ہے جس نے عورت کو تمام آلودگیوں سے پاک قرار دیا۔ آدم کے گناہ کو بجائے گناہ کے ایک بھول سے تعبیر کیا، اور اُس واقعے میں سے عورت کے منفی کردار کو بالکل حذف کر دیا اور مرد و عورت دونوں کو برابر کا درجہ دے کر اُسے عزت و وقار کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کیا۔ یہ جو آتا ہے کہ ''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'' (النساء :۳۵) کہ مرد، عورتوں پر ایک نوع کی برتری رکھتے ہیں، اُس کا مطلب وہ برتری ہے جو مرد کے ذریعہ تحفظ کے رنگ میں عورت کو حاصل رہتی ہے۔ پھر مرد عورت پر خرچ کرتا ہے اور اُس کی حفاظت کو اپنی اولین ترجیح قرار دیتا ہے۔

اِسلام نے اولاد کو جہاں ماں باپ کا احترام کرنے اور اُن کی خدمت کے لئے ہمیشہ مستعد رہنے کا حکم دیا ہے، وہیں ماں کو باپ کے مقابلہ میں اولیت کا درجہ دیا اور بانیٔ اسلام نے فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ یعنی جس نے عاجزی، انکساری اور خدمت

گزاری میں، ماں کے پاؤں تلے دبے ہونے اور کچلے جانے کو اپنی عزت اور افتخار کا ذریعہ سمجھا، یقیناً جنت کو پا گیا۔ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے بہترین سُلوک کا اولین حقدار کون ہے؟ تو جواب ملا، تمہاری ماں۔ پھر دریافت کیا کہ اُس کے بعد کون؟ جواب ملا کہ تمہاری ماں۔ اور تیسری بار پوچھے جانے پر بھی ماں کو ہی حقدار قرار دیا۔ چوتھی بار استفسار پر باپ کا نام لیا۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ذکر ہے اور ماں کے احسانات کا کئی جگہ خصوصی رنگ میں ذکر کیا گیا ہے۔

ایک بار حضورؐ نے چار بڑے گناہوں کے ذکر میں سرفہرست ماں کی نافرمانی کو گناہ قرار دیا اور فرمایا کہ ماں کی نافرمانی تم پر حرام ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الادب) ایک شخص نے عرض کی کہ مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ کیا میرے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا 'نہیں' تو پوچھا خالہ ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ تو فرمایا اُس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (ترمذی) ایک صحابی نے جہاد پر جانے کی اجازت چاہی۔ پوچھا تمہاری ماں زندہ ہے۔ کہا کہ ہاں۔ تو فرمایا اُس کے ساتھ لگے رہو۔ جنت اُس کے پاؤں کے پاس ہے۔ (ترغیب وترتیب منذری) ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کو قرآن نے فرض قرار دیا ہے اور اکثر مواقع پر تعلیمِ توحید اور خدا پرستی کے ذکر کے ساتھ ہی، ماں باپ سے حُسنِ سلوک کا ذکر کیا ہے۔

(البقرۃ: ع ۲، النساء: ع ۶، انعام: ع ۱۹ اور بنی اسرائیل ع ۳)

اب اوپر مذکورہ آیت "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" (النساء: ۳۵) کے ساتھ اِس حدیث کو ملا کر پڑھئے جس میں چوتھی بار پوچھے جانے پر ماں کے بعد باپ کا ذکر کیا۔ تو وہاں مرد کی برتری کی خصوصی وجہ یہی سمجھی جاتی ہے کہ مرد اپنی جسمانی خصوصیات اور مضبوطی

کی وجہ سے ایک نوع کی برتری کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ درجہ میں دونوں برابر ہیں اور نیکی میں ترقی کرنے کے لحاظ سے بھی عورت کو مرد کے برابر مواقع دئے گئے ہیں، یہاں تک کہ عورت صدیقیت کے مقام تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ صدیقیت، نبوت سے فوری نیچے کا مقام ہے اگر عورت کو اُس کی جسمانی نزاکت اور اُس کے مخصوص حالات کی بناء پر نبوت سے محروم رکھا، لیکن نبوت سے قریب ترین نچلے درجہ صدیقیت کو پانے سے اُسے نہیں روکا۔ مرد کی برتری کا جو ذکر ہے، اِس سے زیادہ نہیں کہ وہ اپنی گھریلو عدالت میں، اعزازی صدر کا درجہ رکھتا ہے اور اُس کا فرض ہے کہ وہ عورت کی نگرانی اور نگہبانی کا حق ادا کرے۔ سورۃ رعد میں یہ جو آتا ہے ''جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ''۔ (رعد: ۲۴) یعنی مستقل رہائش کے باغات جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور اُن کے بڑے اور اُن کی بیویاں اور اُن کی نسلوں میں سے بھی جنہوں نے نیکی اختیار کی ہوگی۔ اِس سے پچھلی آیت میں نیک لوگوں اور اُن کی خصوصیات کا ذکر تھا۔ جس کا نتیجہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ جنت میں خود بھی داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ اُن کی بیویاں بھی۔ مثلاً ایک نبی جب جنت میں جائے گا تو یہ نہیں ہوگا کہ اُس کے اعلیٰ منصب اور مقام کی وجہ سے اُس کی جگہ اور ہوگی اور اُس کی بیویوں کا مقام اور ہوگا بلکہ گو وہ نبوت کی حامل نہیں تھیں۔ لیکن نبی کی معاونِ خاص ہونے کی وجہ سے مکان اور مقام اور محل وہی پائیں گی جو نبی کو حاصل ہوگا۔ اِس میں یہ فلاسفی بیان فرمائی کہ نیکی یا بدی کا حُصول صرف ایک آدمی کے عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اُس میں کئی دوسرے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کا تعاون بھی درکار ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے ملک میں امن وآمان اور دیگر سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی کارکردگی بھی اُس میں شامل ہوتی ہے۔ اِسی لئے شریعت نے زکوٰۃ مقرر کی اور دیگر افراد کو اُن کا حق دلایا۔ اگر تفصیل میں جایا

جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ یہاں زوج سے مراد صرف بیوی ہی نہیں بلکہ صدیقیت کا درجہ پانے والے وہ تمام مرد اور عورتیں بھی اُس میں شامل ہیں جو اپنے صِدق وصفا کی وجہ سے نبی کے مددگار رہوئے اور جو مقام،قُربتِ نبی کا اُنہیں حاصل رہا،آخرت میں بھی وہ اُس سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔

عورت صرف ماں یا بیوی ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ بہن اور بیٹی بھی ہوتی ہے۔ساس اور بہو بھی ہوتی ہے۔نند اور بھاوج، بھانجی بھتیجی،نواسی، پوتی،نانی،دادی وغیرہ اُس کے بے شمار روپ ہیں۔اُن سب رتبوں اور اقسام میں اُس کے خصوصی احترام کا اسلام نے ذکر کیا ہے۔اولاد کے احترام کا ماں باپ کو حکم دیا۔''اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ'' دودھ پلانے والی عورتوں کو بھی ماں کا درجہ دیا اور اُن سے اور اُن کی بیٹیوں سے نکاح کو حرام قرار دے دیا۔صرف رِضاعی رِشتے سے عورت اسلام میں عزت واحترام کے اُس درجہ پر فائز ہے جو نسبی رشتہ دار کے برابر ہے۔رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رِضاعی بہن کے گرفتار ہو کر آنے پر اُنہیں عزت سے اپنے قریب بٹھایا اور اُن کی رہائی کا حکم دیا۔جب آپ کی رِضاعی ماں آپ سے ملنے آتیں تو آپ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور میری ماں! میری ماں! کہہ کر اُنہیں اپنی چادر پر بٹھاتے اور خود بعد میں بیٹھتے۔اسلام سے قبل جتنے بھی اخلاقی مذاہب قائم تھے،اُن میں عورت اور مرد کے شادی کے ذریعہ اکٹھے ہونے (حقوقِ زوجین) کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ہندوستان میں ہندو، بدھ،جین، ویدانت والے، جوگی اور سادھو سب اِسی نظریہ کے حامی تھے۔عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے لاتعلقی ہی کمال روحانیت سمجھی جاتی تھی۔ اِسلام نے اِس نظریہ کو باطل قرار دیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند اصحاب نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ تجرّد کی زندگی اختیار کر کے دن رات عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنا چاہتے ہیں تو آپ نے اُن کی خواہش کو

ناپسند فرمایا اور کہا کہ ''اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ'' کہ نکاح میری سنت ہے۔ اخلاقِ فاضلہ نام ہے حُسنِ معاملہ اور حُسنِ سلوک کا۔ کوئی شادی نہ کرے۔ نہ اُس کی اولاد ہو تو اُس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ یعنی اپنے اخلاق کے بہترین اظہار کا اُسے موقعہ ہی نہیں مِل سکتا۔ فرمایا۔ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَائِکُمْ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِہِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (النور:۳۳) یعنی اپنے میں سے جو بیوائیں ہیں اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نیک ہوں اُن کی شادیاں کر دیا کرو۔ اگر وہ غریب ہیں تو اللہ اُنہیں اپنے فضل سے غنی بنادے گا اور اللہ بہت وسعت رکھنے والا اور جاننے والا ہے۔

عورتوں سے نیک برتاؤ کی تاکید کی وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء:۲۰)

عورتوں کے جذبات کے خیال رکھنے کا حکم دیا

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (النحل:۷۳)

نکاح میں مہر ادا کرنے کی تلقین کی فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَۃً۔ (النساء:۲۵)

عورت کو طلاق دیتے وقت اُس کو دیا ہوا مال واپس لینے کی ممانعت کر دی۔ فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا (النساء:۲۱)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اُس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ پھر کہتے ہیں کہ اِسلام سے پہلے ہم عورتوں کو کسی قطار وشمار میں نہیں گِنتے تھے۔ اِسلام آیا تو اُس نے اُن کے بارے میں احکام اُتارے اور اُن کے حقوق مقرر کئے۔

اِسلام نے مہر کی ادائی، نان ونفقہ، اولاد کی پرورش اور بیرونی تمام معاملات میں ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ عورت کو اِن تمام بوجھوں سے بچا لیا اور محفوظ رکھا ہے۔ اگر

مرد نان ونفقہ کی ادائی اور اپنی کفالت کے معاملات میں بخیل ہو اور عورت کو تنگ کرتا ہو تو وہ حکومتِ وقت سے اپنے حق کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ اگر پھر بھی نہ دے تو عورت کو علیحدگی کا حق حاصل ہے۔ یہاں تک رعایت دی کہ بعض خاص خاص حالات میں عورت بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی شوہر سے طلب کرسکتی ہے۔ عورتوں میں ضد اور ہٹ دھرمی ذرا زیادہ ہوتی ہے۔ شاید یہ اُن کی فطری کمزوری اور عدم تربیت پر محمول ہو۔ بعض مَرد یہ چاہتے ہیں کہ سختی، دُرُشتی اور مار توڑ کر اُن کا یہ تیڑھا پن سیدھا کردیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت عمدہ ایک تشبیہ سے مردوں کو نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرو۔ اُن کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے'' (یعنی پسلی کا تیڑھا پن فطری ہے، اُسے سیدھا کرنے کی کوشش اُسے توڑ کر رکھ دے گی) فرمایا کہ تیڑھا پن عورت کے حُسن کا ایک حصہ ہے۔ اُس تیڑھے پن کے ساتھ ہی اُس سے کام لو۔ سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو کہ مبادا اُسے توڑ کر رکھ دو۔
(صحیح بخاری و مسلم باب النکاح)

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء:۲۰) یعنی اور اُن سے اچھا سلوک کرو۔ اور اگر تم اُنہیں ناپسند کرو (تو یاد رکھو کہ) بالکل ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اُس میں بہت (سا) بہتری کا (سامان) پیدا کردے۔

عورت کے زمرے میں بیوہ عورت بھی آتی ہے۔ یتیموں کی طرح بیوہ عورت بھی ناچار، ناتواں اور بے کس گروہ میں شامل ہے۔ وہ بے یار و مددگار اور بے مونس و غمخوار ایک بے سہارا جنس انسانی ہے، جس کے آگے ساری دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نہ اُس کے کھانے پینے کا ٹھکانا اور نہ سَر و تَن ڈھانکنے کا کوئی معقول ذریعہ، کسی کو اُس کی فکر نہیں۔ اگر وہ چھوٹے چھوٹے

بچوں والی ہے تو اور بھی مجبور، تمام ذمہ داریوں اور بے پناہ مصائب کے مقابل خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ اُس کی اپنی ذمہ داریاں گھریلو تھیں۔ تمام کا کفیل اُس کا شوہر تھا جو اَب اُس سے جدا ہو چکا ہے۔ رنج والم اور فکر وتردد کے اِس گھور اَندھیرے میں وہ بے محافظ اور بے حامی اپنی عزت و ناموس کے بچانے کے لئے بھی سہارے کی محتاج ہے اور اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ کی فکر بھی اُسے مارے ڈالتی ہے۔ دنیا والوں کی بے محابا نظریں جو مسلسل اُس کا تعاقب کر رہی ہوتی ہیں، اُسے زندہ درگور کئے رکھتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں دیگر اخلاقی مذاہب میں بیوہ کا یہ مصرف تھا کہ یہودیت اُسے ایک بھائی کے مرنے کے بعد دوسرے بھائی کی ملکیت قرار دے دیتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا اُس کے ساتھ سلوک کرتا اور عورت کی مرضی کو زن وشوئی کے اِس تعلق میں کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ عیسائیت نے اِس جبری قانون کو تو مسترد کر دیا۔ لیکن اُس کے مقابلے میں کوئی ایجابی اور مثبت پہلو پیش نہیں کر سکی۔ ہندوؤں میں تو بیوہ کی زندگی غیر ضروری قرار دی جاتی تھی اور لازم تھا کہ وہ بجائے دنیا پر بوجھ بننے کے اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ خود بھی جل کر مر جائے۔ اگر چتا سے بچ جاتی تو اُس کے لئے ضروری تھا کہ ساری عمر، تمام آرائشوں اور لذتوں سے دور رہے اور ساری زندگی سوگ میں گزارے۔ اُس کا سَر مونڈھ کر اُس کے ظاہری حُسن کو بھی غارت کر دیا جاتا تھا۔ عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ شوہر کے وارثوں کی ملکیت ہو جاتی تھی، وہ اُسے آزار میں مبتلا رکھ کے اُس کا مہر بخشوا لیتے تھے، اور اُسے اپنی مرضی سے شادی بھی نہ کرنے دیتے تھے۔ اسلام آیا تو اُس نے اِس مظلوم گروہ کی فریاد سُنی۔ سب سے پہلے اُس کے غیر محدود سوگ کی مدت کو کم سے کم کر دیا۔ یعنی چار ماہ اور دس دن۔ اِس کو عدت کا زمانہ کہتے ہیں۔ یعنی گنتی کے چند دن۔ وہ بھی اِس لئے کہ اِس عدت میں اُس کے فطری غم کا کچھ مُداوا ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ تو نہیں ہے۔ عدت کے بعد ہر قِسم کے زیب

وآرائش کی اُسے اجازت دی۔ اگر اُس کا مہر ادا نہ ہوا ہو تو شوہر کے ترکے میں سے سب سے پہلے اُس کے مہر کی ادائی کو ضروری قرار دیا۔ اگر شوہر کی اولاد ہے تو بیوی کا حصہ آٹھواں، اور اگر اولاد نہیں ہے تو چوتھا حصہ اُس کا حق قرار دیا۔ اُسے دوسری شادی کی آزادی بخشی اور شوہر کے ورثاء کے ہر قسم کے جابرانہ دباؤ سے اُسے آزاد قرار دیا۔ یہ تمام اُمور نہ صرف اخلاق میں شامل کئے بلکہ اُنہیں قانون کا ایک حصہ بنادیا۔ گویا کہ جس سوسائٹی سے وہ خارج کر دی گئی تھی، دوبارہ اُس میں داخلے کا اُسے پروانہ دیدیا۔ وہ دوبارہ کسی شریک زندگی کی معیت میں زندگی کی حرارتوں اور لذتوں سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ اور اُس کے بچے بھی بے یارومددگار نہیں رہتے۔ اِس امر کو صرف وعظ ونصیحت کے زمرے میں نہیں رکھا بلکہ حُکماً اِسے ایک قانون بنادیا۔ فرمایا! ''وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ'' (النور: ۳۳) (یعنی اپنوں میں سے بیواؤں کا نکاح کر دیا کرو)۔ بلکہ اِس حکم کے آنے سے قبل اور رسالت سے بہت پہلے عملاً ہمارے پیارے آقا نے ایسا نمونہ پیش فرمایا کہ عین جوانی کی عُمر میں جبکہ تمام جذبات اور ولولے شباب پر ہوتے ہیں اور نوجوانوں میں سے بہتر سے بہتر اور جوان سے جوان کی تلاش اور جُستجو اُٹھان پر ہوتی ہے، ایک بیوہ عورت سے آپ نے شادی کی جو اَدھیڑ عمری کے قریب پہنچ چکی تھیں یعنی چالیس سال کی عمر کو جبکہ آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ اور پھر آگے پچیس سال اُن کے ساتھ کامل رفاقت کا ایسا نمونہ پیش فرمایا کہ دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد جو شادیاں آپ نے کیں، وہ رسالت اور سیاست کے تقاضوں، ونیز عربوں کی مخصوص قبائلی عصبیت کو توڑنے اور باہم رفاقت ومساوات کو قائم کرنے کے لئے کی گئی تھیں اور اُن کے فوائد ہم تاریخ میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

پردے کا حکم دے کر اِسلام نے عورت پر ایک اور بڑا احسان کیا ہے، پردہ سے مُراد وہ

پردہ نہیں جسے محاورہ میں حصاری پردہ یا اجباری پردہ کہتے ہیں۔ اسلامی پردہ یہ ہے کہ عورت اپنا چہرہ، سینہ اور زینت کی دوسری چیزوں کو چھپائے رکھ کر، گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ ضروری خرید وفروخت، صحت کی بحالی کیلئے ہواخوری اور ذہنی بالیدگی کیلئے مختلف دلچسپی کھیل وغیرہ دیکھ سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جنگ کے موقعہ پر کسی ایک بیوی کو بھی ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اِس کا مقصد اُن کی تربیت کرنا ہوتا تھا، جس عورت نے نہ جنگ دیکھی ہو اور نہ کسی کو قتل ہوتے یا زخمی ہوتے دیکھا ہو تو وہ کس طرح اپنی اولاد کو یا اپنے شوہر کو جہاد پر جانے کی ترغیب دے سکتی ہے۔ نیز بہت سے مواقع عورت کو زندگی میں پیش آسکتے ہیں جہاں اُسے بہادری کے جوہر دکھانے ہوتے ہیں۔ اگر وہ گھر میں بند رہ کر دنیا کے حالات سے بے خبر، کمزور، امراض میں مبتلا، دنیا کی رفتار سے لاعلم، مطالعہءقدرت سے محروم، فطرت کے حقائق سے لاعلمی کی بناء پر اوہام میں مبتلا، بے سلیقہ اور غیر لطیف زندگی گزارنے کی عادی ہو اور اِن تمام نقائص کے بناء پر بچوں کو صحیح تعلیم وتربیت کر سکنے کے قابل نہ ہو تو کیا یہ معمولی اور غیر اہم باتیں ہیں؟ اِس کا اثر نہ صرف اُس عورت کے گھر اور ماحول پر بلکہ سارے معاشرے پر پڑتا ہے۔ ضروری پردہ میں رہ کر دنیا کے حالات سے باخبر رہنا اور اِتنی تعلیم یافتہ ہونا کہ اُس کے بچے اُسے ناسمجھ، بھولی بھالی اور اللہ میاں کی گائے نہ سمجھنے لگیں، کیا عورت پر احسان نہیں ہے؟

ہمارے ہاں اکثر عورتیں بے کاری اور تعطل میں وقت گزارتی ہیں، کیونکہ اُن کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم وتربیت کا اُنہیں سلیقہ ہو، اُمورِ خانہ داری میں ترتیب و تہذیب اُن کے پیشِ نظر رہے، صفائی ستھرائی کا شوق ہو، زنانہ دستکاری سے واقفیت اور دلچسپی ہو تو اُن کا ایک لمحہ بھی بے کار نہیں گزر سکتا۔ تعلیم سے عمدہ خصائل اُن میں پیدا ہوں گے۔، اور جس قدر وہ تعلیم میں ترقی کریں گے، احساسِ کمتری دور ہوگا اور درست و نادرست میں فرق

کرنے کی تمیز اُن میں پیدا ہو جائے گی۔ زندگی کی تباہی میں سب سے بڑا دخل تربیت کے نقص کا ہے۔ تربیت کی اصل ذمہ داری ماں پر ہے۔ اور ماں کا سلیقہ منداور ہوش مند ہونا اُس کے بلند اخلاق پر مُنحصر ہے۔ وہ پاکیزہ معاشرت سے آراستہ، وقت کی قدر کرنے والی، اُصولِ صحت سے واقف اور رسم ورواج اور اوہام کی دشمن ہو، مَیں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کی تربیت اپنی جگہ ہے اور بہت اہم ہے، لیکن اُس سے زیادہ ہم کو اپنی بچوں کی ماؤں یعنی بیویوں کی تربیت کی طرف توجہ دینا ہے۔ عورتوں کو روشن خیال بنانے کیلئے اُنہیں تعلیم کے میدان میں تیز دوڑنا سکھانا ضروری ہے۔ مطالعہ عالَم اُن کا لازمی مضمون اور اُن کی فکر اور غور کا محور ہونا چاہئے۔ عورتوں کا عشقیہ افسانے یا ناول پڑھنا یا عشقیہ شاعری کی طرف زیادہ مائل ہونا، چنداں اُنہیں تعلیم یافتہ نہیں بنا سکتا۔ قومی ہیروز کی زندگیوں کا مطالعہ، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواجِ مطہرات و نیز اصحاب وصحابیات سے لے کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام، آپ کے خلفاء واصحاب اور ازواج کی زندگیوں کے حالات کے مطالعہ اور موازنہ کا اُن میں شوق پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاریخِ اسلام سے مختلف ادوار کا مطالعہ اور موازنہ بھی اُن کے پیشِ نظر رہنا چاہئے۔ آج احمدیت نے عورتوں کے لئے مختلف تنظیمیں قائم کر کے اور اُنہیں آزادانہ مطالعہ عام کے مواقع فراہم کر کے ممیّز کیا ہے۔ ایم۔ ٹی۔ اے بھی اُن کی تعلیم کا مؤثر ذریعہ ہے۔ جو گھرانے ایم۔ ٹی۔ اے سے محروم ہیں، اُنہی میں بگاڑ کی مختلف صورتیں زیادہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ اُن گھروں میں عورتیں فلمی دنیا اور گلیمر کی زندگی سے تو واقف ہیں لیکن اسلامی معاشرت اور سیرت سے اُنہیں لگاؤ نہیں ہے۔ عورتوں کو تو اپنے بارے میں کم اور اپنے بچوں اور نسلوں کے سُدھار اور نِکھار کے بارے میں زیادہ غور کرنے اور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عورت کا تعلیم کے فن سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسلام اور رسولِ اسلام نے عورت کی تعلیم پر بے

حد توجہ دی اور قوموں کی ترقی میں عورتوں کی اہمیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ فنِ تہذیب، علمِ تہذیب، علمِ تمدن، علمِ صحت، تاریخ، علم الاجتماع، علم الاقتضاء اور سیاسیات آج کی ضروری تعلیمات میں سے ہیں۔ جن سے عورتوں کو آگاہ رہنا ضروری ہے۔

عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے سے یہ مُراد نہیں ہے کہ وہ یورپ کی مقلد بنیں۔ کیونکہ یورپ میں عورت کو جو آزادی نصیب ہے، اُس کی حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے مَرد نے اُسے آزادی کا جھانسہ دے کر، اُس مقام پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں وہ صرف اور صرف مَرد کے لئے منفعت بخش ثابت ہوئی ہے، اپنے لئے تو وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکی، اب نہ صرف یہ کہ وہ کمانے لگی ہے، بلکہ گھر کی ذمہ داریاں بھی جوں کی توں نبھاتی جا رہی ہے۔ گویا دوہرا بوجھ سہارے ہوئے محض خوش فہمی میں مبتلا ہے، مَرد نے اُس کی پیٹھ ٹھونک کر اور یہ کہہ کر کہ تم ہمارے مساوی ہو، ہمارے شانہ بشانہ چلو، اُسے دھوکہ اور فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر ہم فطرت اور اخلاق کے داعیات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت یہ چاہتی ہے کہ تمام افرادِ انسانی اس طرح ترقی کریں کہ نظامِ تمدن میں ہیئتِ اجتماعی پیدا ہو، اور یہ اجتماعیت مفید ثابت ہو، یورپ کی موجودہ ترقی ذہنی، ترقی نہیں بلکہ مادی ترقی ہے۔ میکانیکی ترقی ہے، اور وہ فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ وہ خودغرضی کو بڑھاتی ہے، اور خودغرضی، ہیئتِ اجتماعی کی اولین شرط یعنی ہمدردی اور اخوت کے جذبے سے مزاحم اور اُس سے سخت اختلاف رکھتی ہے۔ خودغرضی کی بنیادی تعلیمات بغض وعناد، مکروفریب، حیلہ جوئی، سیہ کاری، جھوٹ اور بے حیائی پر مبنی ہیں۔ یورپ کی تقلید کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ونامرادی کی طرف لے جانے والی ہے۔ اِسی طرح ذہنی ترقی مجرد کسی کام کی نہیں اگر وہ روحانی ترقی سے مملو نہ ہو، ذہنی ترقی اگر روحانیت کے جامہ میں رہے تو ایثار و قربانی کی روح پیدا کرتی ہے اور ایثار وقربانی ہی ہیئت اجتماعی کے ضروری اور لازمی عناصر

ہیں۔مغرب نے پہلے اور اُس کی نقل میں ساری دنیا نے عورت کو گھر سے کیا باہر کیا، جامے سے یعنی لباس سے بھی باہر کر دیا۔

مغرب کی مادی اور میکانیکی ترقی کو جو فطرت کے خلاف کہا گیا اور جس کی بنیادی تعلیم کو خودغرضی سے تعبیر کیا گیا ہے اور خودغرضی کے نتائج کو ہیئتِ اجتماعی کے خلاف بتایا گیا ہے، اُس کا اظہار اور اعتراف خود مغرب کے سنجیدہ بہت سے دماغوں نے بھی کیا ہے، اِس لئے اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ نوع انسانی کی نجات یورپ کی تقلید میں نہیں ہے۔ بلکہ کسی ایسے نظامِ عمل میں ہے جو ذہنی بالیدگی کے ساتھ روحانی بھی پیدا کرے۔ ہر تعلیم یافتہ انسان یہ جانتا ہے کہ دنیا میں نظامِ تقسیمِ عمل سے معنون ہے۔ایک شخص یا ایک جماعت دنیا کے تمام کام انجام نہیں دے سکتی، اِس کی دلیل یہ ہے کہ فطرت اور قدرت نے ہر شخص کے دماغ کو ایک خاص کام کیلئے وضع کیا ہے۔ جب بھی وہ اِس کے خلاف دوسرا کام اختیار کرتا ہے تو ناکام رہتا ہے۔معلوم ہوا کہ جب ایک ہی جنس کے دو افراد یعنی دو مردوں کے دماغی تقاضے یکساں نہیں ہیں تو دو مختلف جنس کے متعلق فطرت کے داعیات کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں۔اگر قدرت یا فطرت یہی چاہتی کہ عورتیں بھی وہی کام انجام دیں جو مرد انجام دیتے ہیں تو دونوں کی جسمانی ساخت، دماغی ترکیب، اور نفسیاتی میلان بھی ایک ہوتے ،لیکن چونکہ اُس کا مقصد ابتداء ہی سے اِس تفریق کو نمایاں کرنا تھا، اس لئے مرد و عورت کے درمیان صورت و سیرت ہر دو اعتبار سے ایسا فرق رکھ دیا کہ جاہل سے جاہل انسان بھی ایک نظر میں اِس فرق کو سمجھ سکتا ہے۔اب غور فرمائیے کہ اِس فرق سے کیا مراد ہے۔اور وہ کونسا تقسیمِ عمل ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر کے، باہم اتفاق واتحاد، تعاون اور ہمدردی اور اُلفت و محبت پیدا کر سکتا ہے۔مرد کی جسمانی بناوٹ بتا رہی ہے کہ وہ محنت، جفاکشی، صعوبت اور سختی برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔(اُن چند مثالوں کو

نظر انداز کر دیجئے کہ جہاں بعض عورتیں مرد کے ساتھ سخت کاموں میں برابر کا حصہ لیتی ہیں۔ مردوں میں بھی تو ایسے مرد نظر آتے ہیں جن کے اوپر نسائیت طاری ہے) دنیا کی تدریجی ترقی پر غور کیا جائے، تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سے ہی مردوں نے مردانگی والے اور عورتوں نے نسائیت والے کام کئے ہیں۔ اِسی طرح مردوں کے لئے ترقی کا میدان وہی ہے جہاں اُسے زیادہ محنت سے کام لینا پڑے اور عورتوں کا ارتقاء یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کیلئے زیادہ تسلی بخش اور باعثِ سکون بنائیں۔ بچے جب تک بچے ہوتے ہیں اُن کا اِنحصار ماں پر ہی ہوتا ہے، عورتوں کی جسمانی اور دماغی ترکیب کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ رفق ومُلاطفت اور نرمی و مداوا اُن کی فطرت ہو۔

ہر تعلیم یافتہ آدمی پر یہ امر عیاں ہے کہ عمل کی دنیا میں صرف حرکت نہیں بلکہ استمرار حرکت یعنی حرکت کا قیام جس کو مسلسل حرکت کہا جاسکتا ہے، بھی ضروری ہے۔ یہ استمرار حرکت ہی عمل کو قائم رکھتا اور آگے بڑھاتا ہے۔ اِسی طرح مرد کی محنتوں اور صعوبتوں کے لئے بھی ایسی چیز کی ضرورت ہے جو اُنہیں استمرار بخشے یعنی برقرار رکھے، اگر مرد دِن بھر کڑی دھوپ یا گرمی میں محنت کرتا ہے تو رات میں اُسے راحت اور سکون کی ضرورت ہے تا کہ اُس کا عمل کا نظام برقرار رہ سکے اور صبح وہ اُٹھے تو پھر کام اور محنت کیلئے اپنے آپ کو مستعد پائے۔ دن بھر سورج کی گرمی اگر اُس کی روح کو زخم لگاتی رہتی ہے تو رات میں چاند کی ٹھنڈک میں ایک ایسا ہاتھ اُسے درکار ہوتا ہے جو اُن زخموں پر مرہم رکھ سکے اور آئندہ صبح اُسے اپنے کام کے لئے تازہ دم اور پُر جوش پائے۔ پھر کون انکار کرسکتا ہے کہ مرد کیلئے سکون اور راحت بخش ہاتھ صرف عورت کا ہاتھ ہے۔ مادی تکالیف کی خلش صرف عورت کی روحانیت کی مرہونِ منّت ہے۔ عمل کا یہ فرق اور تقسیم چونکہ قدرت نے قائم کی ہے اس لئے اِسی کو معیار بنا کر مردانگی اور نسائیت کے معاملات

پر حکم لگانا چاہئے۔جس طرح مرد اپنی دماغی صلاحیتوں اور استعدادوں سے کام لیکر مادی ذرائع ترقی فراہم کرنے کا اہل ہے۔اِسی طرح عورت بھی اپنی دماغی مساعی سے کام لیکر روحانی اسباب، راحت وسکون اور رأفت وملاطفت مہیا کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے اور حقیقتاً یہی مرد اور عورت کی برابری ومساوات ہے۔اپنے اپنے میدان میں دونوں حریف، صلاحیتوں اور تقسیمِ عمل کی بجا آوری میں مساوی درجہ کے حامل ہیں۔عورتوں میں آزادیءنسواں کی جب بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے، اُس میں سب سے پہلا نعرہ یہی لگتا ہے کہ مرد ہمارے اعمال کا احتساب کر کے ہم پر ظلم کر رہا ہے۔اِس احساس کی وجہ تعلیم کی ترقی نہیں ہے، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نِصاب اِس خرابی کے موجب نہیں ہیں بلکہ وہ ماحول کالجوں اور درسگاہوں کا اِس کا ذمہ دار ہے، جہاں دولت مند لڑکیاں، متوسط طبقے کی لڑکیوں پر اپنی چمک دمک اور فضول خرچیوں کے ذریعہ سے اثر انداز ہوتی ہیں۔معلمات اور لیکچرر خواتین بھی، جو دنیا میں آزاد، اخلاقیات سے منحرف اور مادی جال میں پھنسی ہوئی ہیں، اُنہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔کالجوں میں تہذیب وشائستگی کا معیار لباسوں کی پاکیزگی اور آرائش کی چیزوں کا تنوع سمجھ لیا جاتا ہے۔جب نچلے یا متوسط طبقے کی لڑکیاں اپنے آپ کو اُن کے برابر بنانے میں مُنہ کے بَل گرتی ہیں اور مختلف برائیوں میں مُبتلا ہو جاتی ہیں، تو اُن کا غصہ اپنے ماں باپ کی حیثیت پر اُترتا ہے اور اُنہیں اپنے والدین سے متنفر کر دیتا ہے۔والدین کی محبت اور اُن کا احترام یکسر نظر انداز ہو جاتا ہے۔اِس موضوع پر بہت لمبی بحث کی جاسکتی ہے۔لیکن وقت کا اِقتضاء اِس کی اجازت نہیں دیتا، دوسرے یہ کہ یہ گفتگو موضوع سے ہٹ کر معلوم ہونے لگتی ہے، لیکن غور کیا جائے تو اِسلام میں عورت کا مقام اِسی سے متعین ہوتا ہے، یعنی بتانا یہ مقصود ہے کہ اِسلام نے جو اِحسان عورت پر اُس کا مقام بلند کر کے کیا ہے، اُس کا تقاضا کیا ہے؟ اُس کا تقاضا یہی ہے کہ

عورت روحانی اعتبار سے سوسائٹی میں وہ مقام بنانے کی کوشش کرے، جو اُسے ہئیتِ اجتماعی کا ایک باوقار، زور آور اور پُر اثر پُرزہ بنائے رکھے (روحانیت کے معنی یہاں صرف اعتقاد اور عبادت نہیں ہے بلکہ اخلاق، تہذیب، شائستگی، عزم و حوصلہ اور فروغِ انسانیت کے میدان میں ایک اعلیٰ اور اُونچی مسند پر فائز ہونے کے ہیں) یہاں پر ہمارا یہ منشاء نہیں ہے کہ عورتیں ملازمتیں یا دوسرے کام نہ کریں اور صرف خانہ دار بنی رہیں، کیونکہ بہت سی لاچاریاں بھی ہوتی ہیں جو عورت کو اِس راستے کو اپنانے پر مجبور کر دیتی ہیں، دیہاتی عورتیں کھیتی باڑی یا دوسرے کاموں میں شوہروں کے ہاتھ بٹاتی ہیں اور یہ اُن کے حالات کا اِقتضاء ہوتا ہے۔ اِسلام یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنی خصوصی اور فطری صلاحیت یعنی روحانیت کے جامہ میں رہ کر تمدن کے باب میں ہئیت اجتماعی کی ذمہ داریوں کو نبھائے اور سوسائٹی کے تقاضوں کا شعور پیدا کر کے اپنے شوہر اور اولاد کی قیمتی مُشیر اور مُعاون بننے کا فخر حاصل کرے اور اُس کی ملازمت یا دوسرا اضافی کام اُس کی روحانیت کے اصل منشاء کو ختم نہ کر سکے۔

اَب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے ایک اور اِعتراض کو بھی دور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اِعتراض عورتوں کی طرف سے عُموماً کیا جاتا ہے کہ اِسلام نے چار شادیوں کی اجازت دے کر عورتوں پر ظلم کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی عورت کے مقام کو بلند اور متعین کرنے کا ایک ذریعہ ہے، آج یورپ کی بہت سی عورتوں نے جنھوں نے اِسلام کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جماعت کی مساعی کے نتیجہ میں وہ اِسلام سے آشنا اور اِسلام کی طرف مائل ہو رہی ہیں، بلکہ اِسلام قبول کر رہی ہیں، برملا کہتی ہیں کہ ہمیں یہ قبول ہے کہ ہمارے شوہر کی اور بھی بیویاں ہوں اور وہ اِسلام کے حُکم کے مطابق عدل کو روا رکھے، لیکن یہ ہمیں منظور نہیں کہ وہ حرام کاری کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِسلام نے چار شادیوں کی اجازت دے کر عیاشی کا

دروازہ نہیں کھولا بلکہ اسلام سے قبل بے شمار شادیوں کا جو ایک بے ہنگم سلسلہ اور رواج تھا، اُسے گھٹایا اور صرف چار تک اجازت دے کر غیر فطری عیاشی کے دروازے کو بند کر دیا ہے۔ ساتھ ہی عدل کی شرط لگا کر اور یہ کہہ کر کہ تم کتنا ہی چاہو، عدل کر ہی نہیں سکتے، اِس دروازے پر قفل ڈال دیا ہے، جو لوگ شرط کو پورا نہیں کر سکتے اور بِلا ضرورت شادیوں پر یقین رکھتے ہیں، وہ ایسے ہی مسلمان ہیں، جیسے بہت سے مسلمان شراب بھی پیتے ہیں اور جُوا بھی کھیل لیتے ہیں اور دیگر بہت سے غیر اخلاقی اُمور پر عَمل کو بھی ناروا نہیں سمجھتے۔ سورۃ نساء آیت ۴ میں جہاں یہ فرمایا کہ ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' (النسا: ۴) یعنی (غیر یتیم) عورتوں میں سے دو دو (سے)، تین تین (سے) اور چار، چار سے نکاح کر لو، لیکن اگر تمہیں خوف ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی (عورت) سے۔ وہیں آگے آیت ۱۳۰ میں فرمایا ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ '' (النسا: ۱۳۰) اور خواہ تم (عدل کرنے کی کتنی بھی) خواہش کرو (تو بھی) تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے۔

تعددِ اِزدواج دراصل ایک خاتون کا امتحان اور آزمائش ہے، جس میں ضد، ہٹ دھرمی، حسد، جلن اور انتقام جیسے منفی پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں، جو عورت اِس کڑی آزمائش میں پوری اُتر کر، اپنے عزم و حوصلہ، اپنی نیک خوئی، برتر اخلاق، محبت و اخوت اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتی ہے وہی ''اوڑھنی والیوں کے پھول'' کہلانے کی مستحق ہے۔

آج ساری دنیا میں عورتیں یہ دعوٰی کرتی ہیں کہ وہ اَب جاگ چکی ہیں، آج احمدی عورت بھی جاگ چکی ہے، لیکن اُس کا جاگنا دوسروں سے مختلف ہے۔ اِس کا ثبوت ہمارے اخبارات، رسائل اور خصوصاً ایم۔ ٹی۔ اے کی نشریات ہیں، جو اکنافِ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں

خواتین کی گونا گوں خدماتِ عالیہ کو اظہر من الشّمس کر رہی ہیں۔عورت اپنی فطری، روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کی طرف لے جائی جا رہی ہے تاکہ اپنے اپنے معاشرے میں بھرپور طریقے پر اسلامی کردار اور تعلیمات کو روشناس کرائے اور تمام دنیا کی عورتوں کے لئے خوبصورت عمل کی پیکر بن کر ایک مثال قائم کرے۔ یہ سب کچھ پردے کے اندر رہ کر کیا جا رہا ہے، اور وہ اپنے مفوضہ کاموں کی انجام دہی میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتی ہے۔

۞۞۞

(15)

پردہ اور اِسلام

قرآنِ مجید میں پردہ کی تعلیم سورۃ احزاب اور سورۃ نور میں ملتی ہے، الاحزاب میں مختصراً اور النور میں تفصیلاً۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ (الاحزاب: آیت ۶۰)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مؤمنوں کی بیویوں سے کہہ دے کہ (جب وہ باہر نکلیں) اپنی بڑی چادروں کو سروں پر سے گھسیٹ کر اپنے سینوں تک لے آیا کریں، یہ امر اِس بات کو ممکن بنا دیتا ہے کہ وہ پہچانی جائیں اور اُن کو تکلیف نہ دی جائے، اور اللہ بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

بُرقعہ کے رواج سے پہلے عرب عورتیں، چھوٹی چادر کے اوپر بڑی چادر اوڑھ لیا کرتی تھیں، چھوٹی چادر سے سینہ ڈھانکتیں اور بڑی چادروں کو گھونگٹ کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ یہی رواج ہندوستان اور پاکستان میں، خصوصاً پنجابی عورتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بڑی چادروں کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ پیٹھ کی طرف سے سر پر لی جاتی ہیں، راستہ چلتے ہوئے، یا مردوں سے سامنا ہونے پر، اُنہیں پیروں سے گھسیٹ کر سینوں تک لے آتے ہیں، جس سے چہرہ اچھی طرح چھپ جاتا ہے۔ ایک تو اِس طرح سے عورت کا مسلمان ہونا ثابت ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھ کر کہ یہ پردہ دار مسلمان خاتون ہے، اُس سے چھیڑ خانی نہیں کرتے، ورنہ کھلے

چہرے، بے تکلفی سے پھرنے والی عورتوں کو آوارہ مرد شرارتاً چھیڑ بھی لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ ۔(النور:۳۲)

اور مؤمن عورتوں سے کہہ دے کہ وہ بھی اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں۔اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کیا کریں سوائے اُس کے جو آپ ہی آپ بے اختیار ظاہر ہوتی ہو (جیسے قد یا موٹا یا جسم کا دُبلا ہونا) اور اپنی اوڑھنیوں کو اپنے سینوں سے گزار کر اور اُس کو ڈھانک کر پہنا کریں،اور وہ صرف اپنے خاوندوں یا اپنے باپوں یا اپنے خاوندوں کے باپوں،اپنے بیٹوں یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بیٹوں یا اپنی بہنوں کے بیٹوں یا اپنی ہم کفو عورتوں (یعنی ایسی عورتوں کے جو اپنی شرافت میں مشہور ہوں) یا جن کے مالِک اُن کے داہنے ہاتھ ہوئے ہیں، یا ایسے ماتحت مَردوں پر جو ابھی جوان نہیں ہوئے یا ایسے بچوں پر جن کو ابھی عورتوں کے خاص تعلقات کا علم حاصل نہیں ہوا، اپنی زینت ظاہر کریں،اُن کے سِوا کسی اور پر نہ ظاہر کریں۔

اوپر کے احکامات سے حسبِ ذیل نتائج مُستنبط ہوتے ہیں۔

۱) چار دیواری میں قید رہنے یا بند رہنے کا کہیں حکم نہیں۔

۲) ضروری پردے کے ساتھ عورت باہر نکل سکتی ہے۔نگاہیں نیچی رکھنے کا جو حکم ہے، وہ

ظاہر ہے کہ ایسے ہی موقعہ کے لئے ہے جب مَردوں سے سامنا ہونے کا اندیشہ ہو۔

۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے کہ آرائش کا اظہار نہ ہو سکے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کا آج کل کا پردہ ہوتا ہے۔ یعنی آستین والے برقعوں کا۔ وہ نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

۴) اِلَّا مَاظَهَرَ مِنۡهَا سے جو ثابت ہوتا ہے وہ ہے، ہاتھ پاؤں کا زیور، یا پاؤں کا نچلا حصہّ، قامت کا حُسن اور چلنے کی چھب اور جسم کا موٹا یا دُبلا ہونا وغیرہ۔

بعض معاملات جن کے بارے میں قرآنِ مجید سے صریح اور واضح ہدایات مِل جاتی ہیں، تو پھر حدیث کی طرف رجوع کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ حدیث نصِ صریح کے خلاف نہیں ہوسکتی، اگر خلاف ہے تو وہ صحیح حدیث نہیں کہی جاسکتی۔ بعض اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات، محض قرآنی عِلم کی کمی یا نام نہاد عُلماء کی کورانہ تقلید کے نتیجے میں اِس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی پردے میں عورت کے چہرے کا چھپایا جانا ضروری نہیں یا یہ کہ عورت کا چہرہ زینت میں شامل نہیں، حالانکہ عورت ہو یا مرد، زینت کی تمام چیزوں میں نمایاں اور شاطر چیز چہرہ ہی ہے۔ جو سب سے زیادہ فسادِ اخلاق کا موجب ہوتا ہے، بہت سے تعلیم یافتہ مُسلمان جن میں عُلماء قِسم کے بعض حضرات بھی شامل ہیں، پردے کی پابندی کے زیادہ قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ پردے کے معاملے میں اِقتضائے زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہونی چاہئے اور عورت کو اُس قید سے آزادی ملنی چاہئے جس میں وہ صدیوں مُبتلا رکھی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پردے کے لُزوم کے حامی عورتوں کو چار دیواری میں قید رکھ کے اور اُن پر بے جا پابندیاں لگا کر ایک انتہا کو چھوتے رہے ہیں تو اِن علمبر دارانِ آزادی کا قدم دوسری انتہا کی جانب ہے۔ اگر ہم اسلام کو فطری مذہب سمجھتے ہیں (اور حقیقتاً وہ فطری مذہب ہے) تو اُس کا ہر حُکم اور اُس کی ہر تعلیم یقیناً فطری ہے اور جب فطری ہے تو اُس کا برتنا اور اُس پر عمل کرنا فائدے کا ہی موجب ہوسکتا ہے،

نقصان کا نہیں۔

پردے کا اصل مقصد عورت اور مَرد کے باہم اختلاط اور اُن کے محرکات کو روکنا ہے، کیونکہ اِن سے اخلاق کے فساد کا اندیشہ ہے۔ حَصاری یا اجباری پردہ نہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور نہ ہی کشفِ حجاب۔ پردہ نام ہے حیا کا اور حیا کی حقیقی تعریف غضِّ بصر ہے، یعنی نگاہیں نیچی رکھنا، اگر حیا نہیں ہے تو لاکھ قیدیں بھی عبث ہیں، اگر کوئی برافگندہ نقاب بھی حیا سے متصف ہے تو نیم پردہ نشین ہے، کیونکہ اُس نے اپنی ذات کی حد تک تو حق ادا کر دیا لیکن اُن مَردوں کے لئے جو غضِّ بصر سے آشنا نہیں، ایک کُھلا اشتہار رہی، اگر پردہ اُٹھا دیا جائے تو ممکن ہے کہ اَسّی (80%) فیصد عورتیں کوئی توجہ حاصل نہ کر سکیں لیکن بیس (20%) فیصد ایسی ہوں گی جو مَردوں کے دیدہ و دل کو بے تاب کر دیں گی، بظاہر وہ مرکزِ نگاہ نہ بھی رہیں تو مرکزِ خیال ضرور رہیں گی۔ اسلام رِسک کا قائل نہیں ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ بُرے کام یا گناہ نہیں کرو بلکہ یہ کہتا ہے کہ بُرائی کے قریب سے بھی نہ گزرو۔ یعنی گناہ کی ہر امکانی قربت سے دور رہو۔

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ ....الخ (النور:۳۱) اِس آیت میں مَردوں کو اپنی آنکھیں نیچے رکھنے کا جو حکم دیا وہ اصل ہے اور جڑ ہے تمام بُرائیوں اور اُن کے محرکات سے روکنے کی.....انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اِس مضمون کو چھیڑا ہے مگر وہ رنگ بے حد ناقص اور غیر فطری ہے، وہاں صرف مَردوں کو پابند کیا ہے اور عورتوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ ''جس کسی نے بُری خواہش سے عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اُس سے زنا کر چکا'' (متی باب ۵ آیت ۲۸) لیکن اسلام کہتا ہے کہ تم عورتوں کے چہرہ پر نظر ہی نہ ڈالو.....نہ بد نیتی سے نہ نیک نیتی سے۔ کیونکہ اگر تم نے دیکھا تو ممکن ہے کہ شیطان ورغلائے اور دلوں میں برائی کا بیج بودے۔ پھر اِسلام مَردوں ہی کو نہیں بلکہ عورتوں کو بھی یہی حکم دیتا ہے

کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور بے محابا مَردوں کے چہروں پر نِگاہ نہ ڈالیں ،نفسیاتی نکتہ نظر سے جس لمحہ مرد اور عورت کی نظریں چار ہوتی ہیں ، وہی لمحہ خباثت کا دیباچہ بن جاتا ہے،غضِ بصر کا مفہوم یہی ہے کہ نظروں کے تصادم کو روکا جائے ، اور ظاہر ہے کہ نظروں کے متصادم ہونے میں سب سے پہلے نظر چہرے ہی پر پڑتی ہے۔ اِس لئے فطری طریقہ پردے کا یہی ہوا کہ چہرے کو آنکھوں سمیت ڈھانکا جائے۔ جس طرح مَرد اور عورت کی طبعی ضروریات یکساں ہیں ، اُسی طرح اللہ تعالیٰ کا طبعی قانون بھی دونوں پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ایک مَرد کو اپنی صحت وتندرستی کی بقا کے لئے کھُلے رہنے اور پھرنے کی ضرورت ہے ، ویسے ہی عورت کو بھی کھلی ہوا میں پھرنے اور ایک محدود ماحول میں بند رہنے سے پرہیز کی ضرورت ہے۔ اِسی وجہ سے اِسلام نے عورت کو باہر نکلنے سے نہیں روکا بلکہ ایسی صورت کے پیشِ نظر ممکنہ خطرات سے اُس کے بچاؤ کے لئے ، پردے کی قدغن لگادی۔ جس طرح خصوصی احتیاط اور تدبیر کے بغیر قانونِ طبعی کے مُضر اثرات سے بچنا ممکن نہیں ، بالکل اُسی طرح پردہ فطرت کے طبعی تقاضوں کے فساد کو روکنے کی تدبیر اور سعی کا نام ہے۔

غضِ بصر کے حُکم کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ مَرد اور عورت کسی صورت میں بھی ایک دوسرے کے جسم کے کسی حصہ پر نظر ڈال ہی نہیں سکتے۔ اگر اِس حکم کا یہی مقصد ہوتا تو اُس کی صرف یہی صورت ہوتی کہ چونکہ مرد کی ذمہ داریاں گھر سے باہر ہیں اس لئے اُسے تو روکا نہیں جاسکتا، لیکن عورت کی ذمہ داریاں اندرونِ خانہ سے متعلق ہیں ، اس لئے اُسے ایسی دیواروں کے پیچھے قید رکھا جاتا کہ جن کے تمام در اور دریچے بند ہوتے۔ ظاہر ہے جب اسلام نے عورت کو باہر گھومنے اور پھرنے کی اجازت دی ہے تو ایسی کوئی بھی پابندی حُکمِ شریعت کے منافی اور قانونِ فطرت کے مغائر ہے۔ جب عورت باہر نکلے گی تو خواہ وہ پردہ میں رہے، ہاتھوں کے کھلے

حصوں اور پاؤں کے نچلے حصوں پر مرد کی نظر پڑے گی۔ قد و قامت کی چھب بھی چھپائی نہیں جاسکے گی۔ اندازِ خرام بھی پوشیدہ نہیں رہے گا اور ہاتھوں کی حرکتیں بھی سامنے ہی ہوں گی۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ شریعت نے اُن پر پابندی نہیں لگائی۔ پردے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ عورت کو مرد کے یا مرد کو عورت کے ساتھ باہم دگر مخلوط ہونے سے روک کر اُس کے محرکات پر تبر رکھا جائے کیونکہ یہ چیز دونوں کے حیوانی جذبات کو مہمیز کرتی اور اُنہیں جذبات کے عمیق گڑھوں میں دھکیلنے کا موجب ہوتی ہے۔

قرآن کا فطری طریق احکامات کے باب میں یہ ہے کہ جہاں مردوں کو مخاطب کیا جاتا ہے تو اُس خطاب میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، لیکن سورۂ نور آیت ۳۱، ۳۲ میں مردوں اور عورتوں کو الگ الگ مخاطب کیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ بے حیائی کی رسم پیشہ کے طور پر صرف عورتوں میں پائی جاتی ہے، اِس لئے ضروری تھا کہ اُنہیں الگ سے بھی مخاطب کیا جاتا، **وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** فرمایا کہ اچھے اچھے چمکدار یا مردوں کو متوجہ کرنے والے کپڑے اور زیور پہن کر اُن کی نمائش نہ کرو، سوائے اِس کے کہ کوئی چیز خود بخود ظاہر ہوجائے۔ **إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** کے متعلق مفسروں میں بے حد اختلاف ہے۔ کپڑوں، زیورات، ہاتھوں کی مہندی، ہاتھوں کے کڑے، انگوٹھی پازیب، برقعہ یا عَبا وغیرہ مختلف جزئیات پر خوب خوب طبع آزمائی کی گئی ہے، حالانکہ قرآنی الفاظ یہ ہیں کہ **إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** ۔سوائے اُس کے جو آپ ہی آپ ظاہر ہو، اب غور فرمایئے، خود بخود ظاہر ہونے والی چیزوں میں جسم کا موٹا یا دُبلا ہونا، قامت کی رعنائی، چلنے کی چھب اور ہاتھوں کی حرکات وغیرہ شامل کی جاسکتی ہیں۔ ورنہ کپڑوں کی چمک دمک، زیورات کی مہک، وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ عورت چاہے تو چھپالے اور چاہے تو ظاہر کرے۔ خود بخود ظاہر ہونے والی چیزوں میں اِن کا شمار نہیں کیا

جا سکتا۔ اسی طرح چہرہ بھی خود بخود ظاہر ہونے والی چیز نہیں جب تک کہ دانستہ ظاہر نہ کیا جائے، نتیجہ یہ نکلا کہ عورت کے یہ کام اور مجبوری کے لحاظ سے جو چیز آپ ہی آپ ظاہر ہو، وہ پردے میں شامل نہیں ہے، چنانچہ اِسی اجازت کے ماتحت طبیب عورت کی نبض دیکھتا ہے، کیونکہ بیماری مجبور کرتی ہے کہ اُس چیز کو ظاہر کیا جائے، اگر چہرے پر جلدی بیماری ہو تو چہرہ بھی طبیب کے سامنے کھولنا پڑے گا۔ کسی اندرونی بیماری کی صورت میں زبان اور حلق کا معائنہ بھی طبیب کرے گا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک جنگ میں ہم عورتیں پانی لاتی تھیں اور ہماری پنڈلیاں ننگی ہو جاتی تھیں، اُس وقت پنڈلیوں کا ننگا ہو جانا قرآنی پردے کے خلاف نہیں تھا بلکہ مطابق تھا، اُس وقت پاجامہ یا شلوار کا رواج نہیں تھا، بلکہ عورتیں تہ بند باندھا کرتی تھیں، اور دوڑنے میں وہ پنڈلیوں کو کھول دیتا تھا، دیہاتی اور خصوصاً کھیتوں اور میدانوں میں کام کرنے والی عورتیں جو کاشتکار گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں، مجبور ہوتی ہیں کہ باہر نِکل کر اپنے مَردوں کا ہاتھ بٹائیں، اور اُن کا بوجھ ہلکا کریں، اُن کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے ناک تک کا حصہّ کھلا رکھیں، اُن کا ایسے کرنا پردے سے باہر نہیں بلکہ اندر ہی سمجھا جائے گا کیونکہ اُس کے بغیر کام کر ہی نہیں سکتیں، اگر عورتیں پانی اور کیچڑ کا کام کر رہی ہوں تو اُن کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنا پاجامہ اُڑس لیں اور پنڈلیوں کو کُھل جانے دیں۔ شرعی اعتبار سے یہ چیز پردے کے اندر ہی سمجھی جائے گی، لیکن جِس عورت کی نوعیتِ کار ایسی نہ ہو کہ وہ کھیتوں یا میدانوں میں کام کرے تو اُس کے لئے اِس طرح سے آنکھوں اور ناک کا کُھلا رکھنا یا پنڈلیوں تک لباس کو اُٹھا لینا ہرگز جائز نہیں ہوگا۔ جو عورت سیر یا تفریح کے لئے یا کسی ضروری کام سے باہر نکلتی ہے تو اُس کے لئے ضروری ہے وہ اپنا چہرہ ڈھانکے رکھے، بعض فقہاء نے تو اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کی

رعایت سے یہاں تک فتوٰی دیا ہے کہ اگر کوئی عورت حاملہ ہو اور اُسے اچھی دایہ یا لیڈی ڈاکٹر مُیسر نہ ہو اور ڈاکٹر یا طبی مُشیر یہ کہے کہ اگر وہ کسی قابل ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرے گی تو اُس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی تو ایسی عورت کا کسی ماہر ڈاکٹر سے زچگی کروانا پردے سے باہر نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر ایسے وقت عورت شرم و حیا کی وجہ سے مَرد ڈاکٹر سے رجوع نہ کرے اور زچگی کی اُلجھن یا تکلیف سے فوت ہوجائے تو اُس کا یہ فعل خودکشی کے زمرے میں آئے گا۔

آگے فرماتا ہے **وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ** اور چاہئے کہ وہ اپنی اوڑھنیوں کو کھینچ کر اپنے گریبانوں تک لے آئیں۔ خمار اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو عورتیں اپنے سَروں پر باندھ لیا کرتی ہیں اور جَیْبٌ گریبان کو کہتے ہیں۔ آج کل فیشن والے گریبان دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہر طرف ہوتے ہیں لیکن عربوں میں جو رواج تھا اُس کے مطابق عرب عورتوں کے دامن سامنے ہوا کرتے تھے، فرمایا کہ سَر کے کپڑے کو کھینچ کر دامن تک لے آؤ یعنی گھونگٹ کاڑھ لو، یہ مطلب نہیں کہ اوڑھنی یا دوپٹے سے سینہ ڈھانک لیا۔ خمار چھوٹی چادر ہوتی ہے جس کا آنچل نہیں ہوتا۔ اُسے سَر سے کھینچ کر سینہ سے نیچے دامن تک لے آنے کا حُکم ہے۔ تاکہ سامنے سے آنے والے کو چہرہ نظر نہ آئے، اِس لحاظ سے آجکل کا آستینوں والا جو برقعہ ہے وہ پردے کا بہترین بدل ہے۔ اِس میں ہاتھ حرکت کرنے میں آزاد رہتے ہیں اور چہرے پر بھی نقاب ڈال لی جاتی ہے۔ جس سے سانس لینے میں دُشواری نہیں ہوتی اور آگے راستہ بھی صاف نظر آتا ہے، آگے فرمایا **وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ** ..... الخ۔

اِس قِسم کی زینت سوائے اپنے خاوندوں یا باپ دادوں کے، یا خاوندوں کے باپ

دادوں کے، یا اپنے بیٹوں، پوتوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اُن کے بیٹوں پوتوں کے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پوتوں کے، یا اپنے طور طریق والی عورتوں کے یا غلاموں کے۔(غلاموں میں صرف عورتیں شامل ہیں۔مَرد غلام شامل نہیں، کیونکہ غلام صرف وہ ہوتے ہیں جو کسی دشمن غیر مسلم قوم سے شدید مذہبی جنگ کے بعد قید ہوکر ہاتھ لگتے ہیں، اِسلام تو مؤمن شریف مَردوں سے پردے کا حکم دیتا ہے۔پھر کیونکر ممکن ہے کہ وہ دشمن قوم کے ایسے مَردوں سے جنہیں سزا کے طور پر پکڑا گیا ہو، اپنی عورتوں کا پردہ اُٹھا رکھنے کا حکم دے) بلکہ غلاموں کے ذکر کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر ہے۔ملاحظہ ہو۔اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِالطِّفْلِ یعنی اپنی ہم کفو عورتوں (جو اپنے سے ملتے جُلتے طور طریق رکھنے والی ہوں) یا جن کے مالک اُن کے داہنے ہاتھ یعنی غلاموں کے یا ایسے ماتحت مَردوں کے جو ابھی جوان نہیں ہوئے۔ یا ایسے بچوں کے جنہیں عورتوں کے مخصوص تعلقات کا ابھی کوئی عِلم نہیں۔اَوْ نِسَآئِهِنَّ کہکر بعض مخصوص عورتوں سے بھی پردے کا حکم دے دیا۔یعنی ایسی عورتوں کے سامنے نہ آیا جائے۔جن کے اخلاق اور کردار سے تم واقف نہیں ہو۔بعض آوارہ مَرد ایسی عورتوں کو رکھے ہوتے ہیں جو شرفاء کے گھروں میں جاتی اور وہاں کی عورتوں کے حالات اور کیفیات سے اُن مَردوں کو آگاہ کرتی ہیں۔گھروں میں صرف ایسی عورتوں کا داخلہ ممکن ہونا چاہیئے جن سے گھر والے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں اور اُن کا کوئی عیب اُن کے عِلم میں نہ ہو۔

ہندوستان اور اسپین میں عیسائیوں نے اپنے اپنے وقتوں میں ایسی عیسائی عورتوں کا مسلمان گھروں میں جال پھیلا دیا تھا جو بظاہر عیسائیت کی تبلیغ کا کام کرتی تھیں، لیکن وہ درِ پردہ فحاشی کی تعلیم دیتی تھیں، اس طرح سینکڑوں مسلمان گھرانے تباہ ہوئے اور مسلمان عورتوں میں

عیسائیت کے خلاف اِسلامی جو غیرت تھی، وہ مُردہ ہوگئی، یہاں تک کہ عیسائیوں نے مسلمانوں پر غلبہ پالیا، مسلمان لڑکیوں کو جب تک گھر پر اُن کی اسلامی اور تقابلی تعلیم وتربیت کا مناسب انتظام نہ ہو اور اُن کی نگرانی کا پورا پورا خیال نہ رکھا جاتا ہو، عیسائی مدارس میں پڑھنے کیلئے بھی نہیں بھجوانا چاہئے۔ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ میں صرف لونڈیوں کا ذکر ہے، وہ ایسی جن پر تمہیں پورا پورا اعتماد ہو، جس طرح اَوۡ نِسَآئِهِنَّ میں صرف وہ عورتیں شامل ہیں جن کا کردار شک وشبہ سے بالا ہو اور اُن پر کامل بھروسہ کیا جاسکتا ہو، غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ میں بعض لوگوں نے مخنث کو بھی شامل کرلیا ہے، لیکن احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخنث سے بھی پردے کا حکم دیا ہے کیونکہ وہ باہر جا کر دوسرے مردوں سے باتیں کرتے اور اشاعتِ فحش کا باعث ہوتے ہیں، (ابوداؤد کتاب اللباس، ابن ماجہ کتاب النکاح اور مُسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۹۰) پس غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ میں مخنث نہیں بلکہ جو اِس قدر بوڑھے ہو چکے ہیں کہ بدی کا کوئی خیال انہیں آ ہی نہیں سکتا ہو، یا ایسے رشتہ دار اور نوکر وغیرہ جو نیم عقل یا پاگل ہوں یا ضعیفی کے باعث شہوانی جذبات سے عاری ہو چکے ہوں، ایک دلیل اِس بات میں کہ یہاں مخنث مُراد نہیں ہیں، یہ ہے کہ اِسلام میں مخنث بنانا جائز نہیں ہے اور جو چیز جائز ہی نہیں، اُس کے بارے میں احکام کا کیا ذکر؟ قرآنِ مجید میں آتا ہے۔ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ (النساء: ۱۲۰) (شیطان نے کہا) میرے کہنے پر لوگ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورتوں میں بھی تبدیلی کیا کریں گے، یعنی جسمانی قدرتی ساخت میں تبدیلی پیدا کرنا شیطانی فِعل ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام ایسے باحکمت احکام ہیں کہ اگر کوئی تعصب سے پاک ہو کر اِن پر غور کرے تو افادیت کا مُنکر ہو ہی نہیں سکتا۔

پردے کے معاملے میں بعض مسلمان قوموں نے اِس قدر تشدد سے کام لیا کہ ڈولیوں

میں بند عورتوں کی ڈولیاں بھی پردے میں سے گزارتے تھے۔ اُن سے بھی دو ہاتھ آگے وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ شادی کے بعد جب عورت ڈولی میں مَرد کے گھر آئے تو اب ڈولی میں اُس کا جنازہ ہی باہر نکلے۔ لیکن یہ سب مختلف الخیال مسلمانوں کے خودساختہ پردے تھے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اِس قِسم کا کوئی بھی پردہ عورت پر ظلم ہے اور اِس کا اثر عورتوں کی صحت، تعلیم، اخلاق اور دین سب پر پڑا ہے۔ قرآن اور حدیث ایسے کسی پردے کی طرفدار نہیں ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود آپ کی بیویاں اور بیٹیاں باہر نکلتی تھیں۔ اُن کا جنگوں پر جانا، کھیتوں وغیرہ میں کام کرنا، حاجاتِ بشریہ کو پورا کرنے کے لئے باہر نکلنا، علم سیکھنے اور سکھانے کے لئے جانا کثرت سے ثابت ہے۔

اِسلام کا ہرگز یہ حکم نہیں کہ عورتیں گھروں میں بند ہو کر بیٹھی رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں وعظ سننے کیلئے آیا کرتی تھیں، جنگوں میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، فوجیوں کو پانی پلاتی تھیں، اونٹوں پر سواری کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ وہ مَردوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سُنایا کرتی تھیں، ایک بار جنگ میں آپ نے فوج کی کمان بھی کی، عَملاً وہ آزاد تھیں، پابندی تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ گردن سے اوپر کے حصہ کو ڈھانکے رکھیں تاکہ وہ تمام رَخنے جن سے گناہوں کے دَر آنے کا اِمکان رہتا ہے، بند رہیں، وہ نقاب اوڑھ لیا کریں، گھروں میں قید رہنا اور تمام علمی اور تربیتی کاموں سے دور رکھے جانا ہرگز اِسلامی تعلیم نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ آپ صحابہ میں دوستانہ ورزشی مقابلے کروایا کرتے تھے، ایک دفعہ ایسے ہی مقابلے مسجد کے اندر ہوئے، آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اگر دیکھنا چاہو تو میرے پیچھے کھڑے ہو جاؤ، اور کندھوں کے اُوپر سے دیکھو، چنانچہ انہوں نے دیکھا، (بخاری کتاب العیدین) اسلام عورت کو فنِ حرب سے واقف رکھنا بھی

ضروری سمجھتا ہے، تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنی اور اپنے مُلک کی حفاظت کر سکے، اگر تلوار کی چمک اُس کا خون خُشک کر دیتی ہے اور تیر وتُفنگ کی بارش اُس کے حوصلوں کیلئے قاتل ثابت ہوتی ہے، یا توپوں کی گرج سے اُس کا دِل دہل جاتا ہے تو ضرورت کے وقت وہ اپنی اولاد کو بخوشی میدانِ جنگ میں نہیں بھیج سکتی، غدر کے زمانے میں جب انگریزوں کے ہمدردوں نے دیکھا کہ دہلی کے قلعہ پر توپیں ایسی نصب کی گئی ہیں کہ یہاں سے انگریز فوج پر زد پڑتی ہے تو انہوں نے بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل کو کہلوایا کہ انگریزوں سے فائدہ اُٹھانا ہے تو یہی موقعہ ہے کسی طرح توپوں کو جگہ سے ہٹوادو، زینت محل نے بادشاہ سے یہ بہانہ کر کے کہ توپوں کو دیکھ کر اُس سے ہول اُٹھنے لگتے ہیں، توپوں کو ہٹوا دیا اور نتیجہ مسلمانوں کی شکست کی صورت میں برآمد ہوا، بادشاہ جانتا تھا کہ زینت محل نازک ہے، وہ خود بھی عیش وعشرت کا دلدادہ تھا اور نازونعم میں اُس کی پرورش ہوئی تھی، ورنہ ناممکن تھا کہ ایسے اہم موقعہ پر وہ ایک عورت کی بات مان کر خود اپنی شکست کے سامان کرتا۔

لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تھا کہ آپ جب بھی کسی جنگ کے لئے روانہ ہوتے تو اپنی کسی ایک بیوی کو بھی ساتھ رکھتے، تاکہ جُرأت اور دلیری اُن کے اندر بھی پیدا ہو، چنانچہ اِسلامی احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورت ہر قِسم کے کاموں میں مَردوں کے ہاتھ بٹا سکتی ہے، اور اُس کے شریکِ حال ہو سکتی ہے، وہ مَردوں سے پڑھ سکتی ہے، اُن کی تقاریر سُن سکتی ہے، بلکہ کسی جلسہ میں ضرورت پڑنے پر اور کسی خاص موضوع پر بولنے کیلئے مَرد میسر نہ ہو تو وہ پردے میں رہتے ہوئے تقریر بھی کر سکتی ہے، اور بحث بھی کر سکتی ہے، بعض ایسے اُمور میں جن کا تعلق عورتوں سے ہو، عورت سے مشورہ کرنا ضروری ہے، ضرورتاً عورت مَرد کے ساتھ مل کر بیٹھ سکتی ہے، ایک موقعہ پر ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان لڑکی کو دیکھا

کہ پیدل جارہی ہے تو اُسے اونٹ پر اپنے پیچھے بٹھالیا، (مُسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۸۰) ہمارے ملکی اور قومی رواج کے مطابق ایسا فعل سخت ناپسندیدہ ہے، لیکن بات معیار کی ہے، شریعت کے احکام چودہ سو سال قبل ہمیں مل چکے ہیں۔ اور ہمارے آقا نے اُن احکام پر عمل کرکے دکھادیا ہے، عورتوں کی گاڑیوں میں سفر کے موقعہ پر کوئی خطرہ کا اِمکان ہو تو عورتیں شریف مَردوں کے ساتھ اُن کی گاڑیوں میں سفر کرسکتی ہیں، عورتیں سودا سلف لینے بازار جاسکتی ہیں، منع صرف یہ چیز ہے کہ وہ کُھلے منہ پھریں یا اور مَردوں کے ساتھ باہم اختلاط کریں، مِکسڈ پارٹیوں میں جہاں مَرد بکھرے یا اکٹھے ہوں، شامل ہونا اور مَردوں کے ساتھ بے تکلفی سے غیر ضروری باتیں کرنا جائز نہیں ہے، شعروشاعری یا گیت گاکر مَردوں کو سُنانا بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا لغو فعل ہے اور اُس سے کوئی قومی یا معاشرتی فائدہ متصور نہیں۔ احادیث سے تو یہ بھی ثابت ہے ایک بار رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مَردوں کے سامنے حضرت عائشہؓ کے ساتھ مقابلۃً دوڑے اور وہ آگے نکل گئیں، دوسری مرتبہ پھر ایسا مقابلہ ہوا تو حضور جیت گئے، پردے کی ناروا اور ظالمانہ رسمیں جو مدتوں رائج رہیں اور اب بھی بعض قوموں یا خاندانوں میں رواج پذیر ہیں کہ ڈولی کے بغیر عورت باہر نہیں نکل سکتی۔ اگر اوڑھ لپیٹ کر نکلتی بھی ہے تو زیادہ سے زیادہ پڑوس کے کسی گھر تک جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ، اِسلامی پردے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں اور عورت پر ظلم کا نمونہ ہیں۔ اور عورت کی ذہنی بالیدگی اور علمی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ، شٹل کاگ یا گنبد نما برقعہ جس میں عورت سَر سے پاؤں تک بند ہوجاتی ہے اور جس میں آنکھوں کے آگے صرف دو سوراخ دیکھنے کیلئے بنائے جاتے ہیں، سخت کراہت آمیز اور عورت کی صحت کیلئے سخت مُضر ہے، اگر عورت کوئی چیز اٹھانا چاہے تو اُوپر سے نیچے تک پورا برقعہ ہٹانا پڑتا ہے، اُس سے بہتر چادر کا وہ طریق تھا جو برقعہ کی ایجاد سے پہلے رائج تھا، برقعہ کی عُمدہ قِسم

موجودہ کوٹ نما برقعہ ہے جس میں دو آستینیں بھی ہوتی ہیں، وہ جسم سے لپٹا ہوا بھی نہیں ہوتا اور ہاتھ بھی حرکت کرنے میں آزاد رہتے ہیں، پھر وہ برقعہ بھی ظلم کا نمونہ ہے جو کم عمر بچیوں کو پہنایا جاتا ہے، وہ اُن کی جسمانی نشوونما کے لئے ضرر رساں ہوتا ہے، جب بچیوں میں آثارِ نسائیت پیدا ہونے لگیں، اُس وقت اُنہیں برقعہ استعمال کروانا چاہئے۔

پردہ دراصل حیا کا استعارہ ہے اور مَرد وعورت دونوں کے لئے برابر کا درجہ رکھتا ہے، اِسلام نے مَرد وعورت دونوں کے لئے دائرہ عَمل کی الگ الگ تقسیم کی ہے۔ مَرد کا دائرہ عَمل گھر سے باہر ہے اور عورت کا گھر کے اندر، جس طرح طبعی تقاضے مَرد اور عورت کے یکساں ہیں، اُسی طرح طبعی ضروریات بھی دونوں کی یکساں ہیں، اُن ضروریات میں تفریح یا لازمی حاجات کے پورا کرنے کے لئے باہر نکلنا اور صحت کی بہتری کے لئے تازہ ہوا سے لُطف اندوز ہونا وغیرہ۔ جس طرح مَرد کی ضرورت ہیں، اِسی طرح عورت کی بھی ہیں، مَرد کو عورت کے دائرہ کار میں چونکہ کوئی ایسی ضرورت لاحقِ حال نہیں ہوتی ہے جسے بشریت کا لازمہ قرار دیا جائے، اِس لئے مَرد کو عورت کے دائرہ کار میں جانے سے سختی سے روکا گیا ہے، سوائے اِس کے کہ کوئی بہت ہی اہم ضرورت درپیش ہو، ایسی صورت میں اُسے اِجازت لے کر داخل ہونے کا حُکم ہے کیونکہ اُس دائرہ کار میں مَرد کا اپنا کوئی حق نہیں ہے، لیکن مَردوں کے دائرہ عَمل میں طبعی ضرورت کے پیشِ نظر عورت کا بھی حق ہے، اِس لئے عورت کو مَرد کے دائرہ عَمل میں داخل ہونے کے لئے اجازت ضروری نہیں ہے۔ ہاں اُس کی حفاظت کے پیشِ نظر اِجازت کے مقابلہ میں اُسے پردے کا یعنی اپنی زینت کی چیزوں کو چھپانے کا حُکم دیا گیا ہے، ورنہ جس طرح مَرد اپنے دائرہ عَمل میں کُھلا رہتا اور پھرتا ہے، اُسی طرح عورت بھی اپنے خصوصی دائرہ عَمل میں کُھلی رہتی ہے اور اُس پر کوئی پابندی نہیں ہے، یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کا چہرہ زینت میں شامل ہے

یا نہیں۔یعنی اُس کا چھپانا ضروری ہے یا نہیں؟ اِس بات کے پرکھنے کا عمدہ اور بہترین طریق یہی ہے کہ دیکھا جائے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کا کیا مفہوم لیا اور آپ کی اَزواج وصحابیات نے کِس قِسم کے پردے کو پیش کیا یا کس طرح پردہ برتا؟ اور کون سا پردہ اُن کے عَمل سے ثابت ہے؟

اِس سلسلے میں وہ واقعہ یاد کیجئے جب ایک شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک بیوی کے ساتھ مدینہ کی سڑک پر سے گزر رہے تھے کہ حضور نے سامنے ایک شخص کو آتے دیکھا ،اُس شخص کا دین وایمان میں کیا مرتبہ تھا، یہ اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے تھے۔ممکن ہے وہ شکی مزاج شخص رہا ہو یا تقویٰ کے اعلیٰ مقام تک نہ پہنچا ہو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ محترمہ کا چہرے سے نقاب اُٹھوا کر اُس شخص کو دکھایا اور فرمایا کہ دیکھو یہ میری بیوی صفیہؓ ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص پردے کے حُکم کے نازل ہونے سے پہلے حضرت صفیہؓ کو جانتا ہوگا۔ کیونکہ پردہ کا حُکم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے چھ سات سال بعد نازل ہوا تھا۔

ایک اور واقعہ بھی احادیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک رشتہ کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمِّ سلیمؓ ایک صحابیہ کو بھجوایا تھا کہ وہ دیکھ آئیں کہ لڑکی کا ناک نقشہ اور رنگ کیسا ہے۔(مُسند احمد حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۳۱) تیسرا مشہور واقعہ سب کو معلوم ہے کہ ایک نوجوان جس کا رشتہ ایک جگہ طے پاچکا تھا،لڑکی کے گھر پہنچا اور لڑکی کے باپ سے درخواست گزار ہوا کہ اب رشتہ پکا ہو ہی چکا ہے، میری ایک خواہش ہے کہ مَیں ایک نظر لڑکی کو خود بھی دیکھ لوں ،لڑکی کے باپ نے فرطِ غیرت سے لڑکی کو دکھانے سے اِنکار کردیا۔ وہ نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور سارا واقعہ کہہ سنایا اور حضور سے سفارش کی التجا کی۔حضور نے اُس

نوجوان سے کہ کہا کہ تم دوبارہ اُس لڑکی کے والد کے پاس جاؤ اور میرا حوالہ دے کر کہو کہ اِس امر میں کوئی حرج نہیں۔ وہ اپنی لڑکی کو ایک بار تمہارے رُوبرو کردے۔ جب یہ نوجوان حضور کی سفارش لے کر وہاں پہنچا تو تب بھی اُس شخص نے یہ کہہ کر کہ مَیں کوئی بے غیرت آدمی نہیں ہوں، اپنی بیٹی کو دکھانے سے اِنکار کر دیا۔ اُس شخص کا ایمان ابھی کمزور تھا، ورنہ کوئی مؤمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو رد کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اُس کی لڑکی گھر کے اندر سے یہ ساری گفتگو سُن رہی تھی۔ وہ خود برہنہ سَر اور کُھلے چہرے سے باہر نکل آئی، اور اُس نوجوان سے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی ہے تو پھر میرے باپ کا حق نہیں رہتا کہ وہ انکار کرے۔ لو مَیں تمہارے سامنے ہوں۔ مجھے دیکھ لو۔ نوجوان نے یہ کہہ کر نظریں نیچی کرلیں کہ تمہارے اِس ایمانی مظاہرہ کے بعد مجھے اب دیکھنے کی خواہش نہیں رہی۔ اِن تینوں واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں چہرہ زینت میں شامل سمجھا جاتا تھا اور اُسے چھپایا جاتا تھا۔

بعض لوگوں کا یہ استدلال کہ عورت پردے میں رہ کر صحت خراب کر لیتی ہے، تجربہ سے غلط ثابت ہو چکا ہے، صحیح اسلامی پردہ صحت میں کوئی خرابی پیدا نہیں کرسکتا۔ اِسلام کے ابتدائی زمانے میں عورت پردہ میں رہ کر بھی جنگوں میں حصہ لیتی تھی اور کبھی دشمن کو مار بھی لیتی تھی۔ تعلیم یافتہ عورتیں اگر باوقار پردہ کی پابندی کریں تو اُن کی تبلیغ اور توجہ دلانے سے تمام بے پردہ عورتیں، پردے کی اہمیت کو سمجھنے لگیں گی اور پابندی کریں گی۔ کیونکہ یہ بات اگر مَرد انہیں سمجھائے تو مُشکل سے سمجھ آتی ہے۔

لیکن یہی بات ایک باپردہ خاتون انہیں سمجھائے اور بتائے کہ دیکھو پردے کے باوجود مَیں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے، گھر اور بازار کی ذمہ داریوں کی بھی مَیں اہل ہوں اور

بچوں کی تربیت، اُن کی تعلیم اور اسکول کی نگرانی وغیرہ میں بھی آسانی سے کام کرلیتی ہوں سو دوسری بے پردہ عورت اِس بات کی اہمیت کو جلد سمجھ جاتی ہے۔ ورنہ مَردوں کو یہی جواب ملتا ہے کہ تم آزاد پھرتے ہو، تمہیں کیا پتہ کہ پردے کی کیا تکالیف ہیں؟ لیکن یہ جواب ایک عورت دوسری باپردہ عورت کو نہیں دے سکتی۔

(16)

تُو تنہا داری

حُسنِ یوسف ، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضاداری

آنچہ خوباں ہمہ دارند ، تو تنہا داری

یوسف کا حُسن، عیسیٰ کی سانس جو وہ کسی کے مُردہ جسم میں پھونک دیتے، تو وہ زندہ ہو کر اُٹھ جاتا تھا اور موسیٰ کا ہاتھ کہ وہ اپنے جسم سے گزار کر بغل میں داب لیتے اور باہر نکالتے تو وہ اللہ کے فضل سے روشن اور نورانی بن جاتا تھا، یہ تمام معجزے ایک کمال رکھتے تھے اور دنیا کا کوئی دوسرا شخص اُن کی نقل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب آج بھی یادگار ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، گو کہ یہ سب کام اور مُعجز نمائی اللہ کے خاص بندوں کی تھیں اور اُنہوں نے اللہ کے فضل سے اُن کو سرزد کیا تھا، لیکن اے اللہ کے رسول ! تو اکیلا اور تنہا ہے جو خود سے یہ سب کر دکھائے اور یہ سب کام، خوبیاں، کمالات اور معجزے تو نے اللہ کے فضل سے اکیلے ہی کر دکھائے اور کوئی دوسرا تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ صرف تیرے ہی کارہائے نمایاں ہیں۔ وہ تمام خوبیاں اور کمالات تیرے وجود سے وابستہ ہیں۔ یہ شعر تلمیح کا ہے، تلمیح کے معنیٰ اُردو اور فارسی شاعری (عِلمِ عروض) میں اشارہ کرنے کے ہیں۔ یہاں تین باکمال انبیاء کی طرف اشارہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار گزرے ہوئے انبیاء کے مجموعی کمالات اور خوبیوں کا جو حجم ہے، جو وزن ہے، اور اُن سب کی خداداد نعمتوں کا علیحدہ علیحدہ پیش کردہ خزینہ ہے لیکن اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اکیلا اور تنہا باکمال وہ شخصیت ہے جس نے اُن تمام رحمتوں، برکتوں اور نُعماء کو اپنی ذات

میں اکیلے ہی جمع کر کے دکھا دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلَائِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً۔(الاحزاب:۵۷)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ط اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ط

ایک وقت ایسا بھی دنیا پر آیا کہ جب انسانیت اپنی گمراہی، بدنصیبی اور بے جائیگی کی آخری حدوں کو چھور ہی تھی اور دنیا میں شجر و حجر کی تکریم کے لئے انسان کا خون نہایت ارزاں اور سستا ہو چکا تھا۔آداب و اخلاق ایک کھوئی ہوئی چیز بن چکے تھے کہ وہ خیر مجسم دنیا میں آیا جس نے انسانیت کے کھوئے ہوئے اوزان اور پیمانوں کو وقار اور عظمت بخشی، مُردہ انسانیت کو زندہ کیا اور شجاعت اور شرم و حیا کو اور صِدق وصفا کے پاکیزہ معیاروں کو بلند و بالا اُفق تک پہنچا دیا۔غلاموں،قیدیوں اور آزادی کے طالب انسانوں کو آداب و اخلاق سکھائے۔امن و آماں،خودداری، پاکیزگی اور عزتوں کی پاسداری کا سبق پڑھایا، جاہلی عصبیت کے بُت کو پاش پاش کر کے عزتِ نفس کو بلند کیا۔شرافت،عظمت اور علوئے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی پہچان کروائی، بتایا کہ انسانیت ہی سب سے بڑی قدر ہے۔انسانیت کے کھوئے ہوئے اقدار کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس کیا اور گُم شدہ عظمت انسانیت کو بحال کیا۔توہمات، روایات اور معتقدات اِس قدر طاقتور اور قدر آور ہو چکے تھے کہ انسان کا قد بہت کم پڑ چکا تھا۔نسل اور قومیت کے معیار اتنے پنپ چکے تھے کہ انہیں شکست سے دو، چار کرنا مُحال ہو چکا تھا۔آپ نے سکھایا کہ اصل معیار انسانیت کا طہارت، پاکیزگی اور تقویٰ ہے۔اونچ نیچ،غرور و تکبر، پامال شدہ حقیقتیں ہیں۔

انسانیت کی قدآوری اُس کی عاجزی، انکساری اور فروتنی میں ہے۔ یہی انکساری اور سادگی تھی جس نے آپ کو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے سُرخروئی، فتحمندی اور مقبولیت عطا کی، ہر شان اور فتح کو آپ نے اپنے خدا کا احسان اور ہر شکست اور ہزیمت کو آپ نے اپنی کمزوری اور غلط حکمتِ عملی پر محمول کیا لیکن اِس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے آپ کے وسیع ترین دامن کو رحمتِ عالیہ سے پُر کر کے آپ کو **رحمت اللعٰلمین** بنا دیا، یعنی اللہ تعالیٰ جیسا کہ **رب العٰلمین** ہے، آپ کو تمام جہانوں کیلئے خیرِ مجسم و رحمتِ مجسم بنا دیا۔

فتح مکہ سے قبل بعض ایسے مجرموں کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا کہ اُنہیں جیسے دیکھو، قتل کر دو۔ یہ فیصلہ اُن بھیانک حملوں، بہیمانہ جرموں اور سفاکانہ ظلموں اور بربریت کے مقابل تھا جو اُن سے سرزد ہو چکے تھے۔ لیکن جب وہ سامنے آئے اور آپ سے عفو و درگذر کی درخواست کی تو آپ کی بے پایاں رحمت کے سمندر نے جوش مارا اور آپ کے عفو اور چشم پوشی کی وسیع چادر نے اُنہیں ڈھانپ لیا۔

عبدالعزیٰ بن خطل:۔

فتح مکہ سے کچھ قبل مدینہ آیا اور اِسلام قبول کر لیا، حضورؐ نے اُس کا نام عبداللہ رکھ دیا۔ وہ کچھ دِن مدینہ میں رہا، چند دنوں بعد آپ نے اُسے مدینہ کی چند نواحی بستیوں میں بھجوایا کہ وہ وہاں سے مالیہ وصول کر کے لائے، آپ نے مدینہ سے ایک انصاری نوجوان کو بھی مددگار کے طور پر ساتھ کر دیا۔ اُس نے راستے میں اُس نوجوان کو قتل کر دیا اور مُرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ مکہ جا کر اُس نے اسلام اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجویہ شاعری شروع کر دی۔ اُس کی دو داشتائیں بھی تھیں، وہ اُس کی ہجویہ شاعری کو گلی و بازار میں گا گا کر سنایا کرتیں اور اِس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کا مضحکہ اُڑایا کرتیں۔ فتح

مکہ کے موقعہ پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں آمد کا اُسے عِلم ہوا تو وہ فوجی لباس میں ملبوس ہو کر ایک گھوڑے پر سوار ہوا، اور اِس ارادے سے آپ کی طرف بڑھا کہ وہ آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دے گا۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ آپ اکیلے نہیں ہیں بلکہ دس ہزار قدوسیوں کی ایک فوج بھی آپ کے ہمراہ ہے تو وہ خوف زدہ واپس لوٹا اور خانہ کعبہ میں داخل ہو کر ایک پردہ کی آڑ میں چھپ گیا، بجائے اِس کے کہ وہ متذکرہ انصاری نوجوان کے قتل پر شرمندہ ہوتا یا حضور سے معافی مانگتا اِس بات پر دلیر تھا کہ اب وہ حرم کعبہ کی پناہ میں ہے، اور کوئی اُسے ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ جب حضورؐ کو اُس کے بارے میں عِلم ہوا تو فرمایا کہ خانہ کعبہ کسی گناہ گار کو نہ پناہ دیتا ہے اور نہ کسی واجب شدہ سزا کے نفوذ میں رُکاوٹ بنتا ہے۔ چنانچہ اُسے اُسی جگہ قتل کر دیا گیا۔ اُس کی دو داشتائیں ارنب اور امِ سعد (سارّہ) بھی تھیں، اُن کا جُرم بھی قابلِ معافی نہ تھا۔ خطل کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک تھیں۔ اُن میں سے ایک قتل ہوئی تو دوسری کہیں روپوش ہوگئی، بعد میں وہ حضورؐ سے امان کی طالب ہوئی تو آپ نے اُسے معافی دے دی۔ حضورؐ کے سلوک پر وہ مسلمان ہوگئی۔

عبداللہ بن سعد ابی سرح:۔

یہ ایک مسلمان شخص اور حضرت عثمانؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب وحی تھا۔ بدقسمتی سے اُسے ٹھوکر لگی اور وہ مُرتد ہوگیا۔ اُس کی تفصیل یہ ہے کہ سورۃ المؤمنون نازل ہو رہی تھی اور یہ وحی کو لکھ رہا تھا۔ اِس سورۃ کی ابتدائی آیات میں انسان کی روحانی اور جسمانی تخلیق کے مدارج کا تفصیلی ذکر ہے اور پھر ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَر ہے۔ جب وہ ابتدائی آیات لکھ چکا تو تکبیر خود بخود زبان پر آجاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، عبداللہ بن سعد ابی سرح کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ وارد ہوئے کہ "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ

اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ ‘‘(المؤمنون:۱۵) حضورؐ نے فرمایا کہ یہی الفاظ ہیں اِنہیں لکھ لو۔ خود اُس کے دل میں یہ گمراہ کُن خیال دوڑ گیا کہ میرے مُنہ پر جو الفاظ وارد ہوئے ہیں، اُنہی کو حضور نے وحی قرار دے دیا۔ اُسے خیال آیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں ہی قرآن بنا رہے ہیں۔ چنانچہ اُسے ٹھوکر لگی اور وہ مُرتد ہو گیا۔ یہ بھی اُن لوگوں میں سے تھا جن پر سزا واجب ہو چکی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اسلام کو خود تجربہ کر چکا تھا اور اسلام کی تاثیرات کا خود شاہد تھا۔ پھر بھی مُرتد ہو چکا تھا، اُن لوگوں کی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کُفار کے ہاتھ میں آلہ کار بن جاتے ہیں، اور قرآنی اصطلاح میں ’’یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا‘‘ (سورۃ المائدۃ:۳۴) کہ وہ زمین میں فساد برپا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں اور اللہ کے رسول سے جنگ کرنے والے قرار پاتے ہیں۔

ایسے مُحارب کی سزا قرآنِ مجید میں قتل قرار دی گئی ہے، جب اُسے اپنے خلاف حضورؐ کے فیصلے کا عِلم ہوا تو دوڑا دوڑا حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا اور امان کا طالب ہوا، جب حضرت عثمانؓ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا تو حضرت عثمانؓ نے اُس کی دوبارہ بیعت لینے کی درخواست کی۔ حضور نے بیعت لینے میں توقف سے کام لیا۔ جب حضرت عثمانؓ نے کہا کہ حضور اِسے معافی دے دیں اور اِس کی بیعت لے لیں، حضور نے پھر توقف سے کام لیا تو دو تین بار اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود صحابہ سے آپ نے پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص نہیں تھا جو میرے توقف پر اُٹھتا اور اُسے قتل کر دیتا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے دِل کا حال نہیں جانتے تھے، آپ نے آنکھ سے اشارہ ہی کر دیا ہوتا، آپ نے فرمایا کہ نبی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ آنکھ کی خیانت کرے، اُس کے توبہ کرنے کے بعد آپ نے اُس کی بیعت لے لی، عبداللہ بن سعد پھر ہمیشہ اسلام پر قائم رہا۔

عِکرمہ بن ابوجہل:۔

اُن مجرموں میں ایک عِکرمہ بن ابوجہل بھی تھا، جو اپنی جان کے خوف سے بھاگ کر حبشہ جانا چاہتا تھا۔ اُس کی بیوی نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنے شوہر کے بارے میں کہا کہ حضور اُسے بھی معاف فرما دیں، آپ کے بے پایاں اور بے کنار رحم نے اُسے بھی معافی دے دی۔ یہ نوید پا کر وہ اپنے شوہر کو ڈھونڈتی ہوئی ینبوع پہونچی۔ وہ کشتی پر بیٹھا سفر کے لئے تیار تھا کہ اُس کی بیوی نے اُسے اُتار لیا اور خوشخبری دی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے معاف کر دیا ہے۔ عِکرمہ نے اپنا سفر ملتوی کر دیا اور اپنی بیوی کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑا۔ اُس کی بیوی نے اُس سے کہا کہ ایسے رحیم و کریم انسان کو چھوڑ کر تم کہاں جا رہے تھے؟ عِکرمہ نے پوچھا کیا میری بے شمار گالیوں اور بے حساب خطاؤں کو انہوں نے معاف کر دیا ہے؟ اُس کی بیوی نے کہا مَیں نے اُن سے عہد لے لیا ہے، اب تم سے کوئی باز پُرس نہیں ہوگی۔ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے حاضر ہوا اور کہا کہ میری بیوی کہتی ہے کہ آپ نے مجھے بالکل معاف کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ بالکل سچ کہتی ہے، عِکرمہ نے کہا کہ جو شخص اپنے شدید دشمن کو معاف کر سکتا ہے، وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اور سر جھکا کر شرم کے مارے خاموش کھڑا ہو گیا۔ حضور نے اُس کی حالتِ حیا دیکھ کر اُس کی تسلی کے لئے فرمایا۔ عِکرمہ ہم نے تمہیں معاف ہی نہیں کیا بلکہ ایک بات یہ بھی ہے کہ آج تم مجھ سے کوئی ایسی چیز مانگو جس کی دینے کی مجھے طاقت ہو تو وہ بھی تم کو دے دوں، عِکرمہ نے کہا، یا رسول اللہ میری اِس سے زیادہ کیا خواہش ہو سکتی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ مَیں نے آپ سے جو دشمنیاں کی ہیں وہ مجھے معاف کر دے۔ حضور نے اُس کے لئے اُسی وقت دعا کی کہ اِس نے جو دشمنیاں

میرے ساتھ کی ہیں اِسے معاف کر دے اور جو گالیاں اُس نے مجھے دی ہیں وہ بھی بخش دی جائیں۔ پھر آپ نے اپنی چادر اُتار کر اُس پر ڈال دی، اور فرمایا جو شخص ایسی حالت میں ہمارے پاس آئے کہ ایمان رکھتا ہو تو ہمارا گھر اُس کا گھر ہے اور ہماری جگہ اُس کی جگہ ہے، عِکرمہ کے ایمان لانے سے آپ کی وہ پیشگوئی بھی پوری ہوئی کہ کئی سال پہلے آپ نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ مَیں جنت میں ہوں اور وہاں ایک انگور کا خوشہ ہے، مَیں نے وہاں لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہے تو کسی نے جواب دیا کہ ''ابوجہل کے لئے ہے'' یہ بات آپ کو عجیب لگی تھی کہ جنت میں تو صرف مؤمن جائیں گے، پھر خوشہ انگور ابوجہل کے لئے کیونکر ہوا۔ اب عِکرمہ کے ایمان لانے سے معلوم ہوا کہ وہ خوشۂ انگور عِکرمہ تھا۔

ھبار بن اسود:۔

ہبار وہ شخص تھا جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا اور مسلمانوں پر تشدد کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ حضرت زینب بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حملہ کیا تھا۔ ۲ھ میں جب زینب کے شوہر ابوالعاص نے ایک وعدہ کی تعمیل میں زینب کو مدینہ بھجوانا چاہا تو ہبار اور اُس کا گروہ اُن پر حملہ آور ہوا۔ اُس دہشت سے اُن کا حمل ساقط ہو گیا تھا، اُس دہشت کا اثر چھ سال رہا، ۸ ہجری میں اُسی دہشت کے اثر سے وہ انتقال فرما گئیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر اسلام اجازت دیتا تو مَیں ہبار کو زندہ جلوا دیتا۔ اُس نے جب اپنے بارے میں سُنا تو فارس بھاگ گیا۔ بعد میں موقعہ پا کر وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مَیں فارس بھاگ گیا تھا، جب وہاں پہونچا تو خیال آیا کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے شرکیہ عقائد کو دور کر دیا ہے تو مَیں آپ سے بھاگ کر کیوں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھروں اور کیوں نہ واپس جا کر آپ سے معافی کی درخواست کروں۔ ہبار کے خلاف جو قتل کا حکم تھا وہ اِس

لئے نہیں تھا کہ اُس نے حضرت زینب کے خلاف سخت زیادتی سے کام لیا تھا، بلکہ آپ کا دُکھ اور اَندوہ بھرا شدید ردِّ عمل، عورت پر ظلم اور بربریت کے مقابلے میں اور اُس کی روک تھام کیلئے تھا، ہبار دراصل مسلمانوں کے خلاف ظلم اور تعدی میں کئی اور مواقع پر بھی مُلوّث تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے دِل کو کھول دیا ہے، اور اُس میں اسلام کی محبت کو داخل کر دیا ہے تو پھر مَیں تمہارے گناہوں اور شرارتوں کو کیوں نہ معاف کر دوں، جاؤ! مَیں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور اِسلام نے تمہارے سارے قصور مٹا دئے ہیں۔

حارث بن نُفَیل:۔

بعض واقعات میں اِس کا نام حویرث بن نفیذ بھی آتا ہے۔ یہ شخص حضور کو ایذا دینے میں سخت حریص تھا اور ہبار اُسود کے ساتھیوں میں سے تھا، حضرت زینب پر حملہ کے دوران بھی یہ ساتھ تھا، اُس نے اِم کلثومؓ اور فاطمہؓ پر بھی حملہ کیا تھا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کئی بار حملہ آور ہو چکا تھا بلکہ اذیت دے چکا تھا اور آپ کی شان میں ہجو یہ اشعار پڑھا کرتا تھا اور لوگوں کو اسلام کے خلاف انگیخت کرتا رہتا تھا، قبل اِس کے کہ وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتا اور معافی مانگتا وہ کسی جگہ حضرت علیؓ کے سامنے آ گیا اور آپ نے اُسے قتل کر دیا۔

مقیس بن صبابه:۔

ایک غزوہ میں مقیس بن صبابہ کے بھائی حضرت ہشام بن صبابہ کو ایک انصاری نے غلطی سے دشمن سمجھ کر شہید کر دیا تھا۔ مقیس بن صبابہ نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دیت دلا دی تھی، اُس کے باوجود اُس نے اُس انصاری کو قتل کر دیا اور مُرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی محاربت کی وجہ سے اُسے بھی واجب القتل قرار دیا تھا۔ چنانچہ ثمیلہ بن عبداللہ نے ایک دِن اُسے بازار میں دیکھ لیا اور قتل کر دیا۔

وحشی بن حرب:۔

واجب القتل لوگوں میں اُس کا نام بھی تھا۔ وہ ایک غلام تھا اور جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف کفار کے ساتھ لڑائی میں شریک تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کے قتل کا موجب ہوا تھا۔ حضرت حمزہؓ حضورؐ کے رضائی بھائی تھے، فتح مکہّ کے وقت وہ بھاگ کر طائف چلا گیا تھا۔ طائف کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معافی کا خواستگار ہوکر آیا تو وحشی بھی اُس وفد میں شامل تھا۔ آپ نے اُس کی خواہش پر اُسے بھی معاف کردیا اور کہا کہ جب تک وہ زندہ رہے حضور کے سامنے نہ آئے۔ وہ مسلمان ہوگیا اور اِرادہ باندھ لیا کہ وہ حضرت حمزہؓ کے قصاص میں اِسلام کے کسی بڑے دشمن کو قتل کرے گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب مُسیلمہ کذّاب سے جنگ ہوئی تو اُس کے قتل میں وحشی کا نام بھی آتا ہے۔

صفوان بن اُمیہّ:۔

یہ وہ شخص تھا جس کا باپ اُمیہّ بن خلف حضرت بلالؓ کا مالک تھا اور اُن پر عرصہ حیات تنگ کئے ہوئے تھا، صفوان خود بھی مکہ کا ایک لیڈر تھا، گو کہ اُس کا نام واجب القتل لوگوں میں شامل نہیں تھا، تاہم وہ خوف زدہ تھا کہ اُسے بھی قتل کیا جائے گا۔ مکہّ میں داخلہ کے وقت، خالد بن ولید کے دستہ کے لوگ مقابل ہوئے تو اُن میں عِکرمہ کے ساتھ صفوان بھی شامل تھا اور اب تک مسلمان نہیں ہوا تھا، فتح مکہّ کے بعد طائف کی طرف حضورؐ نے ایک دستہ فوج کو بھجوایا تھا تو حضور نے صفوان سے بھی کچھ سامانِ حرب مستعار مانگا تھا۔ اُس نے پوچھا کہ کیا آپ اپنے غلبہ کے زُعم میں میرا کچھ سامان چھیننا چاہتے ہیں، حضور نے فرمایا۔ ''یہ تو مُستعار ہے، جو واپسی پر آپ کو لوٹا دیا جائے گا''۔ چنانچہ طائف سے واپسی پر سارا سامان اُسے لوٹا دیا گیا بلکہ سو اونٹ

اُسے انعام بھی دئے، گوکہ صفوان اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا، طائف اور حُنین کی جنگوں میں مسلمانوں کے سامان کے ساتھ صفوان کا سامان بھی شامل تھا اور وہ خود بھی۔ حضرت عُمیر بن وہب نے اُس کی سفارش کی تھی اور خود اُسے ترغیب بھی دی تھی اور حضور سے اُس کے لئے دو ماہ مہلت بھی مانگی تھی۔ حضور نے اُس کو چار ماہ کی مُہلت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اسلام کا قبول کرنا تمہارے لئے شرط نہیں ہے، تم مکہّ میں آزادی کے ساتھ رہ سکتے ہو، طائف سے واپسی پر مالِ غنیمت سے فراغت کے بعد اُس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

اُس دن بعض اکابرین اور رؤساء جنہوں نے اسلام قبول کیا، اُن کے نام یہ ہیں حکیم بن حزام، بدیل بن ورقا، ابوسفیان، عتّاب بن اسعد، حارث بن ہشام، ابوقحافہ، ابولہب کے بیٹے عتبہ اور مُعتب، ہندہ زوجہ ابوسفیان جو حضرت معاویہؓ کی والدہ تھیں اور فضالہ بن عُمیر وغیرہ۔

عُتبہ اور مُعَتّب:۔

حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباسؓ سے پوچھا کہ آپ کے دو بھتیجے ہوا کرتے تھے، وہ کہاں ہیں، اُنہیں بھی بلا کر مجھ سے ملائیں، حضرت عباسؓ گئے اور دونوں کو اسلام کا پیغام دیا۔ یہ دونوں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے بیٹے تھے، دونوں نے لبیک کہا اور فوری اسلام قبول کرلیا۔ پھر وہ دونوں حضرت عباسؓ کے ہمراہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اُن کے اسلام قبول کرنے کا سُن کر آپ کو بہت مُسرت ہوئی، آپ اُن دونوں کو لے کر خانہ کعبہ کے پاس مُلتزم پر لے گئے، مُلتزم وہ جگہ ہے جو حجرِ اُسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان واقع ہے، وہاں اُن کے لئے دعا کی، اور فرمایا کہ مَیں نے اِن دونوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ اِن دونوں کو مجھے دے دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِن دونوں کو مجھے دیدیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اِن دونوں نے غزوۂ

حنین اور طائف میں آپ کا ساتھ دیا اور پوری ثابت قدمی کے ساتھ برسرِ پیکار رہے، اُن دونوں نے مُستقل طور پر مکہّ میں ہی رہنے کا ارادہ کرلیا۔

فِضالہ بن عُمیر:۔

یہ وہ شخص تھا جس کا سینہ ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کینہ وبغض سے بھرا ہوا تھا اور وہ موقعہ کی تلاش میں تھا اور آپ کے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا تھا اور آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ جب آپ خانہ کعبہ کی طواف کی تیاری کررہے تھے کہ وہ آپ کے تعاقب میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اُس کے ارادوں کی آپ کو خبر دیدی۔ آپ نے پلٹ کر اُس کا نام لے کر اپنے قریب بُلایا، آپ کی دونوں آنکھوں کے جگنو دمک اُٹھے، آپ نے وقار کے ساتھ پوچھا، یہاں کیا کررہے ہو اور اب کیا ارادہ ہے، وہ بوکھلا اُٹھا، آپ نے اُسے اپنے قریب بلایا اور اُسکے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ جیسے ہی حضور نے اُس کے سینہ کو چھوا، اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے سینہ میں جو کچھ بغض وعناد اور جو کچھ حضور کے لئے منفی خیالات اور فاسد محسوسات تھے، تحلیل ہوتے جارہے ہیں اور اُس کے مقابلے میں حضور کے ساتھ اُس کی محبت اور اخلاص میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اُس انقلابی کیفیت سے ضد اور شرمندگی کا جو پسینہ پھوٹا، گویا کہ بقولِ شاعر؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مِرے عرقِ انفعال کے

۞۞۞

۲۲/اگست: ۲۰۱۳ء،

نزیل بمقام میری لینڈ، امریکہ

(17)

برکاتِ خلافت

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے۔وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔(النور:56)

ترجمہ:اور جو دین اُس نے ان کیلئے پسند کیا ہے، وہ ان کے لئے اُسے مضبوطی سے قائم کردے گا اور ان کے خوف کی حالت کے بعد وہ اُن کیلئے امن کی حالت تبدیل کردے گا۔

دراصل قوموں کی احیاء وبقا،نشونما اور خوشحالی کا راز،ان کی مضبوط مرکزی تنظیم اور ان کا غیر متزلزل یقین اور ان کے باہمت لیڈر کی قیادت میں مضمر ہے۔بہترین نظام وہ ہے جس کی بنیاد خود خدا تعالیٰ نے رکھی ہے۔اسلام نے ایسے نظام کو خلافت کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ جو مسلمانوں کے اتحاد کا واحد ذریعہ اور حِصار ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ان کا نقشہ مولانا عبدالکریم صاحب یوں کھینچتے ہیں۔

''مختلف قبیلے اور مختلف گروہ زکوٰۃ کے تارِک اور منکر ہوگئے۔ایک طرف مسیلمہ کذّاب نے رسالت کا دعویٰ کیا تھا۔لاکھ سے زیادہ جمعیت فراہم کرلی تھی۔دوسری طرف ایک عورت سجاح نامی نے بھی نبوت کا دعویٰ کرکے بہت سی فوج جمع کرلی تھی۔اُدھر اَسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔اُس کے ساتھ بھی بہت سی فوج تھی۔مُنافقوں کا بڑا بھاری گروہ الگ موجود تھا۔غرض ایک نہایت خطرناک اور پُرآشوب وقت تھا۔ایسے خطرناک اور جان جوکھم کے وقت میں کس نے پھر اسلام کو زندہ کیا۔جس مِشن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳

سال میں پورا کیا، اُس کو کس نے تباہی سے بچایا؟ کوئی تاریخ انکار نہیں کرسکتی کہ ایسے زلزلہ ڈالنے والے زمانے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جان توڑ کوششوں نے پھر اسلام کو زندہ کیا۔اُن ہی کے ابرِ فیض نے ملّت کے خشک ہونے والے درخت کو سیراب اور شاداب کیا''۔

موجودہ دور میں پھر خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وِصال کے بعد اپنے وعدہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (النور: 56) یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنھیں ضرور اس زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں میں خلیفہ بنایا تھا۔

اُوپر کے وعدے کے مطابق خلافت کو منہاجِ نبوت پر قائم فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر مُہر ثبت فرمائی۔قرونِ اُولیٰ کے بعد مسلمان، خلافت جیسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہونے کے باعث رفتہ رفتہ قعرِ مذلت میں جا گرے اور ایسے گرے کہ خود اُٹھنے کی طاقت باقی نہ رہی جیسا کہ علامہ اقبالؔ نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ ع

تا خلافت کی بناء دنیا میں ہو پھر سے اُستوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

ہر احمدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان پر ایمان رکھتا ہے کہ اَلْاِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَّرَائِهٖ۔امام یعنی خلیفہ ڈھال ہے جس کے پیچھے رہ کر (مومن) لڑائی لڑتا ہے۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ خلافت کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''پس مبارک ہیں وہ افراد جو ہمیشہ دامنِ خلافت سے وابستہ رہ کر غلبہ اسلام کی عظیم مُہم میں حسبِ توفیق حصہ پاتے ہیں۔'' (الحکم:۷/مارچ/۱۹۱۴ء)

آج جماعتِ احمدیہ تبلیغِ اسلام کا وہ مقدس فریضہ سرانجام دے رہی ہے جو دنیا کی کوئی بھی حکومت نہ کرسکی۔اور آج ہر احمدی دوست جو خلافت سے وابستہ ہے بڑی سربلندی سے یہ اعلان کرسکتا ہے کہ آج ہمارے اعمال سے اکنافِ عالم میں ڈنکا بج رہا ہے اور ہر احمدی کا دل و جان آستانہءِ اُلوہیت پر سجدہ ریز اور اس کے احسانات سے جذباتِ شکر سے لبریز ہے۔

قارئینِ کرام! ذرا غور کریں کہ امیرِ شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری کتنی حسرتوں کے ساتھ اِس جہاں سے گزر گیا،لیکن احمدیت کا قافلہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ خلیفہ وقت کی قیادت میں کامیابی اور کامرانی کی شاہِ راہ پر گامزن ہے۔اور دِن دُگنی اور رات چَوگنی ترقی کر رہا ہے۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ملائکہ سے فیوض حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ خلفاء سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا جائے اور ان کی اطاعت کی جائے....تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نئے دل ملیں گے جن میں سکینت کا نزول ہوگا اور خدا تعالیٰ کے ملائکہ ان دلوں کو اُٹھائے ہوئے ہوں گے....تعلق پیدا کرنے کے نتیجہ میں تم میں ایک تغیرِ عظیم واقع ہوجائے گا،تمہاری ہمتیں بلند ہوجائیں گی ،تمہارے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوجائے گا ملائکہ تمہاری تائید کے لئے کھڑے ہوجائیں گے اور تمہارے دلوں میں استقامت اور قربانی کی روح پھونکتے رہیں گے۔پس سچے خلفاء سے تعلق رکھنا ملائکہ سے تعلق پیدا کردیتا ہے اور انسان کو انوارِ الٰہیہ کا مہبط بنادیتا ہے۔''

(خلافت علیٰ منہاج النبوۃ: جلد 3 صفحہ 392)

پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ جماعت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

’’اے عزیز بھائیو! جو مقاماتِ قرب تمہیں عطا ہیں، اگر انہیں قائم رکھنا چاہتے ہو اور روحانیت میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو خلیفہ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔ کیونکہ اگر یہ دامن چھوٹا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن بھی چھوٹ جائے گا‘‘

(الفضل ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

سچ ہے کہ ؎

نہ جب تک کارواں میں ہو اِمامِ کارواں کوئی
نہیں ہوتا کسی کا اِس جہاں میں پاسباں کوئی

(18)

خلافت کی برکات

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ○ (النور:56)

ترجمہ:۔تم میں سے جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے، اُن سے اللہ نے پختہ وعدہ کیا ہے کہ اُنہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا۔جیسا کہ اُس نے اُن سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا۔اوراُن کے دین کو جو اُس نے اُن کے لئے پسند کیا۔ضرور تمکنت عطا کرے گا۔اور ان کی خوف کی حالت کے بعد ضرور انہیں امن کی حالت سے بدل دیگا۔وہ میری عبادت کریں گے۔میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔اور جو اُس کے بعد بھی ناشکری کرے تو یہی وہ لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔

سامعینِ کرام! آج سے چودہ سوسال پہلے،سرزمینِ مکہ میں وہ جوایک واقعہ گزرا،کتنا حیرت ناک اور کیسا عجیب وغریب تھا۔مطلع عالَم پر رسالت کا سورج چڑھا کہ تمام اندھیرے پاش پاش ہوگئے اور مکہ کی زمین بقعہ نور بن گئی۔حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود، گمراہ اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی ہوئی قوم کے لئے سہارا اور ابرِ کرم بن گیا۔تمام بنجر وادیاں روحانی پانی کی یلغار سے بہہ پڑیں۔چاروں طرف جل تھل ہوگیا۔خُشک دل ودماغ،

علوم کا سرچشمہ بن گئے۔لوگوں میں آدابِ آگہی سرایت کر گئے۔لوگوں میں اخلاق ومروت اور صبر وغنا کے ایسے نظارے عام الوقوع ہونے لگے جو نہ پہلے دیکھنے کو ملتے تھے نہ سننے کو۔عرب ایک جاہل ترین قوم تھی۔کوئی برائی ایسی نہ تھی جس سے وہ مبرّا ہو۔رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا ان کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقّبہ تھی۔سینکڑوں سالوں سے وہ ایک اَن چھوئی قوم تھی، جسے انقلاب نے آزمایا نہ تھا۔اُن کا وہ حصہ جو خیر سے مملو تھا بہت تیزی سے اس حقیقت کو پہچان گیا کہ کیا کیا منفعتیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔غریب اور بے مایہ لوگوں نے آپ کا ساتھ دینا قبول کیا۔عورتوں نے آپ کی آواز میں اپنی محافظت کو محسوس کیا۔غلاموں نے آپ کے چہرے کی مسکراہٹ میں اپنی آزادی کا اعلان سنا اور نوجوانوں نے آپ کی صحبت میں اپنی امیدوں اور تمناؤں کے پھول کھلتے محسوس کئے۔اس کے مقابلہ میں اہلِ مکہ نے بھی اس خطرے کو بھانپ لیا جو اُن کی تہذیب اور رسم ورواج پر تبر رکھنے والا تھا۔اور جس میں ایک نئی زمین اور نئے آسمان کی تخلیق کا عزم پوشیدہ تھا۔عربوں کے منہ پر یہ ایک طمانچہ تھا۔وہ بھلا کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ ایک نیا فکری انقلاب اس قدر آسانی کے ساتھ اُن کے مغرُور، متکبر سماجی خیالات کو پسپا کر دے۔انہیں یہ ایک چیلنج محسوس ہوا اور انہوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا مگر اُسی ارادہ اور نیت کے ساتھ جس ارادہ اور نیت کے ساتھ شیطان نے رحمان کے چیلنج کو قبول کیا تھا۔حق اور باطل پھر صف آراء ہوئے۔اِن غریبوں اور معصوموں اور بے بسوں کی کیا مجال تھی کہ ائمۃ الکفر کے سامنے سینہ پُھلاتے۔عورتیں نہایت بے دردانہ طریق پر قتل کی جانے لگیں۔مرد نہایت بربریت کے ساتھ چیرے جانے لگے۔غلام تپتی ریت پر گھسیٹے گئے۔یہاں تک کہ اُن کی کھالیں جانوروں کی کھالوں کی طرح سخت اور بدنما ہو گئیں۔مگر یہ تمام حادثات بھی نومسلموں کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکے۔یہ خوش نصیب بلال ؓ تھے۔

صہیب ؓ تھے۔ جبیرؓ اور عمارؓ تھے۔ یاسرؓ تھے۔ سُمیہؓ تھیں۔ زنیرہؓ تھیں۔ ابوفکیہؓ تھے۔ اِن بے کسوں پر کئے جانے والے ظلم انسانی طاقت سے بالا تھے مگر اُن کے سینوں میں چھپے ہوئے ایمان بھی عام ایمان اور عقیدت سے بہت زیادہ قیمتی تھے۔ فرشتے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی نہیں، صحابہ کے دلوں پر بھی نزول فرما رہے تھے۔ ان کے اپنے انہیں چھوڑ چکے تھے، لیکن اُن کا خدا اُن کے ساتھ تھا۔ اُن کے دل خدائے واحد و یگانہ کے گھر بن چکے تھے۔ اُدھر مخالفتیں بڑھ رہی تھیں۔ اِدھر ایمان ترقی کر رہے تھے۔ ظلم کے مقابلہ میں خلوص اپنا گھیراؤ وسیع کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تمام حدوں کو پار کر کے اوپر نکل گیا۔

مخالفتیں اور سازشیں بہت تیز ہوگئیں۔ سماجی بائیکاٹ ہوئے۔ بہت سے مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ باقی مسلمان شعب ابی طالب میں قید کر دئے گئے۔ یہ عرصہ قریب قریب تین سال تک رہا۔ وہاں سے رہائی ملی تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دست راست حضرت خدیجہؓ وفات پا گئیں۔ چند دنوں بعد حضرت ابوطالب بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب زندگی بہت بوجھل ہوگئی۔ لوگوں نے مسلمانوں سے بات چیت بند کر دی۔ انہی دنوں آپ نے طائف کا سفر اختیار کیا۔ اہلِ طائف اپنی خرمستیوں اور شرارتوں میں اہلِ مکہ سے کم نہ تھے۔ اوباشوں نے پتھر برسا کر آپ کو لہولہان کر دیا۔ آپ وہاں سے ناکام لوٹے۔ اس کے بعد حج کا موسم آیا تو مدینہ کے کچھ لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسرے سال مدینہ والے جب حج پر آئے تو گزشتہ سال سے زیادہ تھے۔ اُن کی دعوت پر آپ غور فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہجرت کا حکم مل گیا۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ایک رہنما کو ہمراہ لے کر اور غارِ ثور میں پناہ لیتے ہوئے مدینہ پہنچ گئے۔

مدینہ میں آپ نے اپنی ذہانت، دلیری، چابکدستی اور غیر معمولی سیاسی بصیرت اور

فراست سے کام لے کر وہاں کے حالات کو سنبھالا۔ یہاں مکہ والوں سے آپ کی تین جنگیں بھی ہوئیں۔لیکن تیرہ سال مکہ کے اور دس سال مدینہ کے یعنی (۲۳) تیئیس سال کا یہ عرصہ اس قدر تیزی کے ساتھ گزر گیا کہ آپ کا آخری وقت قریب آ پہنچا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے بعد خلافت کی خبر دی اور بتایا کہ اَلْخِلَافَةُ ثَلَاثُوْنَ عَاماً ثُمَّ تَكُوْنُ بَعْدَ ذَالِكَ الْمَلِكُ (ابوداؤد کتاب السنن، الترمذی کتاب السنن) خلافت کا یہ دور تیس سالوں پر مشتمل ہوگا اور اس کے بعد بادشاہت شروع ہوجائے گی۔ یہ بھی بتایا کہ یہ خلافت تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۷۳)اور مزید تسلی دی کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۱۴۰) اگر تم ایمان پر قائم رہے تو فتح تمہاری ہوگی۔

اِس وعدے نے ہر میدان میں اور ہر جہت کے لحاظ سے مؤمنوں کو کامیابی بخشی۔ یا تو یہ حالت تھی کہ وصالِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف ایک دو جگہ نماز باجماعت کا اہتمام ہوتا تھا یا پھر یہ ہوا کہ خلافت راشدہ کے تیس سالوں کے اندر اندر مشرق میں افغانستان، مغرب میں طرابلس اور شمالی افریقہ کے کناروں تک، شمال میں بحر قزوین تک اور جنوب میں حبشہ تک اسلامی پرچم لہرانے لگا۔اسلام کے غلبہ کی اِس چابکدستی کو دیکھ کر دنیا کی عقلیں حیران تھیں۔ بڑے بڑے مخالف کو بھی مقابلے کا یارانہ تھا، قیصر وکسریٰ کی حکومتیں مسلمانوں کے نام سے لرزہ براندام تھیں۔آج کا مؤرخ تصویرِ حیرت ہے کہ اسلام کے اس غلبے کے پیچھے کیا جادو تھا؟ وہ نہیں جانتا کہ یہ سب خلافتِ راشدہ کا ثمرہ تھا۔حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام کے غلبے کی تاریخ خلافت کی پیروی میں مضمر تھی۔ یہ سب کچھ خلافتِ اسلامیہ سے وابستگی اور اس کی اطاعت کی برکات تھیں۔ابتدائے خلافت میں جو بھی فتنہ اٹھا، خواہ وہ منکرین زکوٰۃ کا تھا یا ارتداد کا۔منافقین نے اسلام کی شیرازہ بندی کو توڑنا اور ختم کرنا چاہا یا جھوٹی نبوت کے علمبرداروں نے پوری قوت

اور منصوبہ بندی سے اسلام کو ملیا میٹ کرنا چاہا۔لیکن اُن کے تمام عَلَم سرنگوں ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام اکنافِ عالم میں سر اٹھا کر جینے کا قابل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ کہ خلافت کے ذریعہ وہ اپنے پسندیدہ دین کو عظمت وتمکنت اور سربلندی عطا کرے گا۔ یہ ایک سچے خدا کا وعدہ تھا۔ وہ خدا جو وفا کا خوگر ہے۔ اس نے ابوبکرؓ کو وہ عزم عطا کیا جو اُن جیسے رقیق القلب شخص کے لئے ناممکن نظر آتا تھا۔ جب اُسامہ کی سرکردگی میں بھجوایا جانے والا لشکر شام کی طرف بھجوایا جانے لگا، تو حضرت عمرؓ نے بھی سفارش کی کہ اِس وقت مدینہ کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کچھ دنوں کے لئے اس لشکر کو روک لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن یہ سمجھ کر کہ مدینہ میں اب کوئی نوجوان باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اگر پرندے میرے جسم سے گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگیں اور مدینہ کے کتے گلیوں میں عورتوں کی لاشوں کو گھسیٹتے پھریں۔ تب بھی یہ لشکر نہیں روکا جائے گا اور نہ ہی اس کے سالار کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس لشکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کیا تھا اور بھجوانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ وہ لشکر روانہ ہوا اور کامیاب لوٹا۔ خلیفہ وقت کو وہ آہنی عزم وحوصلہ اور زبردست قوت وشوکت اللہ تعالیٰ کی دین تھی جس نے اُس وقت کے ہر فتنے کو زیرِ نگیں کر دیا۔ اور اسلام کو تمام قسم کے بگولوں کی زد سے محفوظ و مامون کر دیا۔ سورۃ نور کی آیتِ استخلاف کو پھر پڑھیئے کہ اللہ تعالیٰ دین کو تمکنت بخشے گا۔ خوف کی حالت امن میں تبدیل کر دی جائے گی۔ وہ مؤمن صرف میری عبادت کریں گے۔ یعنی توحید کا غلبہ ہوگا۔ شرک یکسر مِٹ جائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی غیرت کے چراغ جلائے ہیں۔ فرمایا کہ اس کے بعد بھی جو نافرمانی کریں گے اور فسق وفجور میں مبتلا ہوں گے وہ سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وعدے کا یہ بھی حصہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد بھی جو کفرانِ نعمت کرے گا بخشا نہیں جائے گا۔ جو لوگ آیتِ استخلاف اور اس کے انعامات اور سزا کو دنیوی حکومت اور بادشاہتوں پر محمول کرتے ہیں، وہ بتائیں کہ دنیوی بادشاہتوں کا انکار کیا فسق و فجور اور نافرمانی پر یا سخت سزا پر مُنتج ہوتا ہے؟

اسلام کا پھیلاؤ اور مسلمانوں کے تمام نیک کاموں میں برکت اور رحمت کے یہ نظارے محض اور محض خلافت کی برکتوں کے مظہر تھے۔ جو کچھ دین و دنیا میں مسلمانوں نے پایا صرف خلافت سے ان کی وابستگی کا نتیجہ تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سب کسی پیشگوئی کا حصہ نہیں تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا نتیجہ تھا جو آیتِ استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں اور اعمالِ صالحہ بجالانے والوں کے ساتھ کیا تھا۔ خلافت کا دیا جانا اللہ تعالیٰ کے انعام کا حصہ تھا۔ آج یہ بات بہت ہی زیادہ بلکہ اول طور پر غور طلب ہے کہ وہ نام نہاد خلافت کا سلسلہ جو ترکی میں مسلسل قائم تھا ۱۹۲۴ء میں ختم کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد بے شمار کوششیں اُس سلسلہ کو دوبارہ بحال کرنے کی ناکام ہو چکی ہیں۔ دنیا میں خلافتِ اسلامیہ کا ایک ہی سلسلہ جو ۲۷رمئی ۱۹۰۸ء کو قائم ہوا تھا آج بھی قائم ہے۔ اور صرف جماعتِ احمدیہ ہی ایک قوم ہے جو اس سے وابستہ ہے اور روز افزوں ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان اور عمل صالح بجالانے والی صرف یہی ایک جماعت ہے۔ جنہیں اسلام سے دور کرنے اور کافر کا خطاب دینے پر دنیا بھر کے مسلمان متحد ہیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ جو فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے تہتر فرقے ہو جائیں گے۔ لیکن سب جہنمی ہوں گے۔ اِن میں سے صرف ایک ہوگا جو ناجی یعنی جنتی ہوگا۔ اس کی شناخت اُس کا ایمان اور عملِ صالح میں نمایاں ہونا ہوگا۔ اے مسلمانو! کیا تم میں ایک بھی رجلِ رشید نہیں؟

خلافتِ راشدہ کے تیس سالہ دور کی رحمت کے نظارے تین سو سالوں تک اپنا زور اور

اثر دکھاتے رہے، تین سو سالوں کے بعد فیجِ اعوج کا ایک ہزار سالہ دور شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اسلام سمٹ سمٹا کر اپنے اپنے علاقوں میں محصور ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی ہزیمت اور ان کی ناکردگی اُن کے لئے شرمندگی، بے حیائی، بے علمی اور بے سروسامانی اور بے ہنری کا دور آیا اور دانشوروں نے سمجھ لیا کہ اب اسلام ختم ہوا چاہتا ہے۔ اسلام پر بے شمار مرثیے لکھ دیئے گئے۔ عیسائیت نے ایسا زور پکڑا کہ اس کے حوصلے سارے ہندوستان کو عیسائیت کے لئے فتح کرنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ عملاً بھی کئی لاکھ مسلمان عیسائیت کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مسلمان تنظیموں کی اپنی کسمپرسی اور قیادت کے فقدان کی وجہ سے مسلمان بے دست و بے پا بنا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ تیرھویں صدی کا آخر آ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو یوں یکا و تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے اپنے وعدوں اور سنت کے مطابق اپنے مسیح موعود اور مہدیٔ معہود کو مبعوث فرمایا۔ حدیث شریف کے مطابق لَا الْمَهْدِیُّ اِلَّا عِیْسٰی (ابنِ ماجہ باب شدۃ الزمان صفحہ ۲۵۷، مصری۔ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۱۵۶) یعنی مہدی اور عیسیٰ ایک ہی وجود ہیں۔ اُن کے دور کے ختم ہونے پر خلافتِ احمدیہ کا ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ (مُسند احمد بن حنبل) کا زریں اور بے پناہ طاقت ور دور شروع ہوا جس سے اسلام کے استیلاء اور غلبے کا آغاز ہوا۔ اور اُس مبارک دور نے ۲۷ رمئی ۱۹۰۸ء سے لے کر آج تک اپنی عمر کے ۱۰۹ سال مکمل کر لئے ہیں اور آج ہم پانچویں خلیفہ راشد حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے بابرکت دور سے گزر رہے ہیں۔ اسلام کے جو مرثیے لکھے گئے تھے وہ دور ختم ہوا۔ عیسائیت کے غلبے کے خیالات اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ پادری آگے آگے ہیں اور احمدی مبلغ اُن کا پیچھا کئے ہوئے ہیں۔ اسلام کے تمام ادیانِ باطلہ پر غلبہ پالینے کا مبارک وقت قریب ہے۔ تمام مفسرینِ قرآن نے

یہی لکھا تھا کہ آیت هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (الصّف:۱۰) کہ غلبہ اسلام تمام ادیانِ باطلہ پر، پورے جلال اور پوری شان کے ساتھ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے وقت میں ظہور پذیر ہوگا۔

خلافتِ احمدیہ کے بارہ میں ہمیں احادیثِ مبارکہ میں ایک معیّن حدیث ملتی ہے کہ ''حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''تم میں نبوت قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر وہ اس کو اُٹھالے گا اور خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہوگی، پھر اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اُس نعمت کو بھی اٹھالے گا۔ پھر اس تقدیر کے مطابق ایذاء رساں بادشاہت قائم ہوگی۔ پھر اُس سے بھی بڑھکر جابر بادشاہت قائم ہوگی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا رحم جوش میں آئے گا اور ظلم وستم کے اس دور کو ختم کردے گا۔ اُس کے بعد پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی۔''

(مُسند احمد صفحہ ۲۷۴، ۲۷۳، مشکوٰۃ کتاب الرقاق باب الانذار والتحذیر)

حدیث کا ایک ایک لفظ اور وعدہ اپنے اپنے وقت پر پورا ہوا۔ اور آج ہم اسلام کے سأۃِ ثانیہ کے پانچویں دور سے گزر رہے ہیں۔ اب ہم ہمارے خلیفہ حضرت امیر المؤمنین مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس کے بابرکت وجود کے زیرِ سایہ خلافت کی پناہ میں دنیا کے ۲۰۰ سے زائد ملکوں میں تبلیغِ اسلام کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ساری دنیا میں ہماری تعداد کروڑوں میں ہے۔ قرآنِ مجید کے تراجم، ہزاروں مساجد کی تعمیر، قرآنِ مجید کی منتخبہ آیات، احادیث اور اقتباسات حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے تراجم سو سے زائد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتبِ سلسلہ کی نمائش کا وسیع سلسلہ اور اشاعتِ اسلام کے لئے تگ ودَو اپنے عروج پر ہے۔ اور یہ سب کچھ خلافتِ احمدیہ کے مستحکم قلعے کی مضبوط آہنی دیواروں کے نتیجے میں عمل

میں آرہا ہے۔زندگی تو ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے،لیکن اس پیاری زندگی کو اسلام کی خاطر وقفِ نو میں پیش کرنا،تبلیغِ اسلام کی خاطر بے وطن ہونا اور آخر کار اسی راہ میں شہادت پا کر اُن ہی نئی نئی زمینوں میں دفن ہونا،کلمہ طیبہ کی خاطر ماریں کھانا، بیڑیاں پہننا اور اُن بیڑیوں کو چومنا، اسلام کی محبت میں اسیرانِ راہِ مولیٰ بننا اور برس ہا برس قید کی تاریک کوٹھریوں کو اپنے نیک عمل سے بقعہ نور بنا دینا، دھمکیوں اور لالچوں کو حقارت سے ٹھکرا دینا اور وقت آنے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا اور اپنے مقدس خون سے داستانِ وَفا رقم کرنا ایسے واقعات ہیں جن سے احمدیت کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

آج دنیا کے پردے پر یہی ایک جماعت ہے جو اَلاَ وَهِیَ الْجَمَاعَةُ کی مصداق ہے۔اور ایک واجب الاحترام امام کے زیرِ سایہ بنیانٌ مَّرصوص کا منظر پیش کر رہی ہے۔ احمدیت کی سوسالہ تاریخ بے شمار مصائب وآلام اور خدائی فضلوں کے تسلسل سے بھری پڑی ہے۔کیسی کیسی پہاڑ صفت شخصیتیں اُٹھیں، بڑے بڑے دعوے کئے۔لیکن نامراد رہیں۔کہاں ہے بھٹو؟ جس نے کہا تھا کہ مَیں احمدیوں کے ہاتھ میں کشکول پکڑا کر رہوں گا۔اور کہاں ہے؟ وہ آمر ضیاء الحق جس نے کہا تھا کہ مَیں احمدیت کے کینسر کو ختم کر کے چھوڑوں گا۔ایک تو تختہ دار کا حقدار بنا اور دوسرا جس کی راکھ بھی صحراؤں میں گُم ہوگئی۔یہ سب خلافت احمدیہ کا ثمرہ رہا۔جس نے خلافت کی آہنی دیوار سے ٹکر لی، خود پھوٹ کر رہ گیا بلکہ اپنا نام ونشان بھی کھو بیٹھا۔اسلام ترقی نہیں کرسکتا جب تک خلافت نہ ہو۔

سال 2010ء

(19)

خلافتِ راشدہ ہی اصل اسلام کی نمائندہ ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (النور:56)

ترجمہ:۔ اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور مناسبِ حال عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنا دیگا۔ جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا۔ اور جو دین اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے وہ ان کیلئے اسے مضبوطی سے قائم کر دے گا اور ان کے خوف کی حالت کے بعد وہ ان کے لئے امن کی حالت تبدیل کر دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں بنائیں گے اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں گے وہ نافرمانوں میں سے قرار دئے جائیں گے۔

قارئینِ کرام! قرآنِ مجید کلامِ الٰہی ہے۔ مختلف مواقع پر مختلف حالات کا جب وہ ذکر چھیڑتا ہے تو اُن کا شافی علاج بھی تجویز کرتا جاتا ہے۔ انسانی ضرورتیں حد وحساب سے بہت آگے ہیں اور ہر زمانے میں انسان کے لاحقِ حال ہوتی رہتی ہیں۔ جب قرآنِ مجید ایک مکمل ضابطہء حیات اور قانون ہے تو لازم ہے کہ قیامت تک پیش آنے والے ہر قسم کے حالات کے لئے صحیح رہنمائی بھی اسی سے حاصل ہو۔ اوپر کی آیت میں خلافت کے برپا فرمانے کا جو وعدہ اللہ

تعالیٰ نے مؤمنوں سے کیا ہے وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاً بعد قائم کی گئی خلافتِ راشدہ ہی کے بارے میں نہیں تھا بلکہ آئندہ بھی اس کے قیام اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اُس سے وابستہ ہونے کا ذکر کیا گیا تھا۔ سورۂ جمعہ میں جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے ''وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ'' (الجمعۃ: ۴) کے الفاظ میں پیشگوئی کے رنگ میں کیا تھا۔ کیا وہ عبث تھا؟ جب صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آخرین کون ہیں جو ابھی تک ہم سے نہیں ملے۔ یا جب ملیں گے تو ہماری ہی طرح کا اُن کا بھی معیار ہوگا۔ یا یہ کہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک بعید اور لمبے فاصلہ پر ہونے کے باوجود ان کی تربیت بھی ہماری طرح کی گئی ہوگی۔ ہم میں تو آپ موجود ہیں اور ہم آپ سے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی تربیت کس کے ذریعہ ہوگی؟ دراصل اللہ تعالیٰ نے اسی رسول یعنی ہمارے پیارے آقا فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اُن آخرین میں بھجوانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس دنیا سے گزر چکے ہیں اور ایک بار یہاں سے کوچ کر جانے والے دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے۔ پھر بھی یہ کہنا کہ اس نبی کو دوبارہ بھجوایا جائے گا یا یہ کہ وہ بھی اسی نبی سے تربیت یافتہ ہوں گے۔ تو اس کا مفہوم یہی ہوا کہ، ایک عظیم الشان انسان ایسا برپا کیا جائے گا جو اپنی خُو بُو، کردار و عظمت، فعّالیت، ایمان، اخلاص اور اعلیٰ سیرت میں اسی پاک رسول کا چلتا پھرتا نمونہ ہوگا۔ اُسے دیکھ کر یہی معلوم ہوگا کہ ہمارا پیارا رسول پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ اس کا پیارا زمانہ آنکھوں کے آگے پھر جائے گا۔ اسی لئے جہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے استفسار پر کہ یہ آخرین کون ہیں؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہا تھا کہ وہ اہلِ فارس میں سے ہوں گے۔ حدیث میں ایک یا ایک سے زیادہ ایسے اشخاص کا ہونا بیان کیا گیا ہے جو حضرت سلمان فارسیؓ کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اور ان

کی نشانی یہ بتائی کہ فرمایا اگر اُس وقت ایمان ثریا ستارہ تک بھی اونچا اور دور چلا گیا ہوگا تو وہ فارسی النسل شخص یا اشخاص اُسے زمین پر اُتار لائیں گے۔ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کو اپنے اہلِ بیت میں شامل فرمایا ہے۔اس فارسی النسل شخص کی تعریف خود اپنی ذات سے مشابہت تامہّ کے رنگ میں یوں فرمائی کہ اس کا نام ''محمدؐ'' ہوگا۔اس کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ ہوگا۔مزید وضاحت کے لئے اور یہ بتانے کیلئے کہ اسے کوئی اور نہیں سمجھنا بلکہ یہی جاننا کہ وہ مَیں ہی ہوں فرمایا کہ جب وہ فوت ہوگا تو میری ہی قبر میں دفن کیا جائے گا۔اِسی لئے ایک حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اولین اور آخرین میں کون کس پر فوقیت رکھتا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے سورۂ جمعہ کے اِس وعدے ''وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ'' (الجمعۃ: ۴) کو ذہن میں رکھتے ہوئے، سورۂ نور میں مومنوں سے کئے گئے وعدے کو بھی ذہن میں لائیے اور دونوں کو ملا کر پڑھئے۔

عام طور پر مفسرین یہی سمجھتے اور سمجھاتے ہیں کہ اُس میں مؤمنوں کے ساتھ کیا گیا وعدہ بادشاہتوں کا وعدہ ہے۔حالانکہ اگر یہی مفہوم ہوتا تو آخر میں یہ کیوں فرمایا کہ '' وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ '' کیا دنیوی بادشاہتوں کا انکار مؤمن کو فاسق بنا دیتا ہے؟ خلافتِ راشدہ کے بعد بادشاہتوں کا جو سلسلہ قائم ہوا اور آج بھی قائم ہے۔کیا ان کا معیار خلافتِ راشدہ کا معیار ہے؟ اور کیا ان کا انکار فسق کو مستلزم ہے؟ ہرگز نہیں۔یہ وعدہ ایسی ہی روحانی خلافت کا ہے۔جو خلافتِ راشدہ کہلانے کی مستحق ہے بلکہ کہلائے گی۔کیونکہ اس خلافت کے قائم ہونے کی صورت ہی یہ ہوگی کہ مؤمنین اپنے ایمان اور مناسبِ حال اعمال کے بجالانے میں اُس معیار پر کھڑے ہو جائیں گے جو اس خلافت کے وعدے کے ساتھ مشروط

ہے۔ وہ مؤمنین ایسے ہوں گے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کی عبادت کرنے والے نہیں ہوں گے۔ اُن کے خوف کی حالت کو اللہ تعالیٰ اَمن اور سکون سے بدل دے گا۔ شرک ان کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا اور جب اللہ کی یہ رحمت دوبارہ قائم ہوگی تو پھر بھی اس کا انکار اور اس کا مقابلہ کرنے والے ایسے بدقسمت ہوں گے کہ فسق ہی ان کا نصیب ہوگا۔

(تاریخ: ۲۱۔۲۔۲۰۰۱)

(20)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اُسلوبِ جہاد

جہاد اُسلوبِ اسلامی کا ایک حصہ ہے۔ اُس کی ضرورت، اُس کا وقت اور اس کے لئے درکار شرائط سب کچھ قرآنِ مجید نے واضح کر کے بتا دئے ہیں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں برت کے دکھا دئے ہیں۔ جہاد کے بارہ میں دو قول نہیں ہو سکتے۔ اس خصوص میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم یہ ہے کہ جہاد اِسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ جب اور جہاں حالات جہاد کا تقاضا کریں، جہاد کرنا فرض ہے۔ جہاد کے وہ حالات کیا ہیں؟ یہی کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کے اختیار سے اور عبادتوں کے بجالانے سے روکا جائے۔ لیکن اب جو حالات رونما ہو رہے ہیں وہ جہاد کی تائید میں نہیں بلکہ مخالفت میں ہیں۔ جہاد مستقل منسوخ کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ یہ شریعتِ اسلامیہ کا ایک حصہ ہے اور شریعت مکمل ہو چکی ہے۔ جب بھی ضرورت پیش آئے وہ ایسے ہی فرض ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ جہاد بھی احکامِ اسلام میں سے ایک ایسا حکم ہے جو بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لئے جب تک وہ شرائط سامنے نہیں آتیں۔ جہاد بھی فرض نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہوا کہ ذرا ذرا سی بات پر جہاد کا نعرہ لگانا اور جہاد کو کھیل بنا لینا، متین اور سنجیدہ طبقہ کے لئے اِسلام کی ہنسی اُڑانے کے سامان بہم پہنچانا، دنیا کے اَمن کو خطرے میں ڈالنا اور جہادِ اسلامی کا جو رُعب کفار کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے زائل کرنا، اسلام نہیں بلکہ اسلام کے منافی ہے۔

نہ صرف بانئ جماعتِ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جہاد کی یہ تعریف کی بلکہ

بیسیوں سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگوں اور علماء نے بھی جہاد کی وہی تعریف کی۔آپ کے زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی بلکہ دنیا کا متعدد حصہ یا تو ان کے زیرنگین تھا یا ان کا طرفدار تھا۔ ہندوستان پر ان کا قبضہ کتنا بھی جابرانہ، غاصبانہ، ظالمانہ اور عدل کے خلاف کیوں نہ رہا ہو۔لیکن ان میں وہ شرائط مفقود تھے جو جہاد کا لازمہ ہیں۔خصوصاً پنجاب میں انگریزوں سے قبل سکھوں کی حکومت تھی۔ اور سکھوں نے اسلام کو مٹانے ، اس کی عبادتوں میں رکاوٹیں ڈالنے اور اسلام کی تبلیغ کو مسخ کرنے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی تھی۔اذان دینے کی اجازت نہیں تھی اور مسجدوں کو گردوارے اور گھوڑوں کے اصطبل بنادیا گیا تھا۔ایسے وقت انگریز آئے اور انہوں نے مذہبی رواداری کا ایسا خوبصورت نمونہ دکھایا کہ ہر رکاوٹ دور کردی۔عیسائی مذہب کی تبلیغ وترویج کے لئے انگریزی حکومت نے سینکڑوں اور ہزاروں پادریوں کو یورپ سے بلاکر بڑی بڑی سہولتوں کے ساتھ سارے ہندوستان میں پھیلا دیا۔لیکن اسلام کی تبلیغ کی مخالفت یا ممانعت نہیں کی اور نہ ہی مسلمانوں کو عبادات سے روکا۔حضرت مسیح موعودعلیہ السلام نے یہی فتوٰی دیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کوئی معنی نہیں رکھتا۔کیونکہ لازمی شرائط یہاں مفقود ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا۔

’’یادرہے کہ مسئلہ جہاد کو جس طرح پر حال کے اسلامی علماء نے جو مولوی کہلاتے ہیں سمجھ رکھا ہے اور جس طرح وہ عوام کے آگے اسی مسئلہ کی صورت بیان کرتے ہیں ہرگز وہ صحیح نہیں ہے اور اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ لوگ اپنے پر جوش وعظوں سے عوام وحشی صفات کو ایک درندہ صفت بنادیں۔اور اِنسانیت کی تمام پاک خوبیوں سے بےنصیب کردیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مَیں یقینا جانتا ہوں کہ جس قدر ایسے ناحق کے خون اُن نادان اور نفسانی انسانوں سے ہوتے ہیں جو اس راز سے بےخبر ہیں کہ کیوں اور کس وجہ سے اِسلام کو اپنے

ابتدائی زمانے میں لڑائیوں کی ضرورت پڑی تھی۔اُن سب کا گناہ اُن مولویوں کی گردن پر ہے کہ جو پوشیدہ طور پر ایسے مسئلے سکھاتے رہتے ہیں جن کا نتیجہ دردناک خونریزیاں ہیں.....اے اسلام کے عالمو اور مولویو! میری بات سنو! مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اب جہاد کا وقت نہیں ہے۔ خدا کے پاک نبی کے نافرمان مت بنو! مسیح موعود جو آنے والا تھا ،آچکا اور اس نے حکم بھی دیا کہ آئندہ مذہبی جنگوں سے جو تلوار اور کُشت وخون کے ساتھ ہوتی ہیں۔باز آجاؤ، تو اب بھی خونریزی سے باز نہ آنا اور ایسے وعظوں سے منہ بند نہ کرنا طریقِ اسلام نہیں ہے۔جس نے مجھے قبول کیا ہے وہ نہ صرف ان وعظوں سے منہ بند کرے گا بلکہ اس طریق کو نہایت برا اور موجبِ غضب الٰہی جانے گا''

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد۔روحانی خزائن ۱۷/ ۴۳۔ ۴۲)

''دیکھو مَیں ایک حکم لے کر لوگوں کے پاس آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اب سے تلوار کے جہاد کا خاتمہ ہے۔مگر اپنے نفسوں کے پاک کرنے کا جہاد باقی ہے۔اور یہ بات مَیں نے اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ خدا کا یہی ارادہ ہے۔صحیح بخاری کی اُس حدیث کو سوچو جہاں مسیح موعود کی تعریف میں لکھا ہے کہ ''یضع الحرب'' یعنی مسیح جب آئے گا تو دینی جنگوں کا خاتمہ کردے گا۔سو مَیں حکم دیتا ہوں کہ جو میری فوج میں داخل ہیں وہ اِن خیالات کے مقام سے پیچھے ہٹ جائیں۔دِلوں کو پاک کریں اور اپنے انسانی رحم کو ترقی دیں اور دردمندوں کے ہمدرد بنیں، زمین پر صلح پھیلائیں کہ اس سے ان کا دین پھیلے گا اور اس سے تعجب مت کریں کہ ایسا کیوں کر ہوگا''

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد۔روحانی خزائن ۱۷/ ۵۰)

اور اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث میں **یضع الحرب** کو جو

آنے والے مسیح کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ وہ بھی مصلحت سے خالی نہیں۔ امتِ محمدیہ کا یہ مسیح موعود، موسوی امت کے مسیح سے مشابہت رکھتا ہے۔ موسوی مسیح کی ساری تعلیم نرمی، خلیقی اور مروّت پر مبنی تھی۔ جنگ وجدال اور تیر وتفنگ سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اسی مشابہت کو قائم رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک اور معصوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری زمانے کے لئے جو تعلیم دی وہ جنگ سے بیزاری اور جنگوں کے ترک سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کے بعد جس قدر بھی جنگیں جہاد کے نام پر لڑی گئیں سب ناکام رہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اپنی ایک نظم میں جو جنگی جہاد کے خلاف ہے یہ اشعار بھی رقم فرمائے تھے۔

یہ حکم سن کے بھی جو لڑائی کو جائے گا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اٹھائے گا
اک معجزہ کے طور پر یہ پیشگوئی ہے
کافی ہے سوچنے کو اگر اہل کوئی ہے
ہم اپنا فرض دوستو اَب کر چکے ادا
اب بھی اگر نہ سمجھوگے تو سمجھائے گا خدا

(21)

رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم (۱)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ط اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌط

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (سورۃ الانبیاء:۱۰۸)

ترجمہ: اور ہم نے تجھے دنیا کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

قارئینِ کرام! اللہ تعالیٰ کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔جن میں سے ایک نام رب العالمین ہے۔یعنی ساری دنیا کا پالنے والا۔بالکل اسی طرح اُس نے اپنے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صفاتی نام ''رحمۃ للعالمین'' رکھا ہے۔یعنی تمام جہانوں کے لئے آپ کی ایک خصوصیت رحمت بھی ہے۔دنیا میں سینکڑوں انبیاء اور اولیاء گزرے ہیں۔آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، ایوب، داؤد، زکریا، یحیٰ، عیسیٰ علیھم السلام۔اُن کی خوبیاں اُن کے درجات، اور ان کی تعریفیں ہمیں کس نے بتائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔اب آئندہ قیامت تک اُن پر سلام اور درود امتِ مسلمہ کے ذریعہ پہنچتا رہے گا۔اُن کی عظمت اور ان کی صحیح عزت ہمیں اپنے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ معلوم ہوئی۔اور کمال یہ ہے کہ اُن کی تمام خوبیاں ہم پر آپ نے آشکار کیں۔ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے سب رحمتیں، برکتیں اور نعمتیں آپؐ نے مانگیں، مگر اپنے لئے کچھ نہیں مانگا۔کیا اللہ تعالیٰ اتنے سخی، اتنی وسعتِ قلبی اور دل کی

اس قدر بڑھائی اور شرحِ صدر کو یوں ہی بے انعام چھوڑ دیتا؟ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پکارا۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (الاحزاب:۵۷) یعنی اللہ تعالیٰ آسمان سے اس کی بزرگی اور بڑائی بیان کرتا ہے اور اُس کے فرشتے بھی۔ اور یہ کام وقتی نہیں قیامت تک یونہی چلتا چلا جائے گا۔ اے مؤمنو! تم بھی اس نبی پر سلام اور درود بھیجو۔ اِس زمانے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ یہ وحی فرمائی کہ ''**کل برکة من محمد صلی اللہ علیہ وسلم**'' کہ سب برکتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ کردی گئی ہیں۔ جو اِس دامنِ فیوض سے وابستہ نہیں ہوگا، وہ خدا کے فضلوں کا وارث نہیں ہوگا۔ ایک جگہ قرآنِ مجید فرماتا ہے۔ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (الشعراء:۴) یعنی شائد تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالے گا کہ وہ کیوں مؤمن نہیں ہوتے۔

یعنی تیرا پاک دل کافروں کے سچائی کے انکار کو برداشت نہیں کرسکتا اور تو خواہش کرتا ہے کہ وہ بھی ہدایت کو پاجائیں۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ ''فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ'' (آلِ عمران: ۳۲) میری پیروی کرو، مجھ سے محبت کرو اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ہے کہ وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ملنے کے لئے آئے ہاتھ ملا کر کہا۔ یارسول اللہ! مَیں اپنی جان کے بعد سب سے زیادہ محبت آپ کے ساتھ رکھتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، اے عمرؓ! یوں کام نہیں چلے گا۔ تمہیں میرے ساتھ اپنی جان، مال، اولاد اپنی بیویوں اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت رکھنی پڑے گی۔ حضرت عمرؓ یوں ہی تھامے بیٹھے رہے۔ کیونکہ وہ بڑے جری اور بہادر تھے اور جب تک بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آجاتی کوئی عہد کرنے والے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد کہا 'یارسول اللہ' مَیں اپنی جان، مال، عزت اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ پھر اس بات کو

زندگی بھر یاد رکھا اور نبھایا۔ ایک مرتبہ خلافت کے زمانے میں مدائن کی فتح میں بہت مال، غنیمت مدینہ میں آیا۔ آپ نے حسبِ معمول امہات المؤمنین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے بعد حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ایک ایک ہزار دینار دئے۔ جب آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ کی باری آئی تو ان کو پانچ سو دینار دئے۔ انہوں نے شکایت کی کہ حسنین کو ایک ایک ہزار اور مجھے صرف پانچ سو۔ حالانکہ مَیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سے غزوات میں شانہ بشانہ لڑا ہوں۔ جبکہ یہ دونوں ابھی بچے تھے اور جہاد اُن پر فرض بھی نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ ''یہ بھی تو دیکھو کہ وہ نواسے کس کے ہیں۔ اگر تمہارا بھی کوئی نانا اُن کے نانا جیسا ہو تو مجھے دکھانا۔''

سورۂ احزاب میں آیا ہے کہ ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ'' (احزاب:۷) یعنی جو محبت انسان کو اپنی جان سے ہے، اس سے بہت بڑھ کر اس رسول کی محبت مؤمنوں کے ساتھ ہے۔ اور اس کی صحبت میں رہ کر اس کی بیویاں بھی مؤمنوں کے ساتھ وہی محبت رکھتی ہیں۔ اسی لئے وہ مؤمنوں کی مائیں ہوئیں۔ امہات المؤمنین میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ سب کی سب بے حد سخی تھیں۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک لاکھ روپیہ نذرانہ حضرت عائشہؓ کو بھجوایا۔ تو انہوں نے اسی وقت غریبوں اور مسکینوں کو بلوایا اور تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ کسی کو تعلیم کے لئے، کسی کو شادی کے لئے، کسی کو قرض کی ادائیگی کے لئے اور کسی کو کسی اور غرض کے لئے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے اپنا دامن جھاڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ملازمہ سے پوچھا کہ شام کے کھانے کا کچھ انتظام ہے۔ جب پتہ چلا کہ کچھ بھی نہیں ہے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں۔ آج رات ایسے ہی گزاریں گے۔ اِس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مؤمنوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا اندازہ لگا لیجئے۔ اِس آیت کے نازل ہونے

کے بعد ہی آپؐ نے اعلان فرمایا ''اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ '' کہ میرا درجہ اتنا بڑا ہے تو میرا ابھی فرض ہے کہ اب جو شخص بھی فوت ہو اُس کا ترکہ تو رشتہ داروں کو ملے گا۔لیکن اگر کوئی ایسا شخص فوت ہو جس پر کوئی قرض چڑھا ہو تو اُس کی ادائیگی مَیں کروں گا۔لوں گا تو کسی سے کچھ نہیں مگر دینے کے لئے سب سے آگے مَیں ہوں۔آپؐ رحمت ہیں عالم ملکوت کے لئے، رحمت ہیں عالم جمادات کے لئے، رحمت ہیں عالم نباتات کے لئے، رحمت ہیں عالم حیوان کے لئے۔ ہر جاندار سے حسنِ سلوک کی تعلیم دی۔ بلکہ آپ رحمت ہیں عام انسانوں کے لئے اور رحمت ہیں مؤمنوں کے لئے بھی۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے۔لَقَدْ جَآئَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔(التوبہ:۱۲۸)

اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت کی قدر کرو۔تم میں سے خدا نے ایک رسول مبعوث کیا۔ایسا عظیم الشان رسول کہ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہوا جس نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر دکھ اُٹھائے ہوں۔ ہر دکھ اپنی جان پر سہتا ہے۔مگر خدا کی مخلوق کے دکھ نہیں دیکھ سکتا۔تمہارا دکھ میں پڑنا اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ غنی دل کسی نے نہیں دیکھا۔قناعت میں آپؐ سے بڑھکر کوئی نہیں ہوا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے تمام دولتیں پیش کیں۔آپ کو وہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دیں جس سے بڑھکر کسی کو نہیں دیں۔ بادشاہت عطا فرمائی۔دولت عطا فرمائی۔لیکن آپ نے فرمایا اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ یعنی غریبی پر ہی فخر کرتا ہوں۔خود بھوکے رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرا۔خود پیوندوں والے کپڑے پہنے اور دوسروں کے تن کو ڈھانپا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ وہ شخص جس کے پاس کبھی حرص پھٹکا نہیں۔خدا تعالیٰ کی مخلوق

کے لئے حریص ہے کہ خدا کی مخلوق خدا کے فضلوں کا وارث ہو جائے۔ آپ کا دل چاہتا تھا کہ تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی تمام فضل لوگوں کو حاصل ہو جائیں۔ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ خدا کے سارے بندوں کے ساتھ اس کی رحمت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ مگر مؤمنوں کے لئے تو خاص طور پر بہت ہی پیار اور رحمت کا ٹھکانا اور لطف و کرم کی بارشیں بے حد و بے حساب تھیں۔ جن کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۔
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ''

(22)

رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم (۲)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ط اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ط

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز کیا ہے لوح وقلم تیرے ہیں

(اقبال)

(۱) فتح مکہ کے موقعہ پر جب آپ خانہ کعبہ پہنچے تو مقامِ ابراہیم پر آپ نے دو رکعت نفل ادا کی، پھر نگران عثمان بن طلحہ کو بلوا کر چابیاں طلب کیں۔ خانہ کعبہ کے اندر جا کر آپ نے دو رکعت نفل پڑھی اور باہر نکل کر آپ نے عثمان کو دوبارہ طلب کیا۔ وسوسوں سے اس کا برا حال تھا۔ مکہ میں قیام کے دوران ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے چابیاں طلب کی تھیں تا کہ خانہ کعبہ کے اندر جا سکیں۔ اس نے نہ صرف انکار کیا تھا بلکہ نہایت سخت وسست بھی کہا تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا آیا۔ آپ نے چابیاں اس کے حوالے کیں اور فرمایا **’یہ چابیاں آئندہ تمہارے اور تمہارے خاندان کے پاس رہیں گی اور کوئی نہیں جو تم سے چھین سکے‘** اس فرطِ رحم و کرم کو دیکھ کر وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔

لیا ظلم کا عفو سے انتقام
علیک الصلوٰۃ علیک السلام

(۲) ایک بار جس نے آپ کے صاحبزادی زینب کو جب وہ مکہ سے مدینہ منورہ جارہی تھیں۔اونٹ پر سے کھینچ کر نیچے گرادیا تھا جس سے اُن کا حمل ضائع ہوگیا تھا اور اِسی صدمے سے اُن کا انتقال ہوگیا تھا۔اسے بھی آپ نے اپنے سایہء رحمت میں لے کر معاف فرمادیا۔ ایسے مفسدوں اور شریروں کے لئے معافی کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔کیا آپ کے رحمت للعالمین ہونے میں کوئی شک ہوسکتا ہے؟

(۳) ہندہ ایک عورت تھی جس نے جنگِ احد کے موقعہ پر وحشی نامی ایک حبشی کو انعام دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کروادیا تھا۔اور اُن کے ٹکڑے کروا کر اور پیٹ چیر کر اُن کا کلیجہ نکال کر چبادیا تھا۔ہندہ اُن گیارہ مجرموں میں سے تھی۔جنہیں دیکھتے ہی قتل کردینے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی حکم دے دیا تھا۔اُسے بھی آپؐ نے معاف فرمادیا۔

(۴) عِکرمہ، ابوجہل کا بیٹا تھا اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔وہ کہیں فرار ہورہا تھا۔اس کی بیوی جو پہلے ہی مسلمان ہوچکی تھی۔اُسے ڈھونڈ کر لے آئی۔آپ نے نہ صرف اسے معاف کردیا بلکہ اپنی قوتِ قدسی سے اُسے اِس مقام پر پہونچادیا کہ وہ غیر معمولی جرنیل ثابت ہوا اور آج ہم انہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

(۵) فتح مکہ کے دن جب آپ ضروری کاموں سے فارغ ہوئے تو تمام اہلِ مکہ آپ کے آگے پیش ہوئے۔اِن میں وہ سب تھے جنہوں نے آپ کے اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا تھا۔یہاں تک کہ آخر میں حضور کے مدینہ ہجرت کے وقت آپ کو مشترکہ طور پر

قتل کر دینے کی کوشش کی تھی۔ آج وہ سب آپ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپ نے پوچھا اے مکہ والو! اب تم مجھ سے کس سلوک کی امید رکھتے ہو۔ ڈرے سہمے اور لرزتے ہوئے انہوں نے جواب دیا کہ آپ نیک بھائی کے نیک بیٹے ہو۔ ہم حضرت یوسف کی طرح آپ سے عفو اور رحم کی امید رکھتے ہیں۔ آپ نے اُن تلخ ترین دشمنوں سے وہی کہا جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (سورہ یوسف: ۹۳) کہہ کر آپ نے انہیں اپنی رحمت میں لے لیا اور کہا جاؤ! آج تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ پھر اعلان کر دیا کہ جو شخص خانہء کعبہ کے اندر چلا جائے گا۔ اسے معافی دی جائے گی۔ جو اپنے ہتھیار پھینک دے گا اسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے بھی معافی دی جائے گی۔ جو شخص حکیم بن حزام کے گھر میں چلا جائے گا اسے بھی معافی دی جائے گی۔ اور جو شخص بلال ؓ کے جھنڈے تلے پناہ لے لے گا اسے بھی معافی دی جائے گی۔ جو شخص بھاگ جائے اس کا پیچھا نہ کیا جائے گا۔ اور جو زخمی ہوا اُسے بھی کچھ نہ کہا جائے گا۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لے اس سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کی عام معافی کا تو حکم اسلام نے پہلے ہی دے رکھا تھا۔

(۶) مہاجرین کی جائدادیں جو کفارِ مکہ کے قبضہ میں تھیں اُن کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ آپ نے مہاجرین کو بھی حکم دیدیا کہ اپنے تمام حقوق چھوڑ دیں۔

(۷) وحشی کو جس نے نیزہ پھینک کر آپؐ کے چچا حضرت حمزہ ؓ کو جنگِ احد میں قتل کر دیا تھا۔ معاف کر دیا گیا بلکہ کوئی ملامت بھی نہیں کی۔ اِس کی مثال کسی مسیحی زندگی میں کبھی نہیں ملی۔ یہ فخر صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔

(۸) جب آپ طائف پہونچے تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے ساتھ نہ فوج ہے نہ جتھا۔ آپ صرف زیدؓ کے ساتھ مختلف محلوں میں تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں۔ دِل کے اندھوں کو نظر آیا کہ یہ تو ایک حقیر اور دُھتکارا ہوا انسان ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ اِس کو دکھ دینا اور تکلیف پہونچانا رؤساء کی نظروں میں ہمیں معزز بنادے گا۔ حتّٰی اُن کے ساتھ تھے، انہوں نے لڑکوں کو اُکسایا اور پتھروں سے جھولیاں بھرلیں۔ اور بے دردی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھراؤ شروع کر دیا اور آپ کو دھکیلتے ہوئے شہر سے باہر لے چلے۔ جب کبھی آپ آرام کرنے کیلئے نیچے بیٹھ جاتے تو کوئی لڑکا آتا اور ہاتھ کھینچ کر آپ کو کھڑا کر دیتا کہ یہ آپ کے بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ آپؐ کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ اور آپ آبادی سے دو تین میل دور پہاڑیوں کے قریب نکل آئے۔ اُن اوباشوں سے آپ کا پیچھا چھوٹا۔ آپ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے کہ کہیں اللہ کا غضب اُن پر نازل نہ ہو جائے۔ آپ نہایت درد اور الحاح کے ساتھ دعا کرتے کہ الٰہی اِن لوگوں کو معاف کر دے کہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ تھکے ہوئے آپ ایک انگورستان کے سائے تلے بیٹھ گئے اور اللہ سے دعا کی ''اے میرے رب! مَیں تیرے ہی پاس اپنی کمزوریوں اور اپنے سامان کی کمی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے حقیر ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔ تو غریبوں اور کمزوروں کا خدا ہے۔ تو میرا بھی خدا ہے۔ تو مجھے کس کے ہاتھوں میں دے گا، کیا اجنبیوں کے ہاتھوں میں جو مجھے اِدھر اُدھر دھکیلتے ہوئے پھریں۔ یا اُس دشمن کے ہاتھ جو میرے وطن میں مجھ پر غالب ہے۔ اگر تیرا غضب مجھ پر نہیں تو مجھے ان دشمنوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ تیرا رحم میرے ساتھ ہے اور تیری عافیت مجھ پر وسیع ہے۔ مَیں تیرے چہرے کی روشنی میں پناہ چاہتا ہوں۔ تیرا ہی کام ہے تو تاریکی کو بھگا دے گا اور اِس دنیا اور اگلی دنیا میں امن بخشے۔ تیرا غصہ اور تیری غیرت مجھ پر نہ بھڑکے۔ اگر تو غصہ بھی ہوتا ہے تو پھر خوشی کا اظہار

کرے اور تیرے سوا کوئی حقیقی طاقت اور حقیقی پناہ کی جگہ نہیں۔

وَآخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین

(23)

تنظیم کی برکات

ہم اپنے جسمانی نظام میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ تمام اعضاء ایک دوسرے کے معاون ومددگار آپس میں ایسے مربوط ہیں کہ ایک عضو کی کمزوری یا خلل دوسرے تمام اعضاء کو بے چین کر دیتا ہے۔ تکلف سے بھی رویا جائے تو تھوڑی دیر میں دل ملول ہوجاتا ہے اور چہرے کے نقوش غم آلود ہوجاتے ہیں۔ جب ہم ٹھوکر کھا کے بے ساختہ گرنے لگتے ہیں تو دونوں ہاتھ چہرے کی حفاظت کے لئے خود بخود آگے بڑھتے اور زمین پر ٹک جاتے ہیں۔ آنکھ میں معمولی سا تنکا بھی پڑ جائے یا پیٹ میں درد ہو تو تمام جسم تڑپ جاتا ہے اور تمام اعضاء بے آرام اور بے اختیار اور ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوجاتے ہیں۔ یہی صورت حالت کائنات کے ذرے ذرے میں کارفرما نظر آتی ہے۔ سورج، چاند، زمین، ستارے، موسم اپنے اپنے مفوضہ کاموں کے انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے باہمی ربط میں ذرا سی بھی کمی وبیشی ہوجائے تو مہیب نقصانات، عوارض، حادثات اور ناگہانیاں ظہور پذیر ہونے لگ جائیں۔ اشیاء کے خواص بدل جائیں تو آم کے بیج سے نیم اور پیپل کے بیج سے جامن اور ناشپاتی پیدا ہونے لگے اور ہر چیز پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کیونکہ قدرت نے ہر ذرے میں جو خواص ودیعت کئے ہیں اُن میں وفا اور فرماں برداری کی روح بھی پھونکی ہے۔ وہ اپنی صفات میں تبدیلی نہیں آنے دیتے۔ اور اپنے نظم سے ہٹنا پسند نہیں کرتے۔ سیاروں کی باہمی کشش کے نظام میں ذرا سا فرق پڑ جائے تو ساری کائنات کا خاتمہ ہوجائے۔ معلوم ہوا کہ قدرت کا منشاء،

رابطہء باہمی، آپسی اتحاد، تنظیم کی پابندی اور اتباع کی روح پیدا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس قدر تعلیمات وقتاً فوقتاً انسانوں کو پہنچتی رہی ہیں، اُن کا لُب لباب تنظیم سے وابستگی اور فرماں برداری کی روح پیدا کرنا رہا ہے۔ اِسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا (جوبھی) سنو، اس کی اتباع کرو۔ اسی لئے اپنے آخری اور پسندیدہ مذہب کا نام اللہ تعالیٰ نے اسلام رکھا ہے جس کے معنی فرماں برداری اور تسلیم و رضا کی خُو رکھنے کے ہیں۔ اسی حقیقت کو غالب نے اس طرح پیش کیا ہے کہ

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شریعتِ اسلامیہ نے جس قدر بھی احکامات دئے ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظاہر ہیں۔ اُن کا منشاء اللہ تبارک تعالیٰ کی صفات کو دنیا میں عمل کے ذریعہ رائج کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمن ہے، رحیم ہے، رب ہے، غفور اور کریم ہے تو بندوں میں بھی انہی صفات کو دیکھنا پسند فرماتا ہے۔ کفار کی طرف سے عذاب کے مطالبے پر اپنی سزا کے طریق کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ (سورہ رعد: ۴۰) یعنی تمام احکام کی حکمت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہاں اُم کے معنی جڑ کے ہیں اور کتاب کے معنی حکم کے۔ چونکہ احکام کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لئے یہ اُسی کا حق ہے اور اُسی کو سزاوار ہے کہ وہ سزا دے یا معاف کردے یا سزا میں تاخیر ڈال دے۔ جنگ بدر کفار کے لئے ایک عذاب کی گھڑی تھی جس میں چُن چُن کر ائمۃ الکفر اپنے انجام کو پہنچائے گئے، مگر بہت سے بچا بھی لئے گئے۔ مثال کے طور پر خالد بن ولیدؓ، عکرمہؓ اور عمرو بن العاص وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا تھا کہ آگے اُن سے کیسے کیسے کام لئے جائیں گے اور کون کون سی خدمات کا موقعہ اُن کو دیا جائے

گا۔ یہاں یہ لطیف نکتہ بیان فرمایا کہ اخلاقِ کامل اللہ تعالیٰ کی صفات کے کامل اتباع کا نام ہے۔ یعنی صفاتِ الٰہیہ کی نقل اخلاق اور نیکی ہے اور اِس کے مغائر کا نام بدی ہے۔ بعض لوگ غصہ کے وقت اپنے دشمن کو پیس کر رکھ دینے اور نیست و نابود کر دینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں اصلاح کا پہلو نمایاں اور سزا کا صرف بشرطِ ضرورت ہے تو پھر ایسے لوگ جو اپنی سوچ اور عمل میں اِس صفت کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ حقیقی مؤمن نہیں کہلا سکتے۔

جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں ایک خاص تنظیم اور ایک ترتیب ملحوظ رہتی ہے۔ کائنات کی تکوین، فطرت کے تمام نظام، زمین کی گردش، چاند، سورج اور تاروں کا طلوع وغروب، اُن کی اثر پذیری، موسموں کا تبدل وتغیر، انسانی جسم کے افعال، دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ایک خصوصی نظم وضبط، قوموں کی ترقی میں مضمر حکمت عملیاں وغیرہ سب کے سب ایک نظم، ترتیب اور اُن پر مسلسل عمل درآمد کا تقاضا کرتے ہیں۔ آدم کی بعثت کا مقصد تمدن کی بنیاد رکھنا تھا اور تمدن، تنظیم ہی کا نام ہے۔ انسانی جذبات اور اعمال کی تہذیب کا نام ہے۔ مِل جل کر رہنے اور مِل جل کر فروغِ انسانیت کے لئے تابندہ کارنامے انجام دینے کا نام ہے۔ بہبودِ انسانیت اور فلاح قوم وملت کے عزم اور ارادے کا نام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ملک وقوم میں حکومتیں ہوتی ہیں بلکہ غیر شائستہ اور جنگلی قبائل میں بھی ایک نوع کی حکومت اور تنظیم ہوتی ہے جس کا سربراہ ایک شخص کو بنایا جاتا ہے اور سب اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ عوام جو ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں میں ہوتے ہیں۔ ایک حکومت کے تابع ہوتے ہیں۔ گو حکومت کرنے والوں کی تعداد، عوام کے مقابلے میں بہت ہی قلیل اور محدود ہوتی ہے۔ لیکن وہی حکومت اگر عدل وانصاف سے کام لیتی ہے تو اپنی قوم کو دنیا میں فخر سے

سر بلند رکھنا سکھاتی ہے اور تمدن و تنظیم کے باب میں انقلابی کوششوں کو بروئے کار لا کر اپنی ایک ایک خصوصی شناخت پیدا کر دکھاتی ہے۔ تنظیم ہی میں فتح ہے، کامرانی ہے، سر بلندی ہے اور عزّت و وقار ہے۔ آج کی ہر ترقی یافتہ قوم محض تنظیم ہی کی وجہ سے نمایاں اور برتر ہے۔ ہر نبی کی آمد تنظیم کا سنگِ بنیاد رکھتی ہے جس پر آئندہ فلاح، کامیابی اور قدر و منزلت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ نظم و ضبط یعنی تنظیم ہی زندگی کی اصل اور بنیاد ہے۔ اس کے بغیر شکست اور خاتمہ تو ممکن ہے۔ اوج اور ترقی ممکن نہیں۔ انبیاءِ کرام کا مسلسل وَرود اور سب کے آخر میں فخرِ بنی آدم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ گرامی، آپ کے ذریعہ شریعتِ کاملہ کا قیام اور اُس پر عمل درآمد، پھر اس کے نتائج، سب ہمارے سامنے ہیں اور تنظیم کی قوت پوری طرح ہم پر واضح ہو چکی ہے۔

آج مسلمانوں میں سینکڑوں تحریکیں اپنے آپ کو سچے اسلام سے وابستہ رکھنے کی دعویدار ہیں لیکن اُن کے کاموں کو دیکھا جائے تو سب کے سب دنیا کی کثافتوں سے آلودہ اور دنیوی حِرص و طمع کی ملونی سے پُر ہیں۔ تنظیم کے لحاظ سے بھی ڈسپلن سے ناآشنا اور خودغرضیوں کے سمندر میں غوطے کھاتی بَہی جا رہی ہیں۔ گاہے ڈوب بھی جاتی ہیں اور پھر اُن کا نام و نشان بھی ناپید ہو جاتا ہے۔ خاکسار تحریک کا کیا حشر ہوا۔ تحریکِ خلافت کس شان سے کانگریس کے اسٹیج پر پیدا ہوئی تھی لیکن کہاں جا کے دفن ہوئی اور کِس کسمپرسی کی حالت میں انجام کو پہنچی۔ ان ناکامیوں اور محرومیوں کی داستان بے حد طویل ہے اور دردناک بھی۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کے پیچھے خدائی نصرت اور خدائی ہاتھ کارفرما نہیں تھا۔ مُسلم لیگ کی آن بان آج مٹی میں رُل رہی ہے۔ اور قائدِ اعظم کے بعد کوئی بھرپور زندہ لیڈر اُسے نصیب نہیں ہوا۔

احمدیت چونکہ انسانی صلاحیتوں اور دماغی خلاّقیوں کا نعرہ لے کر نہیں بلکہ نصرتِ خداوندی کا دعوٰی لے کر اٹھی تھی، آج بھی خدائی نصرت کے سہارے بلندیوں کی طرف محوِ

پرواز ہے اور تنظیمی و عملی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کی مظہر ہے۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جماعت میں مختلف ذیلی تنظیمیں قائم کر کے ایسا عظیم اور دُور رَس کارنامہ انجام دیا کہ آج ہم اس کے شیریں پھلوں سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔ ذیلی تنظیموں کے اس نیٹ ورک میں لجنہ اماء اللہ تنظیم بھی نمایاں حیثیت کی حامل فعّال تنظیم ہے جس کے کارنامے آئے دن ترقی پذیر اور روح پرور نظاروں سے مالا مال ہیں۔

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر جماعت میں پچاس فیصد عورتوں کی اصلاح ہو جائے تو پھر احمدی قوم کی ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ آج ہم اس ہدف کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

احمدیت کے تنظیمی قالب میں ، ایمان، حوصلہ، وفاکشی، اولوالعزمی، انتھک محنت، صبر و استقامت اخلاق اور عمل و جہدِ مسلسل، سیال خون کی طرح دوڑ رہے ہیں اور خداداد جو لیڈر شپ خلافت کے رنگ میں اور خلافت راشدہ اولیٰ کی مثیل اسے حاصل ہے۔ وہ تھکن اور پسپائی سے نا آشنا قلعوں پر قلعے فتح کئے جارہی ہے اور ساری دنیا کے دلوں کی فتح اس کا مطمح نظر ہے۔ تنظیموں کے اس نیٹ ورک میں لجنہ اماء اللہ کی تنظیم بھی اپنی گوناگوں نزاکتوں کے باوجود قربانیوں کے ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش ہے اور بعض محاذوں پر ان پر بھی سبقت لے جاتی رہی ہے۔ ایم۔ٹی۔اے کی برکات تنظیم ہی کی برکات کا ایک سلسلہ ہیں اور ہم ساری دنیا میں پھیلی ہوئی اپنی بہنوں کے کارنامے، ان کے طریق تربیت، ان کی تبلیغی اور عملی کاوشیں، ان کی ہنرمندیاں، ذہانتیں اور قربانیاں گھر بیٹھے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ مرکزی تنظیم کے ماتحت، بے لوث خدمات کے حوالے سے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے۔ لجنہ اماء اللہ کی تنظیم کا قیام حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارنامہ ہے۔ آج

جماعت کی شاخیں تقریباً ساری دنیا میں پھیل چکی ہیں اور ہر قابلِ ذکر شاخ میں لجنہ اماء اللہ کی تنظیم بھی کام کر رہی ہے۔ دنیا میں ہر ملک کا اپنا رنگ ہے۔ ہماری زبانیں جُدا، کلچر جدا اور رنگ وروپ علیحدہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی کسی بھی جماعت میں خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں، شمال کے انتہائی بعید منطقہ میں قائم ہو یا جنوب کے دورترین حصوں میں، احمدیت کے پیدا کردہ ایمان، اخلاق، قربانیوں کی روح اور کلچر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔ ہم جہاں بھی جائیں اپنے آپ کو اپنے ہی گھر اور اپنے ہی خاندان میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

جماعتِ احمدیہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے، اس لئے یقیناً اُس کے عزائم بھی آفاق گیر ہیں اور تنظیم ہی اس کی روحِ رواں ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ اس تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور خلفائے احمدیت نے اِس نوزائدہ پودے کو اپنے خون اور پسینے سے سینچا اور تمام ذیلی تنظیموں نے خلافت کے زیرِ نگرانی حیرت انگیز ترقیاں کیں۔ آج ''قومِ احمد'' مِلّت کا نام بلند کر کے فتح و کامرانی اور عزت ووقار کے نئے جھنڈے گاڑتی جا رہی ہے۔ اس قوم نے خلافت کی برکات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علم وفکر کے نئے خورشید تراشے ہیں۔ اس قوم کی عورتیں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایم۔ٹی۔اے کے پروگرام ہر قابل ذکر ملک سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

ہر پروگرام، بچوں، بچیوں اور بڑوں کی تربیت، ان کی تعلیم، نئی نئی زبانوں کے سیکھنے کی لگن، ذہانت کے مظاہروں اور احمدیوں کے ہمہ تن اسلام کے خلوص میں ڈوبے ہوئے ہونے کے نظاروں سے رنگین نظر آتا ہے۔ چندوں کے میدان میں ہماری لجنات ہر تحریک پَر، جوش سے لبیک کہتی اور اپنے روپیوں اور زیورات کو بھی جماعتی ضرورت کے ہر موقعہ پر قربان کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ حوصلے اور قربانیوں کی یہ روح اور وفا کے تقاضوں کو پورا کرنے کے یہ

مظاہرے محض تنظیم سے وابستگی کی برکات ہیں۔ تنظیم سے ہی ہم نے یہ سبق سیکھا ہے کہ ہم پیدا تو اَکیلے ہوتے ہیں لیکن ساری زندگی دوسروں کے لئے جیتے ہیں اور جب ہم اِس جہاں سے گزر جائیں گے تو اپنے پیچھے ہزاروں سوگوار چھوڑ جائیں گے جو ہمارے لئے دعائیں کرنے والے اور خدا کے حضور ہمارے لئے بخشش اور انعامات کے طلبگار ہوں گے۔ یہ سب کچھ جو ہمیں حاصل ہے حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ہمارے خلفاء کی توجہ اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اُنہوں نے عورتوں کے بظاہر ناتواں اور کمزور طبقہ کو اپنی سطح سے بلند کرنے اور انہیں اپنی قوت وشوکت کے اظہار کے مواقع سے ہمکنار کرنے میں پوری توجہ صرف فرمائی۔ آج ہماری ہر صلاحیت اور ہمارے خلوص کا ہر خانہ ان کی نیک تمناؤں کا ممنون ہے۔ آج عورت کمزور نہیں رہی۔ اُسے طاقتور کہنا بھی اس کے منصب اور مقام کی صحیح نمائندگی نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت بذاتِ خود ایک طاقت ہے۔ اتنی بڑی کہ مرد پیدا کر دکھاتی ہے۔ بلکہ اِس سے بھی بلند کہ نبی اور اوتار اپنی پیدائش میں خدا کے بعد عورت کے مرہونِ منت ہیں۔

عورت زندہ باد، طبقہ نسواں زندہ باد، لجنہ اماء اللہ زندہ باد

☆ ☆ ☆

(24)

اسلام میں اجتماعیت کا تصور

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہے۔ یہ ایک ایسا الٰہی دستور العمل ہے جو معاشرتی، اخلاقی اور روحانی ہر پہلو سے انسان کی رہنمائی کرتا، اور انسانیت کو اس کے اعلیٰ ترین معیار تک پہنچاتا ہے۔ جس طرح اور بہت سی باتوں میں اسلام نے دیگر مذاہبِ عالم سے مختلف اپنے نقطہء ہائے نظر پیش کئے ہیں۔ اسی طرح اجتماعیت کے معاملے میں بھی اس کے اصول اور نظریات نرالے اور انوکھے ہیں۔ دیگر مذاہب میں اجتماعیت کا مفہوم کسی خاص قوم یا مخصوص باشندگانِ ملک کو مخصوص روحانی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا پابند کرتا ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک اجتماعیت کا مفہوم، قوم، ملک، خطہ، رنگ و نسل کے حدود سے بلند اور علیحدہ ہو کر، ساری دنیا کے انسانوں کو ایک رشتہء وحدت میں پرو دینا، اور تمام اقوامِ عالم کو تمدن، اخلاق، روحانیت اور معاشرت کے ایک ایسے معیار پر قائم کر دینا ہے۔ جس میں تعمیر ہی تعمیر غالب ہے۔ تخریب کا کوئی پہلو اُس میں پوشیدہ نہیں۔

اسلام کا نقطہء مرکز یہ وحدت ہے۔ اس کا خدا ایک ہے۔ اس کی صفت اور طاقتیں، اپنی ذات میں فرد ہیں۔ اسی نقطہء وحدت کو اس نے کائنات کے ہر نظام اور ہر شعبے میں جاری وساری فرمایا ہے۔ اب تو یہ ایک تحقیق شدہ امر قرار دے لیا گیا ہے کہ ہر شے اور ہر قوت کے دو پہلو ہیں اور اُن دونوں پہلوؤں کے اتصال اور ان کی وحدت ہی سے وہ قوت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اسلام نے انسانی معاشرت، رہن سہن، تمدن اور نظام مملکت، غرض ہر شعبے میں اجتماعیت

کی روح پیدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ایسی اجتماعیت جو اپنی ذات میں ایک وحدت اور ایک اکائی کہلائے۔

اسلامی عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب کے سب اجتماعیت کے مظہر ہیں، بلکہ حکماً انہیں اجتماعیت کا مظہر بنایا گیا ہے۔ اسلام کا نظمِ مملکت اجتماعیت ہی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ کیونکہ حکومت اسلامیہ ایک ایک فردِ محکوم کو جسمانی، روحانی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل و حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔فردی طور پر انسان کو اپنے معاشرے میں دی گئی آزادیاں بھی ایک اجتماعیت اور نظم سے منسلک ہیں۔ کیونکہ بحیثیت فرد کے گو انسان بعض حیثیتوں سے آزاد ہے۔مثلاً وہ اپنی مرضی کا کام اختیار کرسکتا ہے۔اپنی مرضی سے شادی کرسکتا ہے۔اپنی مرضی کے دوست بنا سکتا ہے۔اپنی مرضی سے کھا پی سکتا ہے۔لیکن اس کی اس مرضی کو بھی ایک اخلاقی اور روحانی ضابطے کا پابند کر کے، اس میں ایک فراخی اور وسعت پیدا کردی ہے۔اس کا ہر کام باوجود فردی آزادی کے تحت ہونے کے، اجتماعیت کے مفاد کے خلاف نہیں ہوسکتا۔غیر اقوام سے تعلقات اور برتاؤ کے قوانین اپنے اندر ایک اجتماعیت کی روح رکھتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر اسلام نے اپنے آخری خطبہ میں ہی ارشاد فرمایا تھا کہ انسان سب کے سب ایک آدم کی اولاد ہیں۔رنگ اور نسل کے اعتبار سے انہیں ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں دی جاسکتی۔فضیلت اور برتری کا معیار تقوٰی اور اچھا عمل ہے۔وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلاً مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّقَالَ اِنَّنِىۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ۔(حٰم السجدۃ: ۳۴) انسان کے لئے معیارِ شرف اُس کا ذاتی جوہر ہے۔خود اس کا علم وعمل ہے۔کسی خاندان کو اس کے فرد کی ذاتی نسبت سے پہچانا جائے گا۔کسی فرد کو اُس کے خاندان کے شرفِ رفتہ سے جاننے کی کوشش، اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔اسلام نے جہاں انسانوں کے بنائے ہوئے بہت سے مٹی کے بُت توڑے، وہیں

تکبر کے بت کو بھی توڑا۔ خاندانی شرفِ رفتہ اور حسب ونسب کے غرورِ باطل کے بت کو بھی کچلا، اور خود پسندی ونخوت کے بت کا سر بھی پاش پاش کر دیا۔ اسلام کے نزدیک حکومت کا قیام اجتماعی انتخاب ہی سے ممکن ہے اور حکومت کو کسی کا ذاتی حق نہیں ٹھرایا بلکہ اسے اجتماعی ملکیت قرار دیا۔ پھر اجتماعی طور پر تمام لوگوں کی عزت اور جان ومال کی حفاظت، حکومت کا فرض قرار دیا۔ حاکم کو افراد اور اقوام کے درمیان عدل کی تعلیم دی کہ نہ وہ کسی فرد یا قوم کو زیادہ سہولتیں دے کر بڑھائے۔ اور نہ کسی کو تنگ کر کے گھٹانے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ جنگی قیدیوں کی آزادی کے لئے یہ اصول مقرر فرمایا کہ اگر اُن کی حکومت یا اُن کے رشتہ دار انہیں چھڑانے کے لئے فدیہ نہ دے سکیں تو خود مسلمان انہیں کچھ رقم دے دیں تاکہ وہ اُس رقم سے کوئی تجارت یا کاروبار کر کے کچھ کمائیں اور اپنا فدیہ ادا کر کے آزاد ہو جائیں۔ غرض کہ آزادی جیسا کہ آزاد آدمی کا حق ہے اسی طرح قیدی کا بھی حق قرار دیا۔ پھر اموالِ ذاتی وقومی میں نہ تمام قوم کو اور نہ تمام مسلمانوں کو بلکہ تمام بنی نوع انسان کو برابر کا شریک گردانا اور کہہ دیا کہ مال دراصل اللہ کی ملکیت ہے۔ کسی کا ذاتی حق نہیں۔ اور اس طرح مال کے خرچ کرنے میں فرد کی آزادی کو محدود کر دیا۔ عبادت، تجارت، احکام قضاۃ، معاملاتِ زن وشوئی، لین دین کے اصول، راعی ورعایا کے حقوق، آقا وغلام کے درجات، غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں اجتماعیت کو ملحوظ نہ رکھا ہو۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی وحدت میں تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے، اسی طرح قوم بھی ایک وحدت کے رشتے میں منسلک ہو کر ہی اپنی قوت وشوکت کا اظہار کر سکتی ہے۔ اسی اصل کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً'' (آلِ عمران: ۱۰۴) کہ تم سب کے سب متحدہ اور اجتماعی طور پر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے

رکھو۔ اور ایسی شدید وابستگی اس کے ساتھ اختیار کرو کہ کوئی حادثہ تمہیں اس سے علیحدہ نہ کر سکے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حبل اللہ کیا چیز ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حبل اللہ خلافت اسلامیہ ہے۔ اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنِ مِنْ بَعْدِیْ اَبُوْ بَکْر وعُمر فَاِنَّھُمَا حَبْلُ اللّٰہِ (ازالۃ الحقاء: صفحہ ۶۴) مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلی۔ اس میں یہی بتایا کہ نبی ایک محدود عمر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد خلافت ہی اس کے کام کو آگے بڑھاتی اور مضبوط کرتی ہے۔ تمہاری کامیابی اسی میں ہے کہ تم خلافت کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے خلافت سے وابستگی کا انعام یہ مقرر فرمایا ہے کہ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ (النور: ۵۶) اُن کے لئے دین کی تمکنت کے سامان کئے جائیں گے۔ غور فرمایئے! دین کی تمکنت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ سورہ حج میں ارشاد فرمایا۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج: ۴۲) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکنت حاصل ہو تو وہ نمازوں کو قائم کر کے نیکی کا بیج بوتے اور زکوٰۃ کے نظام کو رائج کر کے ساری دنیا سے غربت، افلاس، نکبت اور نحوست کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی پورے زور کے ساتھ نیکیوں کے قیام اور بدیوں کے دور کرنے کے لئے بھی کوشاں ہوتے ہیں۔ چودہ سو سالہ تاریخِ اسلام پر غور کر کے یا اپنے تصور میں اس تمام انتظام کے رواج پر تدبر کر کے دیکھ لیجئے۔ سوائے خلافت کے اس کا انصرام ممکن نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خلافت کی برکتوں میں ایک چیز یہ بھی شامل فرما دی کہ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ (النور: 56) کہ کسی بھی قسم کی خوف کی حالت اُن پر طاری ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ امن سے بدل دی جائے گی۔ آج دنیا بھر کے مسلمان خلافت سے محروم ہیں۔ اُن کا انتشار ایک بہترین مثال ہے۔ کہاں تو

خلافت کے نتیجہ میں مسلمانوں کے رعب اور دبدبے کا یہ حال تھا کہ اُن سے بہت زیادہ بڑی حکومتیں بھی اُن سے خوف کھاتی تھیں، اور آج خلافت سے محرومی کے نتیجہ میں باوجود اس کے کہ مسلمان بڑی بڑی بہت سی حکومتوں کے مالک ہیں اور دولت وثروت کی بھی ان کے ہاں کمی نہیں ۔لیکن معمولی سا اسرائیل انہیں خوفزدہ اور لرزہ براندام کئے ہوئے ہے۔اس کے مقابلہ میں احمدیت کے نظامِ خلافت کو دیکھئے۔کوئی حکومت اور کوئی خزانہء دولت اسے حاصل نہیں۔لیکن کئی حکومتیں مل کر بھی اس کوٹس سے مس نہیں کرسکتیں۔

جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں بڑے سبب دو ہی تھے۔اول یہ کہ مختلف قوموں اور قبیلوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ اسلامی فتوحات کا سہرا اُن کے سر ہے۔حالانکہ یہ اُس نعمت کی قدر کے نتیجہ میں انہیں حاصل ہوئی تھیں۔ جو خلافت کے نام سے انہیں عطا ہوئی تھی۔جب انہوں نے اسے اپنی قابلیت اور قوت کا نتیجہ سمجھنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس نعمت سے ہی محروم کر دیا۔جس نے ساری دنیا میں انہیں ایک وحدت میں پروئے رکھا تھا۔دوئم یہ کہ اسلام نے ایک تنظیم اور ڈسپلن کا پابند کر کے تمام مسلمانوں کو مساوات کے ایک خاص اسٹیج پر جمع کر دیا تھا۔وہ تنظیم عدل کی بنیادوں پر قائم تھی۔اُس ڈسپلن کے تحت افراد کو تاکید تھی کہ وہ اپنے نفسوں پر قابو رکھیں۔دوسروں کے حقوق کو اپنے حقوق کے مساوی قرار دیں،قومی مفاد پر انفرادی فائدہ کو قربان کر دیں اور حقوق طلبی کے معاملے میں امن اور نظم کو مقدم رکھیں۔لیکن جب مسلمانوں نے قومی خزانوں کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کیا اور اس کے حصول کے لئے حکام کے قتل کو بھی جائز قرار دے لیا تو اللہ تعالیٰ نے خلافت کی نعمت کو اپنی طرف اٹھالیا اور مسلمانوں کو بتادیا کہ، اچھا اگر یہ تمام قوت وشوکت تمہاری اپنی قابلیت اور تمہارے اپنے زورِ بازو کا نتیجہ ہے تو اب اِسے برقرار اور قائم بھی رکھ

دیکھو۔انجام ہمارے سامنے ہے۔ کچھ ہی عرصے میں مسلمانوں کی رفعت اور شوکت، ذلت و نکبت کا شکار ہو کر پارہ پارہ ہوگئی۔

اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام بادشاہتیں اور قوت مالکیت، صرف اور صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے۔ دنیوی حکومتیں اور بادشاہتیں خدا تعالیٰ کی امانت ہیں۔اُن میں خیانت کا مرتکب خدا تعالیٰ کو جوابدہ ہے۔اس تعلیم کو یقین کے درجہ تک پہنچانے اور دلوں میں راسخ کرنے کیلئے اسلام نے عبادات، تسبیح، تحمید اور تحلیل وغیرہ قسم کے عملی ماحول اور میدان مہیا کئے ہیں۔ یہ ماحول اور میدان بمنزلہ تربیتی کیمپ کے ہیں جن میں کھلاڑیوں اور فوجوں کو تیار کیا جاتا ہے۔اس سے پار اُتر کے ہی مسلمان اپنے مقصد اعلیٰ یعنی قربِ خداوندی کو پاسکتا ہے۔ گویا کہ اسلامی تعلیم کا بنیادی کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات سے ربط پیدا کرنا اور اس کا طریق محمد رسول اللہؐ سے سیکھا جاسکتا ہے۔ یہی اصل الاصول ہے اور دیگر تمام قسم کی عبادات، فرائض، نوافل، اوامر اور نواہی وغیرہ اس کی فروع۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اصل قرار دے کر، دیگر تمام تعلیمات واحکامات اسلامی کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اصل کو پانے کے لئے ایک اجتماعی اور ہمہ گیر پروگرام اور کوشش کی ضرورت ہے۔

میرے عزیزو! یہ کوئی معمولی کام نہیں۔اس کے لئے بلند ترین حوصلے، بے نظیر اخلاقی قوت، بے حد ضبط نفس اور مسلسل جدوجہد درکار ہے۔ پھر بھی نہیں کہہ سکتے کہ معیار کا اعلیٰ ترین پہلو ہمیشہ قائم رہے گا۔لیڈران اور دانشورانِ قوم، اعلیٰ معیار کے ہمیشہ نصیب نہیں ہوتے۔اس کمی یا کمزوری کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کو اپنے ذمہ لے لیا اور شرط یہ لگادی کہ افراد اپنے اعمال اور اخلاق میں صالح رہیں۔یعنی ان کے اعمال کا محور،

لالچ، خودغرضی، جانبداری اور غصبِ حقوق نہ ہو۔ ارشاد فرمایا۔ ”وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ“ (النور: 56) یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ ضرور بالضرور انہیں زمین میں خلیفے بنائے گا۔ بشرطیکہ ان کے اعمال صالح ہوں۔ اسلام نے خلیفہ کے انتخاب اور اس کے کام میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے، شوریٰ کو لازم قرار دیا ہے۔ بظاہر یہ شوریٰ ہی خلیفہ کا انتخاب کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خلیفہ کو ہم منتخب کرتے ہیں۔ چونکہ خلیفہ کے انتخاب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ خود ہی اُس کے کاموں کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے اور کسی ایسی غلطی میں خلیفہ کو نہیں پڑنے دیتا جس سے قوم کا نقصان ہو یا جس سے قوم گمراہی کی طرف جانے لگے۔ شوریٰ کا لزوم بھی اجتماعی قوت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ شوریٰ کا لزوم کئی وجوہ کی بناء پر ہے۔ اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ گویا مسلمان ہر دم یہ محسوس کرتے رہیں کہ انہیں خلافت کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول ؓ نے فرمایا تھا، شوریٰ خلیفہ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہوتی ہے تاکہ وہ اس میں اپنی رائے کا حُسن و قُبح دیکھ لے۔

غرض کہ انسان، جیسا کہ کہا جاتا ہے، ایک معاشرتی حیوان ہے۔ وہ اکیلا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی بقا اور قیام کیلئے اجتماعیت ضروری ہے۔ مگر اجتماعیت کے لازمی نقائص میں سے ایک نقص یہ بھی ہے جذباتِ انسانی اکثر افراط و تفریط کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور یہ افراط و تفریط، لڑائی، جھگڑے، بدامنی اور بدنظمی پر مُنتج ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مجرد عقلِ انسانی دنیا کے مسائل کا حل نہیں ڈھونڈ سکتی۔ تجربہ اور تاریخ یہی بتاتے ہیں کہ انسان اس کارگاہِ سُود و زیاں میں ہر دم کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ دنیا کے بہترین دماغ مل کر بھی جب کسی مسئلہ کا ایک آخری حل تجویز کر لیتے ہیں تو چند دنوں بعد خود ہی اُسے رد کر دیتے اور کسی نئے حل کی تلاش

میں سرگرداں ہوجاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔اور اس کی ترقی و بہبود کیلئے اس نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو مسخّر کیا ہوا ہے۔اُن کے اِس نقص اور عیب کو دور کرنے کے لئے اور عقل کی کامل رہنمائی کے واسطے، اپنی طرف سے وحی والہام کا سلسلہ جاری رکھا۔ایک نظم اور ایک ضبط کے ساتھ زندگی گزارنے اور ہر دم و ہر آن اُسے ترقی کی طرف لے جانے کے لئے مسلمانوں کو تعلیم دی کہ وہ اپنی اجتماعیت کو ایک مرکز کا پابند رکھیں۔وہ مرکز و محور اپنی ذات میں خلیفۃ المسلمین کہلائے۔اُس کا پیش کردہ نظام، نظامِ خلافت کے نام سے موسوم ہو۔اُس کے بتائے ہوئے طریق پر عمل کرنے کو عملِ صالح قرار دیا اور اعمالِ صالحہ پر کاربند افراد کو یہ مژدہ سنایا کہ نظم کی وہ تمام اکائیاں جو انسان کے مختلف اور متنوع شعبہ ہائے زندگی میں بٹی ہوئی ہیں۔ہم نے نظمِ خلافت کے ساتھ وابستہ کر دی ہیں۔اس کی پابندی ہی تمہارے لئے سب سے بڑی سعادت، اور اس کا قائم رکھنا سب سے بڑی نعمت ہے۔اِس نعمت کے حصول کے لئے جہاں مؤمنوں کو اپنی پسند کی آزادی دی، وہیں اجتماعیت کی روح کو برقرار رکھنے کے لئے اکثریت کے فیصلے کو سب کا فیصلہ قرار دیا اور حکم دیا کہ اقلیت کو بھی جو اس انتخاب میں مخالف کا حکم رکھتی تھی دل سے اُس پر ایمان لانا اور اُس انتخاب کو اپنا ہی انتخاب سمجھنا ضروری ہے۔پھر متوازی اِن دونوں فریقوں (موافق و مخالف) کو تسلیم و رضا کی وحدت کے اسٹیج پر جمع کرنے کے لئے صراحت کر دی کہ تمہارا ظاہری یہ انتخاب خدا تعالیٰ کا اپنا انتخاب ہے۔اس کے پیچھے خدا تعالیٰ کا ہاتھ اور اس کی مصلحت کارفرما تھے۔پھر خلافت کے اِس نظام کو جو بظاہر ایک خلیفہ اور اُس کی شوریٰ کے ماتحت ہوتا ہے۔خلافتِ راشدہ اور حکومت الٰہیہ کا نام دے دیا اور اِس طرح آخری درجے پر اُسے اپنی طرف منسوب کر کے اجتماعیت کے اِس عظیم الشان پیکر کو اپنی وحدت کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔خلیفہ کی ہر تجویز اور اُس کا ہر کام جو اجتماعی

نوعیت کا حامل ہو۔القائے الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے۔جب انتخابِ خلافت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ کارفرما رکھا تھا تو اب وہی ہاتھ ہر دم خلافت کو تھامے اور اُس کے پروگراموں کے سہارے رہتا ہے۔

پس! خلافت مسلمانوں کی اجتماعیت اور شیرازہ بندی کا واحد ذریعہ ہے۔اس کا قیام اور اس سے وابستگی ہی تمام سعادتوں کا سرچشمہ ہے اور خدا تعالیٰ کی ناراضی جو آج مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے خلافت کی برکت ہی کے ذریعہ دور کی جاسکتی ہے۔

(25)

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ

اسلام میں نبوت کا حصول صرف مرد کے لئے مخصوص ہے۔عورت کو یہ منصب نہیں دیا گیا۔اس کی وجہ عورت کے بعض ایسے کمزور پہلو ہیں، جن میں وہ مرد کے مقابل کھڑی نہیں ہوسکتیں۔اس کے علاوہ دین کے ہر معاملے میں وہ مرد کے برابر ہے۔عورت روحانی ترقیات میں ،مؤمنہ، ولیہ، صالحہ اور صدیقہ سب کچھ ہوسکتی ہے۔اور جنت کے حصول میں وہ نیکی اور نیکیوں میں برتری کا ہر مقام پاسکتی ہے۔دو مقام تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایسے خاص رکھے ہیں کہ اُن میں وہ امتیازی کردار اور نا قابلِ فراموش کارنامے انجام دے سکتی ہے۔اسلام کے اخلاقی ، اعتقادی، ذہنی اور تہذیبی تسلسل کو قائم رکھنے اور بڑھاوا دینے میں اُسے انفرادیت حاصل ہے۔بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ اُسی کا حصہ ہے۔اُن میں سے ایک کا نام نئی نسل کی دینی تعلیم وتربیت کا ابتدائی کام اور بچوں کے قلب و ذہن میں اسلام کا نقش قائم کرنا اور اُسے مستحکم بنانا۔ اور دوسرے اسلامی معاشرت اور تہذیب کی حفاظت اور نگرانی کرنا یعنی غیر اسلامی معاشرت کے بد اثرات سے انہیں بچانا ہے۔ماہرینِ علم النفس کہتے ہیں کہ بچوں کے ذہن کے سادہ تختی پر جو نقوش ابتداء میں ڈالے جاتے ہیں وہ کبھی مِٹتے نہیں، ہاں دھیمے پڑ جاتے ہیں اور وقت آنے پر دوبارہ اُبھر آتے ہیں۔اور کوئی طاقت اور کوئی تعلیم اور کوئی ادارہ انہیں مٹا نہیں سکتا۔

ماؤں اور بڑی بہنوں اور وہ تمام بزرگ خواتین جو رشتہ دار ہوں اور گھروں میں بہت زیادہ آتی جاتی ہوں، ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو اللہ اور رسول کے نام، ان کی عزت و احترام، زبانی کلمے یاد کروادیں۔ زبانی قرآن کی سورتیں یاد دلانے کے علاوہ اُردو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور گاہے گاہے امتحان بھی لیتی رہیں۔ چونکہ یہ ٹی۔وی کا دور ہے۔ اس لئے شرک سے بھری فلموں اور ڈراموں سے انہیں نفرت دلائیں۔ وحدانیت کی تعلیم اور اہمیت کا انہیں سبق دیں اور اسلام کے لئے خصوصی غیرت انہیں سکھائیں۔ شرک کی برائی سے آگاہ کروائیں۔ شرک سے بیزاری اور نفرت ان کا وتیرہ بنائیں۔ اُردو لکھنا اور پڑھنا سب بچوں کو اچھی طرح آجائے۔ آج لاکھوں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں ایسے ہیں جو اُردو کی ایک سطر بھی نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ضرورت کے وقت اپنا نام بھی صحیح طور پر اُردو میں نہیں بتا سکتے۔ جو بچے اُردو لکھ پڑھ نہیں سکتے ان کے لئے قرآنِ کریم ناظرہ پڑھنا بھی نہایت دُشوار ہو جاتا ہے۔ احمدی بچوں اور بچیوں کے لئے اُردو تعلیم نہایت ضروری ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیادہ تر کتابیں اور ملفوظات اُردو میں ہیں۔ خلفائے سلسلہ احمدیہ کے تمام خطبات اور لیکچرز اُردو میں ہوتے ہیں اور قرآن وحدیث کے تمام درس اُردو میں دیئے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ اُردو تاریخِ اسلام، تاریخِ احمدیت، انبیاء کرام کی سیرت اور اخلاق و اُسوہءِ حسنہ کے سبق اور خصوصاً رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے راشدین کی سوانح عمریاں اور اسلام اور احمدیت سے اُن کی محبت اور قربانیاں، ہر لڑکے اور لڑکی کے ذہن میں محفوظ رہنی ضروری ہیں۔ کفر اور شرک سے نفرت کے علاوہ، اسلام اور احمدیت سے محبت، ان کے لئے قربانیوں کا جذبہ، اپنے مسلمان اور احمدی ہونے پر فخر جذبہء سرشاری، دینِ اسلام کی حمیت اور غیرت، خدا کی اطاعت اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

عشق، محبت اور شیدائیت ہر بچے کا خاصہ اور ایمان کا جُز ہونا چاہئے۔نیکیوں سے محبت اور گناہوں سے سخت نفرت ان کی عادتِ شریفہ بن جانی چاہئے۔جھوٹ سے سخت نفرت اور گھن اور سچائی اور ایمان داری سے لگاؤ اور اسی کو زندگی کا مقصد اور کامیابی اور ترقی کی دلیل سمجھنا ان کی لازمی عادت بن جانی چاہئے۔راست بازی، محنت کی عادت، لالچ اور حسد سے گھن اور نفرت، خدمت اور ایثار کا شوق، خدمتِ خلق کو فرض کی حد تک پہچاننے اور سمجھنے کی اُنہیں عادت ڈال دینی چاہئے۔یہ سارے کام بچوں کی عمر کے اولین حصوں میں انہیں سکھا دینے ضروری ہیں۔جھوٹ سے نفرت، محنت کی عادت اور پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی بچوں کا نمایاں کردار ہونا چاہئے۔جماعت میں نوجوانوں کے لئے خدام الاحمدیہ کا شعبہ اسی بچپن کی تربیت کے تسلسل کا کام ہے۔اگر بچوں سے اُن کی ضروری عمر اور وقت میں غفلت برتی جائے تو آئندہ کوئی بھی بڑی سے بڑی درسگاہ، اسکول، کالج یا اخلاقی ادارہ یہ کام نہیں کرسکتا۔

بچوں کی مثال کھلے ہوئے پھولوں جیسی ہے۔اُن کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔حفاظت ہی سے ان میں نکھار، شادابی اور تازگی قائم رہتی ہے اور لاپرواہی یا توجہ کی کمی سے وہ مرجھا جاتے ہیں۔ماں اور بڑی بہنوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ انہیں حسنِ ادب اور حسنِ تعلیم سے آگاہ کریں۔اسلامی تعلیمات سے انہیں زینت بخشیں، معرفت الٰہی اور معرفتِ رسول کا جذبہ اُن میں پیدا کریں۔اخلاقِ عالیہ کا انہیں حامل بنائیں۔اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ جمیلہ کے وہ مالک بنیں۔بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کا انہیں سبق دیں۔خود بھی انہیں عزت واحترام دیں۔رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ چھوٹوں کے ساتھ بھی احترام سے معاملہ کرو۔میرے والد کے ایک معزز دوست ملک بشیر الدین خان صاحب بحرین میں ہوتے ہیں۔چند سال قبل اُن کی والدہ صاحبہ فوت ہوئی ہیں۔ملک صاحب کی پیدائش کے بعد سے

اپنی وفات تک اُن کا یہ اُصول تھا اپنے بیٹے کے شکرانے میں وہ ہر روز دو رکعت نفل پڑھا کرتی تھیں۔ ماں کی دعاؤں کے طفیل ملک صاحب آج بھی اسلامی اخلاقِ فاضلہ کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں اور دن میں ہمیشہ باوضو رہتے ہیں۔ حضرت معین الدین چشتیؒ ایک دفعہ بنگال کے تبلیغی دورے پر گئے۔ وہاں سے واپسی پر کئی لاکھ ہندو اُن کے حلقہء ارادت میں داخل ہوئے تھے۔ اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُن کی والدہ محترمہ کو معلوم ہوا تو کہا کہ تمہاری خوشیوں میں میرا بھی حصہ ہے۔ پوچھنے پر بتایا کہ تمہاری پیدائش کے بعد مَیں نے تمہیں بغیر وضو دودھ نہیں پلایا۔

ہماری جماعت میں خلافت کی برکتوں کے سبب، احمدیوں کے ہر شعبہ زندگی میں گہما گہمی، خلوص اور ایمان ووفا کا دور دورہ ہے۔ احمدی عورت حلم اخلاق اور علم کی حریص ہونی چاہئے۔ تربیت کے باب میں ہماری ماؤں اور بہنوں کی متعدد مثالیں ہیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ(ابنِ ماجہ) کہ علم کا حاصل کرنا اور اس کے لئے محنت وسعی کرنا، ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ جب بچیاں دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو کشیدہ کاری، سینا اور پرونا اور گھریلو دست کاری کے بے شمار ہنر سکھائے جاسکتے ہیں۔ درونِ خانہ زینت اور آرائش کے بہت سے ہنر ہیں جو سلیقہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال، صحت وتندرستی اور موسمی بیماریوں سے انہیں بچائے رکھنا وغیرہ یہ سب کام عورتوں کے کرنے کے ہیں۔ عورت کی نزاکت اپنی جگہ، لیکن اس کا وجود بجائے خود ایک زبردست طاقت کا مظہر ہے۔ عورت اتنی بڑی طاقت ہے کہ مرد پیدا کرتی ہے۔ جماعت احمدیہ میں سر ظفر اللہ خان صاحب اور ڈاکٹر عبد السلام صاحب احمدی ماؤں کے گود کے پالے اور اُن کی تربیت اور دعاؤں کے ہی شہ کار تھے۔

ہمارے خلفاء میں خلیفہ اولؓ اور دوئم حضرت مصلح موعودؓ اوران کی رہنمائی میں ہمارے بعد کے خلفائے کرام اور علمائے عُظام جو خدا کی قدرت اور رحمت سے بولتے ثمر تھے اور ہیں۔

جب علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے تو صرف مردوں کو ترقی کے زمرے میں شامل کرنا، یا مردوں تک ہی تعلیم کو محدود رکھنا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کے خلاف ہے۔ بچیوں، لڑکیوں اور عورتوں کا بھی اس خصوص میں بھر پور حصہ لینا اور ترقی کرنا بھی لازم اور ضروری ہے۔ اگر ہماری لڑکیاں اور عورتیں تعلیم سے دور رہیں تو اسلامی تعلیمات جو مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں یقیناً نصف رہ جائیں گی اور یکطرفہ روش کہلائیں گی۔ ہمارا پورا نظامِ تربیت، نظامِ معاشرت اور نظامِ مذہبی تقاضا کرتا ہے کہ ہماری تمام نسل مرد وعورت دونوں اپنی خصوصی کارکردگی میں جو دینِ اسلام سے متعلق ہے پورے طور پر آگاہ ہوں اور اُس میں عملاً بھر پور حصہ لینے والے ہوں۔ اسی لئے جماعت نے اطفال نو جوانوں اور بوڑھوں کے تمام شعبوں میں تربیتی بیداری اور حسنِ کارکردگی کے تمام مواقع کھلے رکھے ہیں۔ اسی طرح ناصرات اور لجنات کے دونوں شعبے اپنی عمر کے کسی بھی حصے میں تربیتی، تمدنی، مذہبی وغیرہ کسی بھی لحاظ سے محافظت سے عاری نہیں چھوڑے گئے ہیں۔ اسلام کی کِشتِ زار میں ماؤں اور بہنوں کے بیج ہی پھل پھول لاتے، لہلہاتے، مسکراتے، اپنی شادابی کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے کو ہمیشہ قائم رکھنا اور دوام بخشنا ہم ماں باپ، انصار اللہ اور بزرگوں کا کام ہے۔ بڑے بھائیوں اور بڑی بہنوں کی خصوصی دلچسپی اور ذمہ داری کا متقاضی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

۱۸ر دسمبر ر ۲۰۰۹ء

(26)

حضرت نبی ءکریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی

کسی بھی شخصیت کے مزاج، اخلاق اور عمل و کردار کی تعمیر میں اسکے بچپن کا ماحول، رہن سہن، ملکی حالات اور رسم و رواج کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شخصیت کی تعمیر اور تخلیق اس کے ماحول کی اثر انگیزی کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے عاقل، فلاسفر، مصلح اور رہنما بھی اس کلیہ سے آزاد نہیں رہے۔ کسی نہ کسی رنگ میں وہ خارجی اور داخلی طور پر ماحول سے متاثر ہوتے اور اپنے مزاج و عمل میں اسکی کوئی نہ کوئی چھاپ رکھتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر کلیہ اپنی جز میں استثناء کا کوئی نہ کوئی پہلو لئے ہوتا ہے۔ میرے آقا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، استثناء کے اس پہلو کی ایک عظیم الشان اور نادر مثال ہے۔ یوں تو دنیا نے اپنے اپنے قومی ہیروؤں (HEROES) کی زندگیوں اور ان کے کارناموں کو طرح طرح سے محفوظ و مصئون کرنے کی سعی کی ہے۔ خصوصاً پیروان انبیاء کرام اپنے آپ کو اپنے نبی کے رنگ میں رنگین کر کے اور اپنے اعمال کو اس نبی کے اسوہ میں ڈھال کر، اسکی شخصیت، اسکی تعلیم اور اسکے کردار کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے جس زیرکی اور فراست کے ساتھ اپنے اس فرض کو پہچانا اور محسوس کیا اور جس جانفشانی اور کاوش سے اپنے آقا و مطاع کی زندگی اور اسکی ایک ایک جز کو عملاً قائم رکھنے کی سعی بلیغ کی ہے، اسکی نظیر صفحہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس پاک اور عظیم المرتبت نبی کے حالاتِ زندگی کی تحقیقات جو آپ کے قیام مکہ

سے متعلق ہے،اس قدر نہیں کی گئی جس قدر کہ آپکے قیام مدینہ کی کی گئی۔

ابتدائی مورخین اگر کوشش کرتے تو آج آپ کے حالات مزید تفصیلات کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتے۔ پھر بھی جس قدر حالات اور واقعات آپ کے محفوظ کئے گئے، وہ بھی اتنے تفصیلی اور مرتب ہیں کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر و رہنما یا نبی کو بھی نصیب نہیں ہوئے بلکہ بیشتر حال کے گزرے ہوئے لیڈران قوم کے حالات سے آپ کے حالات کا مقابلہ کیا جائے تو بھی آپکے کوائف اور آپکی مصروفیت اور اعمال کی تفصیلات اتنی مربوط اور اس قدر مرتب اور نمایاں ہیں کہ آپ کا ایک معجزہ معلوم ہوتی ہیں۔ جتنا کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر دنیا نے کیا اور جیسی تعریف وتوصیف آپ کی دنیا میں ہوئی اور ہوتی ہے، اور کسی ماں کے لال کو نصیب نہیں ہوئی، یہی آپ کے اِسم گرامی ''محمدؐ'' کا مفہوم ہے، یعنی بہت زیادہ تعریف کیا گیا۔

سامعین کرام! خوبیوں کے تمام قیمتی جوہر جو چیدہ طور پر صرف خال خال شخصیتوں میں پائے جا سکتے ہیں، اور خصوصی مُستثنیات کا حکم رکھتے ہیں، اپنی تمام توانائیوں اور درخشندہ اِضافتوں کے ساتھ میرے آقا میں جمع ہو گئے تھے۔غور فرمایئے! ایک مُہیب ظلمت کدہ میں پیدا ہونے والا بچہ، اپنے جسم کے ایک ایک رواں سے نور کی بارش برسائے۔ایک جہل وگمراہی کی وادیوں میں جنم لینے والا انسان، علم وہدایت کے دریا بہائے۔ایک عفریت آسا قوم کا فرد خلق اور حلیمی کے دفتر پیدا کر دکھائے۔ایک قافلہءراہِ گم کردہ کا مسافر منزل عرفان کا رہبر بن جائے اور ایک ظلم وتعدی سے معمور معاشرے کا پالا، مساوات کا علمبردار اور امن وسکون کا ضامن کہلائے۔کیا یہ سب ممکنات میں سے ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔مگر ایک شخص ہوا ہے، جسے قدرت نے اپنے اس عام کلیہ سے مستثنٰی رکھا۔ وہ ماحول کی سرگرانیوں سے مستغنی اور عام

روایتوں کے اصولوں کی پابندی سے بے نیاز رہا۔ میرا آقا صلی اللہ علیہ وسلم۔

شراب، جوا، زنا، بغض، عداوت، فساد، نافرمانی، نا اہلی، بغاوت، شقاوت، بے جا غرور، نادر احساس برتری، ظلم و تعدی، ناانصافی، لوٹ کھسوٹ، غصبِ حقوق، بدزبانی، بدشعاری، بے علمی، کم آمیزی، اور بدمعاملگی، غرض کون سی برائی ہے جو اہلِ مکہ میں نہیں۔ مگر ایک خوبی اُن میں بھی نظر آتی ہے۔ یعنی خوب سے خوب تر کی قدر و منزلت، وہ اپنوں میں ایک بیگانے کو دیکھتے ہیں، مگر اسے بیگانہ نہیں کہتے بلکہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ اُسے امین اور صدوق کا لقب دیتے ہیں اور ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ انہیں اپنی خرمستیوں اور اوباشیوں پر ناز ہے لیکن ان کی فطرت پاکیزگی اور طہارت کی مزاج آشنا بھی ہے اور جوہر شناسی کے فن سے بالکلیہ بیگانہ وش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پر ایمان لانے اور **سابقون الاولون** کہلانے والے اسی ماحول کی پیداوار تھے۔ **رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ**۔

میرے آقا کا بچپن ہر قسم کی ناسمجھی اور لاپرواہی کی آلودگیوں سے پاک اور ہر طرح کی حرص و آز سے عاری ہے۔ آپؐ اپنے چچا ابوطالب کے گھر رہتے ہیں۔ آپ کی چچی اپنے بچوں کو کوئی چیز کھانے کو دیتی ہیں۔ بچے ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک اودھم مچا ہوا ہے لیکن ایک بچہ ہے کہ کونے میں خاموش کوہِ وقار بنا بیٹھا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپؐ کی جوانی ہر بے اعتدالی اور بے راہ روی سے متنفر اور سنجیدگی و بزرگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ ہر معیار پر پورا اُترتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک طاہرہ اور پاکیزہ عورت کی نظر آپ پر پڑتی ہے۔ وہ عورت اپنی عمر، اپنے تجربے، اپنے مال و دولت اور اپنے اثر، و وجاہت میں اپنی قوم میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے زمانے کے سرد و گرم سہہ چکی ہے۔ اسے کوئی اور ایسا نظر نہیں آتا کہ وہ اسے آپؐ کا ہم پلہ قرار دے۔ وہ آپ کو شادی کا پیغام بھجواتی ہے۔ آپؐ عمر میں پندرہ سال اس سے چھوٹے ہیں اِدھر جوانی آپؐ

سے گلے مل رہی ہے۔ اُدھر بڑھاپا اس کے قدم لینے کو بڑھ رہا ہے۔مگر آپؐ نے دنیا سے نرالا ایک معیار پیشِ نظر رکھا کہ عورت کی اخلاقی اور دینداری نمایاں ہوں ۔آپ اُس پیغام کو قبول فرما لیتے ہیں۔

چالیس سال کی عمر میں آپؐ دعوٰی نبوت کرتے ہیں، ایک تڑپ، ایک جوش اور ایک بے پناہ جذبہء ہمدردی ہے کہ آپ کے سینے کو برمائے ہوئے ہے۔آپؐ مدتوں کی بگڑی اور سرپھری قوم کو فلاح اور کامیابی کا مژدہ سناتے ہیں ایک دم سے قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ اوج پر پہنچا دینے کا وعدہ کرتے ہیں، صرف اس شرط پر کہ قوم خدائے واحد کو ہی سب کچھ سمجھے۔اسی کی عبادت کرے، اسی سے مانگے ،توہمات کو چھوڑ دے، اچھے اور برے میں تمیز کرے۔ عورتوں اور بیویوں کے ساتھ عمدہ اخلاق برتے۔یتیم بچے کا مال نہ مارے۔بیواؤں کو ذلیل نہ ٹھہرائے۔غریبوں اور کمزوروں پر رحم کرے۔جھوٹ اور فریب سے بچے۔ چوری اور ڈاکہ سے علاقہ نہ رکھے، جوئے اور شراب کا شغل چھوڑ دے۔علم حاصل کرے۔قومی خدمت کی طرف متوجہ ہو۔ظلم وتعدی سے پرہیز کرے۔مال ہو تو ملک وقوم کی خدمت اور کمزوروں اور غریبوں کی خدمت کے لئے خرچ کرے۔عورتوں کے حقوق ادا کرے،فرمایا کہ یتیم اللہ کی امانت ہیں۔ان کی خبر گیری کو ایک اعلیٰ نیکی سمجھو۔بیواؤں کا سہارا بنو۔نیکی اور تقوٰی کو قائم کرو۔اِنصاف اور عدل سے بڑھ کر احسان کو شعار بناؤ۔حق لے لینا کمال نہیں۔ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کمال ہے۔اپنی کمزوریوں پر نظر نہ رکھو اور یہ نہ سوچو کہ ہم کیونکر ترقی کرسکتے ہیں۔آسمان پر سچائی کی حکومت کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔انصاف اور رحم کی حکومت قائم ہونے والی ہے۔اُس حکومت میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ مذہب کے اختیار میں آزادی حاصل رہے گی۔عورت اور غلام پر کئے جانے والے جَور وستم مٹادئے جائیں گے۔شیطان کی صف لپیٹ

دی جائے گی۔اور صرف اور صرف خدائے واحد و یگانہ کی حکومت قائم ہوگی۔

آپ کی قوم اپنے غرور و پندار میں آپ کو نہیں مانتی۔آپ پر طرح طرح کے ظلم کرتی ہے۔عرصہءحیات آپؐ پر تنگ کر دیا جاتا ہے۔لیکن پھر بھی آپ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل کا یہ اقرار تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ اے محمدؐ! ہم تجھے جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس پیغام کو جھوٹا اور غلط سمجھتے ہیں جسے تو پیش کرتا ہے۔آج کے یوروپین مستشرقین بھی اپنی ترقیات علمی کے باوصف ابوجہل کے ذہن کے برابر ہی پہنچ سکے ہیں۔

چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

''محمدؐ نے جو دعوٰی پیش کیا اُس میں وہ مخلص تھے یعنی وہ دل سے یقین رکھتے تھے کہ وہ خدا کے نبی ہیں اور اسی بات کو انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کر دیا۔ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ دانستہ جھوٹا دعوٰی کرتے تھے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی''۔

ایک چھوٹا سا قافلہ آپ کے ساتھ ہے۔ایک عورت جو بڑھاپے کی سرحد کو پہنچ چکی ہے۔ایک متوسط العمر دوست جو آپ کا پرانا ساتھی ہے، ایک گیارہ سالہ نوعمر لڑکا اور ایک نوجوان غریب الوطن آزاد کردہ غلام۔یہ چھوٹا سا قافلہ ایک عزم محکم کو لئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ہر خوف سے بے نیاز، ہر خطرے سے بے پرواہ اور ہر ناامیدی سے مستغنی، لوگ اشاروں میں باتیں کرتے ہیں۔اُن کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔قہقہے لگائے جاتے ہیں،مگر آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔زیادہ تر ایسے ہی لوگ آپ کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ جو غریب اور بے مایہ ہیں۔کمزور اور بے سہارا ہیں ۔غلام ہیں۔نوعمر اور مظلوم ہیں۔عورتوں نے آپ کی آواز میں اپنے حقوق کی محافظت پائی غلاموں نے آپ کے چہرے

کی مسکراہٹ میں اپنی آزادی کا اعلان سنا اور نوجوانوں نے آپ کی صحبت میں اپنی امیدوں اور تمناؤں کے پھول کھلتے محسوس کئے۔لیکن اِدھر اہلِ مکہ نے بھی اس خطرے کو بھانپ لیا جو ان کی تہذیب اور رسم رواج پر تبر رکھنے والا تھا۔جس کے منشور میں ایک نئی زمین اور ایک نئے آسمان کی تخلیق کا عزم پوشیدہ تھا۔عربوں کی غیرت پر ایک طمانچہ لگا۔بھلا وہ کس طرح اپنی پرانی قدروں کو مسمار ہوتے برداشت کر سکتے تھے۔ایک نیا فکری انقلاب اس قدر آسانی کے ساتھ اُن کے مغرور اور متکبر سماجی خیالات کو پسپا نہیں کرسکتا تھا۔پس اسلام کا پیغام انہیں ایک چیلنج محسوس ہوا۔انہوں نے اس چیلنج کو قبول کرلیا مگر اسی ارادے اور نیت کے ساتھ جس ارادے اور نیت کے ساتھ شیطان نے رحمن کے چیلنج کو قبول کیا تھا۔حق و باطل میں پھر ٹھن گئی۔نور اور ظلمت پھر نبرد آزما ہوگئے۔ان غریبوں،معصوموں اور بے کسوں کی کیا مجال تھی کہ ائمۃ الکفر کے سامنے سینہ پُھلاتے۔عورتیں نہایت بے شرمانہ طریق پر قتل کی جانے لگیں۔مرد انتہائی بربریت کے ساتھ چیرے جانے لگے۔غلام تپتی ریت اور نکیلے پتھروں پر گھسیٹے گئے،یہاں تک کہ ان کی کھالیں جانوروں کی طرح سخت اور بدنما ہوگئیں۔مگر یہ تمام حادثات ان کے پائے اِستقلال کو ڈگمگا نہ سکے۔یہ خوش نصیب بلالؓ تھے۔صہیبؓ تھے۔جبیرؓ اور عمارؓ تھے۔یاسرؓ تھے۔سُمیہؓ اور زنیرہؓ تھیں۔ابوفکیہؓ تھے۔اِن بے کسوں پر کئے جانے والے ظلم انسانی طاقت سے بالا تھے مگر اُن کے سینوں میں پوشیدہ دل بھی عام انسانی دلوں سے مختلف اور اُن میں بھرا ہوا ایمان،عقیدت سے بہت زیادہ قیمتی اور وزنی تھا۔فرشتے صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی نہیں،صحابہ کے دلوں پر بھی نزول فرما رہے تھے۔ان کے اپنے انہیں چھوڑ چکے تھے،لیکن اُن کا خدا ان کے ساتھ تھا۔اُن کے دل اس خدائے واحد و یگانہ کے گھر بن چکے تھے۔خدا کی ایک بات اُن کے دلوں پر کئے گئے تمام مظالم کو گنج راحت میں بدل دیتی تھی۔اُدھر مخالفتیں بڑھ رہی

تھیں۔اِدھر ایمان ترقی کر رہے تھے۔ظلم کے مقابلہ میں خلوص اپنا گھیراؤ وسیع کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تمام جذبوں کو پار کر کے اوپر نکل گیا۔

سبّ وشتم کی یہ کاروائیاں کمزوروں اور غلاموں تک ہی محدود نہ تھیں۔آزاد مسلمان بھی اس کا نشانہ تھے۔حضرت عثمانؓ ،حضرت زبیرؓ اور حضرت ابوذرؓ بھی تختہءِ مشق بنے، یہاں تک کہ خود میرے آقا (فداہ ابی واُمّی) کی ذات بھی محفوظ نہ رہی۔آپ کے گلے میں پٹکا ڈال کر کھینچا گیا۔ پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی۔راستہ چلتے سر پر خاک ڈالی جانے لگی۔لیکن یہ طغیان وتعدی خالی نہ گئے۔اہلِ دل جب اِن نظاروں کو دیکھتے تو اسلام کی طرف مائل ہوتے جاتے۔انہی دنوں اہلِ مکہ کا ایک وفد ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔اِس پیغام کے ساتھ کہ وہ اپنے بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دیں یا پھر اپنی سرداری سے ہاتھ دھو بیٹھیں ۔ یہ بات کسی بھی صاحبِ حیثیت وقدرت آدمی کے لئے بڑی ہی پریشان کن اور حوصلہ شکن ہے۔ابوطالب نے ڈبڈباتی آنکھوں سے بھتیجے کی طرف دیکھا۔غیور بھتیجے کی آنکھیں بھی پرآب ہوگئیں۔اُس نے کہا تو صرف یہی کہ میرے چچا! آپ میری وجہ سے اپنی قوم کو ناراض نہ کریں۔ مجھے چھوڑ دیں، خدا کی قسم! اگر سورج اور چاند بھی میرے دائیں اور بائیں لا کھڑا کر دئے جائیں تب بھی توحید کے وعظ سے دست کش ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔ہاں موت ہی آجائے تو اور بات ہے۔ابوطالب اِس غیر متزلزل مظاہرہءِ ایمان سے مغلوب ہوگئے اور اعلان کر دیا کہ بے شک میری قوم مجھے چھوڑ جائے، مَیں اپنے بھتیجے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

ظلم وستم اور جور وطغیان کی کاروائیاں جاری رہیں۔مُٹھی بھر مسلمانوں کو اسقدر تنگ کیا جانے لگا کہ سکون اور یکسوئی کے ساتھ کوئی کام کرنا اور ٹھوس اور منظم طور پر اپنے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانا اُن کے لئے دُشوار ہو گیا۔اپنے نبی کی اجازت سے مسلمان آہستہ آہستہ حبشہ کی

طرف ہجرت کرنے لگے۔اس پر بھی اہلِ مکہ کو چین نہ آیا۔والیٔ حبشہ نجاشی کے دربار میں شکایت پہنچائی گئی لیکن ذلیل اور ناکام لوٹے۔انہی دنوں حضرت عمرؓ کو اسلام لانے کی توفیق ملی۔یہ مسلمانوں کے لئے ایک خوشکن بات تھی۔ایک جری اور دلیر مخالف اب موافق بن چکا تھا۔تاہم وہ آزادی جو ایک عظیم مشن کو دنیا میں پھیلانے کے لئے ضروری ہے اب بھی مفقود تھی۔حضرت عمرؓ بھی اسلام لانے کے بعد مکہ کی گلیوں میں پٹنے سے نہیں بچ سکے۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قوم نے مسلمانوں کا اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں کا مکمل بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔بازار سے سودا سلف تک بھی دستیاب ہونا اُن کے لئے ممکن نہیں رہا۔کسی اور معاملہ میں تعاون اور مدد کی تمام راہیں بھی اُن کے لئے بند ہوگئیں۔کمزور اور بے سہارا، یہ لوگ شعب ابی طالب میں محصور ہوگئے۔تقریباً تین سال اُن کا مقاطعہ رہا۔نہ کھانے پینے کا کوئی مستقل انتظام تھا، نہ امن وسکون کی کوئی ٹھوس سبیل۔ظلم سہتے اور تکالیف برداشت کرتے کرتے اُن کے جسم اِس قدر کمزور ہوگئے کہ محصوری کی یہ حالت ختم ہونے کے چند ہی دنوں بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دست راست اور وفا شعار بیوی حضرت خدیجہؓ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔کچھ دن اور نہ گزرے تھے کہ آپ کے شفیق چچا ابو طالب بھی اِس دنیا سے منہ موڑ گئے۔یہاں سے ایک نیا دور مسلمانوں کو دکھ دینے کا شروع ہوا۔پہلے اہلِ مکہ آپ کو ایذاء پہنچاتے مگر بات تو کر لیتے تھے۔اب انہوں نے بات نہ کرنے اور آپ کی بات نہ سننے کی ٹھانی۔یہ امر آپ کے لئے غایت درجہ تکلیف دہ تھا۔آپ باہر نکلتے تو سر خاک آلود کر دیا جاتا تا کہ آپ کسی سے مل نہ سکیں۔آپ گھر لوٹ آتے۔آپ کی ایک بیٹی سر اور دوشِ مبارک سے مٹی صاف کرتیں اور روتی جاتیں۔آپ فرماتے بیٹی روؤ نہیں۔خدا تمہارے باپ کے ساتھ ہے۔

جب آپ نے اہلِ مکہ کی یہ حالت دیکھی تو طائف کا عزم کیا کہ وہاں جا کر شرفاء کو اسلام کا پیغام سنایا جائے۔ اہلِ طائف اپنی شوخیوں اور شرارتوں میں اہلِ مکہ سے کم نہیں تھے۔ وہاں سے بھی آپ ناکام لوٹے۔ اہلِ مکہ نے آپ کا استقبال ہتک آمیز الفاظ کے ساتھ کیا اور اِس حالت میں آپ کو رخصت کرنے شہر سے باہر تک آئے کہ آپ مسلسل سنگباری سے لہولہان ہو چکے تھے۔ زیدؓ آپ کے ساتھ تھے۔ وہ بھی آپ کو بچاتے بچاتے سخت زخمی ہو گئے۔ آپ کا یہ سفر پامردی اور استقلالِ قوی کا ایسا مظاہرہ تھا کہ ولیم میور جیسا مخالف بھی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ''محمدؐ کا طائف کا سفر ایک شاندار، شجاعانہ رنگ کا حامل ہے۔ اکیلا آدمی، اپنی قوم کا دھتکارا ہوا، خدا کے نام پر بہادری کے ساتھ نینوا کے یونا نبی کی طرح ایک بت پرست شہر کو توبہ کرانے اور خدائی مشن کی دعوت دینے کے لئے روانہ ہوا۔ یہ امر اس بات پر کامل روشنی ڈالتا ہے کہ آپ خود کو کلی طور پر خدا کی طرف سے مامور سمجھتے تھے اہلِ مکہ کی ستم رانیاں اور بڑھیں۔ مکہ جہنم کا نمونہ بن گیا۔

مگر آپ کی دلیری میں کوئی فرق نہ آیا۔ آپ اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔ اُسی جرأت اور محبت کے ساتھ، اسی خیر خواہی سے، اسی پیار کے ذریعہ جو خاص آپ کا حصہ تھا۔ جو لوگ آپ کے حلقہ بگوش ہو جاتے، ساری قوم کے مطعون بن جاتے، ماریں کھاتے، دکھ سہتے، رشتہ داروں سے چھوٹ جاتے، مگر آپ کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے۔ جب گرمی اور حدّت اپنی حد سے گزر جاتی ہے تو رحمتِ خداوندی جوش میں آتی اور بارش بن کر دنیا پر نازل ہوتی ہے۔ جاں بلب روحیں اس سے سیراب ہو کر پھر زندگی کے قریب ہونے لگتی ہیں۔ یہی حال سبّ وشتم اور ظلم وتعدی کا بھی ہے۔ آپ کو بار بار ہجرت کی خبریں ملنے لگیں۔ اہلِ مدینہ تک آپ کا پیغام پہنچا تو وہ آپ کی طرف مائل ہوئے۔ اور ابھی آپ کے دعوٰی پر تیرہ سال ہی

ہوئے تھے کہ آپ کو ہجرت کا حکم مل گیا۔

❁❁❁

باستفادہ سیرت حضرت خاتم النبیینؐ از حضرت مرزا بشیر احمدؓ ایم۔اے

(27)

مسئلہ تعدّدِ ازدواج

ازدواج ایک تمدنی مسئلہ ہے اور کم وبیش ہر متمدن بلکہ غیر متمدن اقوام میں بھی کسی نہ کسی شکل میں مروج ہے۔ اسلام نے رہبانیت سے منع فرمایا اور نکاح کو ضروری قرار دیا ہے۔ سوائے اِس کے کوئی صورتِ معذوری ہو۔ انبیاء کے لئے اور خصوصاً شارع نبی کے لئے تو شادی کرنا اَزبس ضروری ہے۔ تا وہ اپنی حسنِ معاشرت کا نمونہ اپنی امت کے واسطے قائم کرسکے اور اس لئے بھی کہ تبلیغِ دین اور احکام کے کام میں اس کی بیوی اس کی مددگار ہوسکے۔ عورتوں سے متعلق جو مسائل ہوتے ہیں، ان کی تبلیغ و تعلیم جس خوبی کے ساتھ ایک عورت کرسکتی ہے، مرد نہیں کرسکتا، بلکہ انبیاء کے واسطے تو ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سے زائد شادیاں کریں، تاکہ تبلیغ کا کام آسان ہوجائے۔ اسی لئے اکثر گزشتہ انبیاء بھی تعددِ ازدواج کے مسئلہ پر کاربند تھے، اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ عیسائی آج تعددِ ازدواج کو آڑ بنا کر مسلمانوں پر معترض ہوتے ہیں، حالانکہ یہ سنت خود ان کے انبیاء کی قائم کردہ ہے۔ عیسائیوں کے ایسے ہی اعتراضات سے متأثر ہوکر مسلمان بھی اِس کو ایک قبیح رسم اور مسئلہ سمجھنے لگے ہیں۔ اور اسے ایک ذریعہ عیش خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دُنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں جو بظاہر خوشنما اور سننے میں کانوں کو بھلے لگتے ہیں لیکن عمل کی کسوٹی پر آکر اور ہی رنگ اختیار کرلیتے ہیں ۔ مسئلہ تعددِ ازدواج بھی ان ہی میں شامل ہے۔ اسلام نے نکاح کے ساتھ جن شرائط کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً یکساں سلوک، عدل،

تعہد نان ونفقہ اور مہر وغیرہ، اُن کی پابندی کے ساتھ نکاح ہرگز عیاشی کی تعریف میں نہیں آسکتا۔ اور پھر ہمارے پیارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں کا معاملہ تو بالکل ہی الگ شئے ہے۔ اُس پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اُس وقت کے ماحول اور اسلام کے تمام تدریجی حالات و نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے ماننے اور انکار کرنے والوں کے سارے واقعات کو نظر کے سامنے رکھا جائے اور عربوں کی قبائلی زندگی اور اُن کے مخصوص عادات، رسومات، اور اعتقادات پر عبور حاصل کیا جائے۔ حضرت خدیجہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت شادی کی جبکہ خود آپ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔ پھر چھبیس ستائیس سال آپ نے اُن کے ساتھ گزارا کیا اور کبھی کسی اور شادی کا خیال بھی آپ کو نہیں آیا۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک خلاء پیدا ہو گیا تھا۔ اور ضرورت تھی کہ کوئی ایسی عورت آپ کے نکاح میں آئے جو معیارِ نبوت پر پوری اُترے، آپ کی رفیق و جان نثار ہو، و نیز اپنے عمل و کردار، فرمانبرداری، مستعدی، جوش تبلیغ، دین کے سیکھنے، سکھانے کی زِیرکی اور صحت مند قوت اِجتہاد میں بھی اس پایہ کی ہو کہ نبی کی شایانِ شان معاون ثابت ہو سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے دعائیں شروع کیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو رؤیا کے ذریعہ اپنے انتخاب کی خبر دی کہ ان تمام خوبیوں کی اہل عائشہؓ ہیں۔ چنانچہ ایک سبز کپڑے پر حضرت عائشہؓ کی تصویر آپ کو دکھائی گئی اور کہا گیا کہ اب یہ تیری بیوی ہے۔ دنیا و آخرت میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ چند دنوں بعد حالات پیدا ہو گئے۔ یعنی خولہ بنت حکیم زوجہ عثمان بن مظعون جو رشتہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوتی تھیں، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کس سے کروں؟ انہوں نے عرض کیا کہ آپ چاہیں تو کنواری بھی موجود ہے اور بیوہ بھی۔ آپ نے پوچھا کون؟ عرض کیا کہ کنواری تو عائشہؓ ہیں۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اُس وقت اتنی کم عمر نہیں تھیں جتنی کہ عام روایتوں میں بتائی جاتی ہیں) اور بیوہ سودہ بنت زمعہ جو آپ کے خادم سکران بن عمرو مرحوم کی بیوہ ہے۔ (واضح ہو کہ حضرت سودہؓ اس وقت کافی پختہ عمر کو پہنچ چکی تھیں، یہاں تک کہ حضور سے نکاح کے چند دنوں بعد ہی مباشرت کے قابل نہیں رہیں، ان کا کوئی والی و مددگار نہیں تھا، اور اُس وقت کے کفار کے ظلم وستم کی وجہ سے غریب، نادار اور لاوارث مسلمان ایک انتہائی صبر آزما دور سے گزر رہے تھے۔ عمر میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدھا سال ہی چھوٹی تھیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اِن دونوں کے متعلق بات کرو۔ چنانچہ بات ہوئی دونوں فریق نے بھی رضامندی کا اظہار کیا۔ اور چار چار سو درہم حق مہر پر نکاح پڑھا گیا۔ تقریبِ رخصتانہ صرف سودہؓ کی عمل میں آئی اور حضرت عائشہؓ کو بوجہ کم سنی، تین چار سال بعد رخصت کیا گیا۔ اب یہاں چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال یا نو سال تھی یا اس سے کم وزیادہ؟ واضح ہو کہ اس بارہ میں نہ تو قرآن سے اور نہ ہی کسی صحیح حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چند باتیں جو اعتبار کے درجہ سے ساقط ہیں، مشہور ہوگئی ہیں، ورنہ قرآن اور احادیث اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ دوسرا یہ کہ اُن کی عمر کے چھوٹے یا بڑے ہونے پر اعتراض ہوتا تو اُن کے والدین کو ہوسکتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ پھر آج کسی کا اس مسئلہ کو اعتراض کی صورت میں اٹھانا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟ تیسرا یہ کہ اُس زمانہ کی روایت کے مطابق عربوں میں چھوٹی اور بڑی عمر کی شادیاں نہ تو معیوب تھیں اور نہ، قابلِ اعتراض سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے ہی نہیں بلکہ مخالفین میں سے بھی کسی نے نہ تو اس شادی کا مضحکہ اڑایا اور نہ

اسے ایک قبیح فعل قرار دیا۔ چوتھا یہ کہ اصولاً کُل کے سامنے جز کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو جسے قرآنِ مجید نے کفار کے سامنے ان الفاظ میں پیش فرمایا تھا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس:۱۷) کہ مَیں نے ایک عرصہ تمہارے اندر گزارا ہے، اور تم مجھ سے خوب واقف ہو۔ تم میں کوئی ہے جو میری زندگی کے کسی گوشے پر حرف گیری کر سکے؟ اور اس کے مقابلہ میں تاریخ بتاتی ہے کہ کفار نے کوئی چون و چرا نہیں کی اور زبانِ حال سے اس دعوٰی کو صحیح اور درست تسلیم کرلیا۔ قرآنِ مجید کی تو یہ تعلیم ہے کہ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ یعنی تمہارے نکاح کا مقصد تو یہ ہونا چاہئے کہ تمہیں عفت اور پرہیزگاری حاصل ہو اور شہوات کے بدنتائج سے تم بچ جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ تم حیوانات کی طرح بغیر کسی پاک غرض کے شہوات کے بندے ہو کر اس کام میں مشغول رہو۔ پس ایک نبی شارع جس نے خود یہ تعلیم ہمیں دی ہے، کیا اس کے بارہ میں تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کا فعل اس کے قول سے متضاد تھا؟ ہرگز نہیں۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں کہہ دیتے ہیں کہ فطرتِ انسانی بہرحال تعددِ ازدواج کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس بارہ میں عرض ہے کہ نورِ فطرت بعض دفعہ مخالف عناصر کے نیچے دب کر کمزور اور مُردہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اور ایسی صورت میں اس کا فتوٰی قابلِ قبول نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو پھر سے تعصّبات سے پاک نہ کیا جائے۔ مثلاً طلاق کا مسئلہ ہے۔ عیسائیوں میں صدیوں سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ طلاق صرف ایسی صورت میں جائز ہے جبکہ مرد اپنی بیوی کو کسی غیر مرد سے بدکاری میں ملوث دیکھ لے۔ چنانچہ اسی کے مطابق قوانین وضع ہوتے رہے۔ اور اسلام کے مسئلہ طلاق کا ہمیشہ مذاق اُڑایا جاتا رہا۔ لیکن مشاہدہ اور تجربوں کے دھکوں نے عیسائیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس خالص دینی مسئلہ کو دنیوی پارلیمنٹ میں پیش کر کے اس میں ترمیم کروائیں۔ چنانچہ وہ ترمیم کروالی گئی

ہے۔ اور اسی پر عمل در آمد ہے۔ یعنی اُن کی فطرت نے اپنی مسخ شدہ صورت کو اُجاگر کرلیا ۔حقیقت یہ بھی ہے کہ علاوہ زنا کے اور بھی بہت سی صورتیں تجربہ میں آئیں کہ میاں بیوی کا اکٹھا رہنا محال ہوگیا۔اسلام چونکہ فطرتی تعلیم کا خُوگر ہے اس لئے اس نے ابتداہی سے نقائص سے اپنے آپ کو پاک رکھا جو آئندہ کبھی بھی چل کر اس کے سقیم ہونے کا ثبوت بن سکتے تھے۔اسلام نے بتایا کہ نکاح ایک پاک معاہدہ ہے۔جو مرد اور عورت دونوں پر بعض شرائط کو لازم قرار دیتا ہے۔مثلاً مرد کی طرف سے مہر، نان ونفقہ کا تعہد اور حسنِ معاشرت اور عورت کی طرف سے پاکدامنی،عفت، نیک چلنی اور فرمانبرداری۔پس نکاح کی بجز اس کے اور کوئی حقیقت نہیں کہ ایک معاہدہ کے شرائط کے تحت دو انسان زندگی گزاریں۔اگر ان شرائط کی پابندی میں کوتاہی ہوتو جس طرح ہر معاہدہ شرائط شکنی کی صورت میں فسخ ہوجاتا ہے،اسی طرح نکاح بھی کہ طلاق کے ذریعہ علیحدگی اختیار کرلی جاتی ہے۔لیکن یہ بھی جاننا چاہئے کہ نکاح کی ان شرائط کے ذیل میں ہر شرط کے ساتھ کئی ضمنی شرطیں ہیں۔جن کا ثبوت ضروری ہے۔اور پھر اسلامی طلاق میں اگر وہ مرد کی طرف سے دی جائے تو بڑا بار اُٹھانا پڑتا ہے۔یعنی شادی کے اخراجات تو ہوئے ہی تھے،ایک رقم کثیر مہر کی بھی واجب الادا ہوتی ہے۔کیونکہ مہر عورت کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔پھر قرآن کا یہ بھی حکم ہے کہ طلاق کے وقت تک جو کچھ مال ومتاع وتحائف وغیرہ دئے جاچکے ہوں ۔واپس نہ لئے جائیں،اگر عورت صاحبِ اولاد ہوتو بچوں کے تعہد کی مشکلات الگ ہیں۔

اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔حضرت خدیجہؓ کے بعد جو خلاء پیدا ہوا تھا، وہ حضرت عائشہؓ کے ذریعہ ہی پُر ہوا،اور آج ہم بخوبی سمجھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح نہ ہوا ہوتا تو اسلام کے بہت سے احکام اور خصوصاً عورتوں کے مسائل کے بارہ میں اسلامی تعلیمات معرضِ گمنامی میں پڑ جاتیں،حضرت عائشہؓ سے نکاح میں

کئی غایتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ نو عمر تھیں، اس لئے اس قابل تھیں کہ تعلیماتِ اسلامی کو جلد، بآسانی اور بخوبی سیکھ سکیں اور ایسی دینی معلمہ بن سکیں جو ایک شارع نبی کی بیوی کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نہایت ذہین اور زکی تھیں۔ اور تفقہ فی الدین اور دینی مسائل کے سیکھنے کے لئے نہایت موزوں بھی۔ چنانچہ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ آج اُن کا شمار مجتہدین صحابہ میں ہوتا ہے۔ امام زہری کی شہادت ہے کہ تمام مردوں کا اور امہات المؤمنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جائے تو حضرت عائشہؓ کا علم وسیع تر ہوگا۔ (طبقات ابن سعد جز دوّم) تیسرے بوجہ کم عمر ہونے کے بظاہر توقع تھی کہ وہ ابھی لمبی عمر پائیں گی اور عورتوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ کا انہیں زیادہ موقعہ مل سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چوتھے یہ کہ انہوں نے بچپن سے ہی اسلام کو دیکھا اور برتا تھا۔ اسلامی عادات و اطوار اچھی طرح سیکھ لئے تھے۔ اور تعلیمات اسلامی کا ایک عمدہ نمونہ تھیں۔ پانچویں یہ کہ وہ اول المؤمنین اور افضل المسلمین کی صاحبزادی تھیں۔ صدیق اکبر کا گھر وہ قلعہ سعادت تھا، جہاں خورشیدِ اسلام نے سب سے پہلے اپنا نور بکھیرا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی تربیت نہایت اعلیٰ اور کامل شعارِ اسلامی کے مطابق ہوئی تھی۔ اور وہ عورتوں میں نمونہ بننے کے لئے خاص طور پر قابل تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ انتخاب وقت پر اپنے پھل لایا اور آج جس قدر مسائل اور تعلیماتِ اسلامی، عورتوں سے متعلق، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں اور کسی صحابیہ کے ذریعہ نہیں پہنچیں۔ عام دینی مسائل میں بھی اُن کی نظر کا یہ عالم تھا کہ کبار صحابہ بھی اُن سے فتویٰ لیا کرتے تھے۔

اب ہم دیگر ازواجِ مطہرات کے بارے میں عرض کرتے ہیں کہ اُن میں سے بعض نکاح تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کریم النفسی اور حد درجہ جذبۂ ایثار و قربانی کی دلیل تھے۔ اور بعض نکاح قبائل مختلفہ میں اتحاد، یگانگت، اور تعلقات کی استواری کے لئے کئے گئے تھے۔

جہاں تک اس اعتراض کا سوال ہے کہ نعوذ باللہ تعددِ ازدواج ایک ذریعہ عیاشی ہے۔ ہم عرض کریں گے کہ ہمارے آقا اِس سے پاک اور برتر تھے، کیونکہ اس زمانے میں جبکہ آپ کی عمر جوانی کی تھی، اور پھر آپ صاحبِ ثروت بھی نہیں تھے، مخالفین نے آپ کے سامنے دولت اور حکومت کے ساتھ خوبصورت ترین عورتوں کی بھی پیشکش کی تھی، جسے آپ نے ٹھکرا دیا تھا، دوسرے یہ کہ ان نکاحوں میں خاص مصالح کو ملحوظ رکھنے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ سوائے حضرت عائشہؓ کے آپ کی تمام ازواج یا تو بیوہ تھیں یا مطلقہ تھیں۔ کنواری کوئی نہیں تھی۔ عمر کے لحاظ سے بھی اکثر بوڑھاپے کے قریب تھیں۔ اور بظاہر صورت شکل کے اعتبار سے بھی اُن کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا۔ حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت زینب ام المساکین بیوہ تھیں۔ محض ان کا بارِ کفالت اٹھانے اور محض ایک احسان اور نمونہ قائم کرنے و نیز اُن کی دلداری کے لئے آپ نے اُن کو اپنی کنارِ عاطفت میں لے لیا تھا اور یہ اُس وقت کے مخصوص حالات کا تقاضا تھا۔ حضرت زینب بنتِ جحشؓ سے نکاح رسم متبنی توڑنے کے لئے تھا، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی لڑکیاں تھیں جن سے نکاح کا مقصد علاوہ مقاصدِ مذکورہ کے خاندانی تعلقات میں توسیع اور اضافہ بھی تھا۔ امِ حبیبہؓ، ابوسفیان بنو امیہ کی بیٹی تھیں، اِس شادی کے بعد ابوسفیان نے اپنی شدید مخالفت کو روک لیا تھا، حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی مصطلق کی رئیسہ تھیں۔ یہ دونوں قبیلے عربوں میں اپنی مخصوص روایات کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ حضرت صفیہؓ، رئیس خیبر ایک یہودی، حی بن اخطب کی صاحبزادی تھیں۔ جو قبیلہ بنونضیر کا سردار تھا۔ اُس کا مدینہ میں خاص اثر تھا، تینوں نکاح قومی اور ملکی مصالح کے تحت کئے گئے تھے۔ جن کے ذریعہ استواری تعلقات کے علاوہ سیاسی فوائد کثیرہ حاصل ہوئے۔ اور مختلف اقوام اور مختلف خاندانوں کے ساتھ جسمانی تعلق

پیدا کر کے اُن تک اسلام کے پیغام کو آسان اور مؤثر طور پر پہنچایا جاسکا اور بعد میں آنے والی ذمہ داریوں کو صحیح رنگ میں ادا کرنے کے لئے مختلف علاقوں اور مختلف نسلوں کے لوگوں کو تیار کیا گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ عیش وعشرت کا متوالا انسان صرف زیادہ بیویوں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دیگر لذات اور زندگی کے عیش اور رفاہت کے اور سامانوں کو بھی اکٹھا کرتا ہے۔ لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اِن لغویات سے پاک اور عاری رہی۔ آپؐ کا عمل اور کردار ہی تھا جس نے پشتوں کی بگڑی ہوئی قوم کو اخلاقِ فاضلہ کا وہ درس دیا کہ اُن کی آزادانہ بے راہ روی اور بدمستی ،فکر وفہم کے ذخیروں میں جکڑی گئی اور اُن کے بغض وعناد، حسد وکینہ اور سرشتِ منتقمانہ کے بے جان قالب میں عدل وحکمت کی روح پھونک کر حسنِ معاشرت کی خلعت انہیں عطا کی۔ نیکی، پاکیزگی، طہارت، عفت وعصمت، عزتِ نفس اور زہد تقویٰ کے ساتھ ساتھ قربانی، ایثار، عطا، جود وسخا، استعفاف اور درگذر کی مثبت قوتیں ان میں یونہی نہیں پیدا ہوگئی تھیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی ہی تھی جس نے تمام صحابیات کو عموماً اور ازواجِ مطہرات کے قلب وجگر کو خصوصاً محبتِ الٰہی اور تبتل الی اللہ کے لئے گداز کر دیا تھا۔ نسائیت کی بعض مخصوص کمزوریوں مثلاً تندی، تیکھا پن، اغماض اور بے اعتنائی کو محض اپنے خدا کی رضامندی کے لئے انہوں نے ترک کر دیا تھا اور شاذ ونادر کے طور پر اگر ان کا اظہار ہو بھی جاتا تو وہ استغفار اور ساتھ ہی جرأتِ عمل کے ساتھ ان کی تلافی بھی کر دیا کرتی تھیں۔ مزید یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چار نکاحوں تک کی تحدید اس وقت کی نازل شدہ ہے جبکہ مذکورہ تمام ازواجِ مطہرات آپؐ کے نکاح میں آچکی تھیں۔ چونکہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ تعلیم تھی کہ وہ امہات المؤمنین ہیں یعنی مؤمنوں کی مائیں ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِنتقال کے بعد بھی کوئی مؤمن ان سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اس لئے ایسی صورت میں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سوائے ان کے اپنی نکاح میں رکھنے کے طلاق دینے کا کوئی جواز نہ تھا۔ چونکہ وہ دوسروں کے نکاح میں نہیں جاسکتی تھیں۔ اس لئے اگر ان کو طلاق دی جاتی تو وہ ان پر ظلم کے مترادف ہوتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور استثناء کے چار سے زائد بیویوں کی اجازت دی۔ جو دیگر مسلمانوں کو حاصل نہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت صفیہؓ، اور حضرت زینبؓ چار کو ہی اپنے پاس رکھا اور دیگر ازواج کو شرفِ زوجیت بخشتے ہوئے اور ان کی کفالت و نیز تمام حقوق کی پابجائی کرتے ہوئے، اپنے سے علیحدہ رکھا۔

تعددِ ازدواج دراصل اسلام کا ایک عظیم احسان ہے۔ کیونکہ بعض مواقع ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ انسان کے لئے دوسرا نکاح ضروری ہوجاتا ہے۔ مثلاً خواہشِ اولاد، بیوی کا جلد جلد بوڑھاپے کی طرف بڑھنا، بیوی کا دائمی بیمار ہونا، خروج رحم وغیرہ کی بعض مخصوص بیماریاں جن میں بیوی اپنے خاوند کی خاص ہمدردی کی تو مستحق ہوسکتی ہے، لیکن اہلی مباشرت کے قابل نہیں رہتی، عورت کا جلد جلد حاملہ ہونا، اسی طرح بعض مخصوص حالات جن میں مرد ایک ہی بیوی کے ساتھ اپنے تقوٰی اور اخلاق کو قائم نہیں رکھ سکتا، بعض ایسے زمانے بھی آسکتے ہیں کہ قوم کو ترقی نسل کے لئے ایک سے زائد نکاح ضروری ہوجائیں، بعض دفعہ دوسری شادی کے ساتھ اہم ملکی یا قومی مفادات وابستہ ہوسکتے ہیں۔ اور بعض ایسے وجوہ بھی ہوسکتے ہیں جنہیں عقل جائز قرار دیتی ہے۔ اور مرد وعورت دونوں کا کانشنس بھی مشورہ دیتا ہے کہ دوسری شادی کرلی جائے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے ساتھ اسلام نے ایسی کڑی شرائط لگادی ہیں کہ ہر کوئی اُن کی پابندی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان تمام شرائط اور پابندیوں سے صرفِ نظر کرکے اگر کوئی مسلمان شادیوں پر شادیاں کرتا جاتا ہے تو یہ اُس کا ذاتی فعل سمجھا جائے گا۔ جس کے لئے وہ جوابدہ ہوگا۔ اس

کے فعل کو ہرگز اسلامی تعلیمات کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے اُس وقت کے مروجہ رسوم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں تک شادیاں کر لینا ان میں وجہ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے بعض معاندینِ اسلام عیسائیوں مثلاً جان ڈیون پورٹ، گبن، پروفیسر مارس، ایزک ٹیلر وغیرھم کو بھی کہنا پڑا کہ اِسلام نے تعدّدِ ازدواج کی رسموں کو جو عام طور پر عربوں میں رائج تھیں اور جن کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے چلا آتا تھا، گھٹایا ہے نہ کہ بڑھایا، بلکہ نہایت ہی کم کر دیا ہے اور صرف اُس اندازے پر جواز کے طور پر رہنے دیا ہے۔ جس کو تمدنی ضرورتیں کبھی نہ کبھی چاہتی ہیں اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (سورۃ النساء: ۴) یعنی اگر تم ان میں اعتدال نہ رکھ سکو تو پھر ایک ہی پر اکتفاء کرو۔ ان سب امور پر یکجائی نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں دوسری شادی ہرگز ذریعہ عیش نہیں بلکہ ایک قربانی ہے جو مخصوص حالات میں کرنی پڑتی ہے۔

(28)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معمولات کے آئینہ میں

ربیع الاول کا مہینہ ابھی ختم ہوا ہے۔ یہ مہینہ وہ تھا جس میں آقائے دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بھی ہوئی اور وفات بھی۔ اِس مہینہ میں اور اُس کے قریبی دِنوں میں ساری دنیا میں کثرت سے حضورؐ کی یاد میں جلسے کئے جاتے اور سیرت کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ سیرت کے اِن جلسوں کی ابتداء کا فخر جماعتِ احمدیہ اور اُس کے اِمام حضرت مصلح موعودؓ کو حاصل ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں پہلی مرتبہ آپؓ نے قادیان میں ''یومِ رحمۃ للعالمینؐ'' کے نام سے سیرۃ النبیؐ کے جلسے کا اہتمام کیا۔ سارے ہندوستان میں علماء کی طرف سے ہماری جماعت پر لعن طعن کی گئی کہ یہ بدعت ہے۔ چودہ سو سالوں میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا وغیرہ۔ لیکن دیکھئے آج ساری دنیا میں یہ جلسے بڑے اہتمام سے منعقد ہوتے ہیں اور بہتوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اِن جلسوں کا بانی کون تھا اور اِس کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بے شمار کارناموں میں سے یہ بھی ایک کارنامہ ہے۔

چونکہ دو ماہ سے ہمارے مشترکہ ماہوار اجلاس نہیں ہو سکے تھے، اس لئے آج کی اس مجلس کے لئے مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کے بے شمار پہلوؤں میں سے روزمرہ کے عام معمولات کے کچھ پہلو اپنی تقریر کے لئے چنے ہیں۔ عنوان ہے۔ ''رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معمولات کے آئینے میں''۔

آپ کا معمول تھا کہ ہر کام بسم اللہ سے شروع کرتے۔ جب رات کو سوتے تو یہ دعا پڑھتے بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْيٰ کہ میرا مرنا اور جینا سب اللہ کے نام کے ساتھ ہے یعنی سونا ایک چھوٹی موت کے برابر ہے جس میں آدمی کو کچھ بھی پتہ نہیں رہتا جیسا کہ موت کے بعد ہوتا ہے اور جاگنا زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ کر آنا ہے۔ ہم یہ کہہ کر سوئیں کہ یا اللہ اب ہم سونے جا رہے ہیں تو گویا ایک موت قبول کر رہے ہیں اور اس سے باہر نکال کر ہمیں دوبارہ زندگی کی حرارت سے آشنا کرنا اب آپ ہی کے اختیار میں ہے۔ صبح اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔ یعنی اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں زندہ کیا مارنے کے بعد اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ کھانا شروع فرماتے تو اس دعا کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ۔ اللہ کے نام اور اُس کی برکت کے ساتھ۔ کھانا کھا چکتے تو فرماتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور ہمیں مسلمانوں میں سے بنایا۔

سواری پر بیٹھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ۔ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اِس سواری کو ہمارا تابع فرمان بنا دیا، ورنہ ہم خود اِس کو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم اپنے خدا کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ جب کبھی ضرورت سے بیت الخلاء جاتے تو پڑھتے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ یعنی مَیں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اِس معاملے میں ہر قسم کے ضرر اور ہر قسم کی تکلیف دہ صورتِ حال سے۔ اور فارغ ہوتے تو باہر نکل کر یہ دعا پڑھتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنِّي الْاَذٰى وَعَافَانِيْ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہر تکلیف کو مجھ سے

دور کر دیا۔ ہر اذیت کو بھگا دیا اور عافیت عطا فرمائی۔

کسی شہر یا بستی کے قریب پہونچتے تو داخل ہونے سے قبل قرآن کی یہ دعا پڑھتے۔ رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا۔ (بنی اسرائیل:۸۱) یعنی اے میرے رب! یہاں اِس بستی میں میرا داخلہ نیک طور پر ہو اور جب مَیں یہاں سے نکلوں تب بھی نیک ذکر چھوڑ کر نکلوں۔ اور اپنے فضل اور اپنی جناب سے مجھے ایک غالب اور طاقتور مددگار عطا فرما۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہر اُس حالت میں جس میں ہم داخل ہونے والے ہیں اور ہر اُس حال سے جس سے ہم باہر نکلنے والے ہیں۔ اس دعا کو پڑھا کریں۔ اِس مختصر وقت اور چھوٹے سے مضمون میں پیارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معمول کی تمام دعاؤں یا آپ کے معمول کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اِس لئے ضروری ضروری امور پر اکتفاء کرتے ہوئے اب مَیں آپ کے معمولات کو لیتا ہوں۔

آپ کا معمول تھا کہ جب کسی سے ملتے تو پہلے خود السلام علیکم کہا کرتے اور مصافحہ کرتے اور جب تک دوسرا شخص خود سے آپ کا ہاتھ نہ چھوڑ دیتا آپ اپنا ہاتھ نہ چھڑاتے۔ کوئی شخص کان میں کچھ کہتا تو آخر وقت تک سنتے اور زبردستی منہ نہ موڑتے۔ کسی مریض کی عیادت کا ادا کرنا مسلمان پر فرض قرار دیتے۔ خود مریضوں کی عیادت کو چل کر جاتے۔ اُس کی نبض اور پیشانی پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے۔ انشاء اللہ الطھور کہ اگر اللہ نے چاہا تو تم جلد صحت حاصل کر لو گے۔ اسی طرح اور بھی کلماتِ خیر ادا فرماتے۔ کسی کے گھر جاتے تو دروازہ کے سامنے نہیں بلکہ بازو ہٹ کر کھڑے ہوتے اور پہلے السلام علیکم کہتے۔ اس کے بعد اجازت طلب کرتے۔ اجازت ملتی تو داخل ہوتے ورنہ لوٹ آتے۔ جب جنگ کے لئے

میدان میں داخل ہوتے تو یہ دعا فرماتے۔اے اللہ! تو ہی میرا دست و بازو ہے اور تو ہی میرا مددگار ہے۔تیرے ہی سہارے مَیں مدافعت کرتا اور حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی سہارے پر مَیں لڑتا ہوں۔آپ کے ان ہی اخلاقِ کریمانہ کا ذکر قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اِن تعریفی الفاظ میں کیا ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:۵) کہ اے محمدؐ! تم اخلاق کے بہت بڑے درجے پر فائز ہو۔سورۃ آلِ عمران میں فرمایا۔خدا کی عنایت سے تم اپنے ماننے والوں سے بہت ہی نرمی سے پیش آتے ہو۔اگر تم کج خُلق یا سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے قرب سے دور بھاگتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی ذہانت اور زیرکی کے باعث آپ کو سب سے زیادہ سمجھا اور پرکھا اور حضور کے اوصاف کے بارے میں سب سے زیادہ تفصیل ہمیں آپ ہی کے بیان سے معلوم ہوئی۔فرماتی تھیں کہ حضور کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔برائی کے بدلے میں کبھی برائی سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ درگزر کرتے اور معاف کر دیا کرتے تھے۔جب بھی کسی معاملے میں آپ کو دو باتوں کا اختیار دیا جاتا تو ہمیشہ اُن میں سے جو آسان ہوتی اُسے اختیار فرماتے۔بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتی۔آپ نے زندگی بھر کبھی کسی سے اپنی ذات کے لئے انتقام نہیں لیا۔لیکن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کوئی کرتا تو آپ کو بے حد شاق گزرتا اور محض حکمِ شرعی کی تعمیل میں آپ اُس پر حد جاری فرماتے۔آپ نے کبھی کسی مسلمان پر اُس کا نام لیکر لعنت نہیں ڈالی۔کبھی کسی غلام یا لونڈی کو یا کسی عورت اور جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔

کسی کی کوئی درخواست ہوتی آپ کبھی رد نہ فرماتے بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہوتی، جب بھی گھر کے اندر داخل ہوتے تو خندہ لب مسکراتے ہوئے۔دوستوں میں بیٹھتے تو پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے۔کسی کے ہاں جاتے تو اپنے لئے اونچی یا خصوصی جگہ کی جستجو کبھی نہ کرتے نیچے فرش پر،

گدّے پر یا جہاں بھی جگہ مل جاتی بے تکلفی سے بیٹھ جاتے۔ گفتگو آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ اگر سننے والا یاد کرنا چاہے تو آسانی سے یاد کرلے، ایک بار حضرت امام حسینؓ نے اپنے والد حضرت علیؓ سے حضور کے اخلاق اور عادات کے بارے میں دریافت فرمایا۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خندہ جبیں، نرم خُو اور بے حد مہربان تھے۔ سخت مزاجی اور تنگ دلی آپ کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی، بات بات پر شور ڈالنا یا غصہ کرنا آپ کے مزاج کے خلاف تھا۔ کبھی کوئی بُرا لفظ آپ کی زبان سے نہیں نکلا۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنا یا دوسروں کے لئے دل میں بغض رکھنا آپ کی فطرت میں نہیں تھا۔ کوئی بات اگر ناپسند ہوتی تو خاموش ہوجاتے اور اِغماض برتتے۔ بحث ومباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور بے مطلب بات میں پڑنا اور دخل دینا آپ کی عادت نہیں تھی۔ دوسروں کے بارے میں بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی کو بُرا نہ کہتے تھے، کسی کی عیب جوئی اور غیبت نہ کرتے اور کسی کے اندرونی معاملات میں تجسّس سے کام نہ لیتے، یعنی کسی کی ٹوہ میں نہ رہتے۔ ہمیشہ ایسی بات کہتے جس سے کوئی مفید نتیجہ نکلتا ہو، جب آپ گفتگو فرماتے تو صحابہ یوں خاموشی سے سنتے جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، جب آپ خاموش ہوجاتے تب صحابہ آپس میں گفتگو کرتے۔

آپ جب کسی سے گفتگو فرماتے تو مخاطب کی بات کو اس وقت تک خاموشی سے سنتے جب تک وہ بات ختم نہ کرلیتا۔ لوگ کسی خوشکن بات پر ہنستے تو آپ صرف مسکرانے پر اکتفا فرماتے۔ زور سے ہنستے یا قہقہہ لگاتے آپکو نہیں دیکھا گیا۔ باہر کا کوئی آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے۔ دوسروں کی زبان سے اپنے لئے تعریف سننا پسند نہ فرماتے۔ لیکن اگر کوئی آپ کے احسان اور انعام پر شکر گزاری کا اظہار کرتا تو قبول فرماتے۔

کسی کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔ بڑے فیاض، صاف گو، نہایت نرم اور حلیم الطبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ یعنی آپ کے ساتھ بیٹھ کر کوئی بور نہیں ہوسکتا تھا بلکہ فرحت اور راحت محسوس کرتا تھا۔ کوئی پہلی بار اور اچانک آپ پر نظر کرتا تو مرعوب ہوجاتا تھا لیکن جیسے جیسے آپ کی مجلس میں بیٹھتا آپ سے محبت کرنے لگ جاتا تھا۔ کسی کی توہین گوارا نہ فرماتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکرگزاری کا اظہار کرتے۔ کسی چیز میں خرابی یا برائی نہ نکالتے۔ کھانا جیسا بھی ہوتا تناول فرمالیتے اور کھانے میں خرابی کبھی نہ نکالتے، اگر کوئی شخص کسی حق بات کی مخالفت کرتا تو آپ کی جبیں پر غصہ نمودار ہوتا۔ لیکن اپنی ذات کے بارہ میں کسی کی مخالفت پر آپ کو غصہ نہ آتا۔ آپ نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

اللہ تعالیٰ نے سوائے انسان کے دیگر تمام مخلوقات کو ایسے کام سونپے ہیں کہ وہ سرِ مُواُن سے انحراف نہیں کر سکتے۔ سورج روشنی بکھیرتا ہے اور رات کا بدل نہیں۔ اسی طرح رات تاریکی سے عبارت ہے۔ اور روشنی پھیلانے سے قاصر ہے۔ درختوں میں موسم ہی میں پھل آتے ہیں اور پھول بہار کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ کہ وہ آئے تو یہ کھلیں۔ تمام حیوانات اپنے مفوضہ کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اُن سے ہٹ کر نہیں چل سکتے۔ لیکن انسان مختار ہے اُسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس بات کو پسند کرے اسی کو اپنائے۔ وہ کسی ایک کام کے کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ اُس کی خندہ لبی اور مسکراہٹ کسی بہار کی پابند نہیں اور نہ ہی اُس کا غضب یا ترش روئی کسی خزاں یا آفت کی محتاج ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کونسی بات اُس کے دل کو بھاتی ہے اور کونسی بات اُس کی ناراضی کا موجب ہوجاتی ہے۔ انسان کے لئے کسی بھی اچھے اصول اور کسی بھی اچھے کام کو اچھا سمجھ کر اُسے قبول کر لینا اور اُس پر مداومت اور اُستواری اختیار کرنا اور اِسی طرح کسی برے کام کو برا سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ترک کر دینا اور کبھی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا،

کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جولوگ اِس مشکل مرحلے کو سر کر لیتے ہیں اور اچھائی کو اچھا سمجھ کر اختیار کرتے اور اُس پر مُداومت اختیار کر لیتے ہیں اور ہمیشہ اُس پر کار بندر ہتے ہیں اور کسی کام کو جب برا سمجھ لیتے اور ترک کر دیتے ہیں تو پھر کبھی اُس کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے، ایسے لوگ بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ اسی چیز کو غالب نے حقیقی ایمان کا نام دیا ہے۔ ؂

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی برہمن کا کام مندر میں رہ کر لوگوں کی خدمت کرنا اور انہیں بتوں کی پوجا کروانا ہے۔ اگر کوئی برہمن اپنی زندگی کا یہ مقصد اور یہ کام پوری طرح انجام دیتا ہے اور مندر ہی میں اپنی زندگی گزار کر وہیں مرجاتا ہے تو اِس قابل ہے کہ اسے کعبے میں لے جاکر دفنایا جائے، کیونکہ جس کام کی ذمہ داری اُس نے قبول کی تھی اسے پوری طرح نبھایا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اِس باب میں اپنی مثال پیش کی ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آپ نے جب کوئی کام جس طرح سے شروع فرمایا ہمیشہ اُسی طرح انجام دیتے رہے۔ اور شدت سے اس کی پابندی فرمائی۔ اسی کا نام اصطلاحِ مذہب میں سُنت ہے۔ یعنی سُنت ایسا فعل ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مُداومت اختیار فرمائی اور ہمیشہ اس پر عمل پیرا رہے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہند بن ابی ہالہؓ جو مدتوں آپ کے ساتھ رہے۔ متفقہ طور پر یہی بیان کرتے ہیں کہ آپ نہایت شفیق، نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے۔ اور نیکی سے ہٹ کر کوئی چیز آپ میں مشاہدہ نہیں کی گئی، چہرہ ہمیشہ مسکراتا ہوا اور گفتگو میں متانت اور وَقار پایا جاتا تھا۔ کسی کی دل شکنی کرہی نہیں

سکتے تھے۔نہایت احسان شناس اور وفادار،ایک بار حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی طرف سے سفارتی وفد آیا آپ نے خود اپنے ہاں اُسے مہمان ٹھہرایا اور خود ہی اُن کی خدمت کرتے رہے۔لوگوں نے ہاتھ بٹانے کی اجازت چاہی تو جواب دیا کہ اِن لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی تھی اِس لئے مَیں خود اُن کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

جب کسی سے قرض لیتے تو عموماً کچھ زیادہ ہی واپس کرتے ایک دفعہ کسی سے اُونٹ قرض لیا تو اُس سے بہتر اُونٹ اُسے واپس کیا۔اور فرمایا سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔اگر قرض خواہ غصہ ہوتا تو آپ بُرا نہ مناتے اور اُس کے غصہ ہونے کو اُس کا حق سمجھتے۔لوگوں کی ناگوار باتوں کو گوارا اور برداشت فرماتے اور زبان سے کچھ نہ کہتے۔فیاضی کا یہ عالم تھا کہ کوئی چیز آپ کے پاس آتی تو تین دن سے زیادہ نہیں رہنے پاتی ۔یعنی تین دن کے اندر اندر آپ اُسے غرباء اور مساکین میں تقسیم فرما دیتے۔ایک بار حضرت ابو ذر غفاریؓ کے ساتھ گزر رہے تھے تو فرمایا کہ اے ابوذر! اگر اُحد کا پہاڑ میرے لئے سونا بن جائے تو مَیں پسند نہ کروں گا کہ ایک دینار بھی تین دن سے زیادہ میرے پاس رہے۔ہاں صرف وہ جسے مَیں قرض کی ادائی کے لئے اٹھا رکھوں۔

ایک دفعہ رئیس فِدک نے چار اُونٹوں پر غلہ بار کرکے آپ کو تحفۃً بھجوایا۔حضرت بلالؓ حضورؐ کے معاملات کے نگران تھے۔انہوں نے بازار میں کچھ غلہ فروخت کرکے ایک یہودی کا قرض ادا کیا اور باقی غلہ لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ اُس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔واقعہ سن کر پوچھا کچھ بچ رہا ہے؟ حضرت بلالؓ کے ہاں کہنے پر فرمایا کہ جب تک سب کا سب تقسیم نہ ہو جائے مَیں گھر نہیں جاؤں گا۔حضرت بلالؓ نے فرمایا اب تو رات ہو رہی ہے اور سائل بھی کوئی نہیں۔لیکن آپ نے رات مسجد میں ہی گزار دی۔اور صبح جب تک حضرت

بلالؓ کی طرف سے یہ اطلاع نہیں مل گئی کہ تمام غلہ تقسیم ہو چکا ہے۔آپ گھر نہیں گئے۔لوگوں کو عام حکم تھا کہ اگر کوئی مسلمان اِس حالت میں فوت ہو جائے کہ اُس پر کچھ قرض باقی رہ گیا ہو تو مجھے اطلاع دینا تا کہ مَیں اُس کا قرض ادا کر دوں۔ایک بار بحرین سے خراج کی اِس قدر رقم آئی کہ اِس سے قبل نہیں آئی تھی۔فرمایا سب کی سب مسجد کے صحن میں ڈال دو۔آپ مسجد میں گئے، نماز ختم کر کے صحن میں آئے اور تقسیم شروع کی۔جو بھی سامنے آتا اُسے دیتے جاتے۔حضرت عباسؓ غزوۂ بدر کے بعد امیر نہیں رہے تھے۔اُنہیں اتنا دیا کہ اُٹھ کر چل نہیں سکتے تھے۔جب سب ختم ہو گیا تو دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ایثار کا یہ حال تھا کہ ایک بار جنگ میں لونڈی اور غلام ہاتھ آئے۔حضرت فاطمۃ الزہراء حضورؐ کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیٹی تھیں۔اُن کی غربت کا یہ حال تھا کہ خود چکی پیستی تھیں، خود ہی پانی بھر کر لاتیں اور گھر کا سارا کام کرتیں۔اُن کے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔اُنہوں نے فرطِ شرم سے خود کہنے کے بجائے اپنے شوہر حضرت علیؓ سے کہلوایا کہ اِن حالات میں گھر کے کام کاج میں مدد کے لئے ایک لونڈی عنایت فرمائی جائے۔جواب دیا کہ ابھی صفہّ والوں کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔اُس کے بعد ہی کسی اور طرف توجہ دے سکوں گا۔ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی لڑکیاں اور حضرت فاطمہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ایک دو لونڈیوں کے لئے درخواست کی۔فرمایا کہ بدر کے یتیم پہلے ہی اِس سلسلے میں درخواست کر چکے ہیں۔

ایک صحابی نے شادی کی۔ولیمہ کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا۔حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی مشکل بیان کی۔فرمایا کہ عائشہؓ کے ہاں جاؤ اور ایک آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔چنانچہ وہ گئے اور آٹا مانگ لائے۔حضورؐ کے گھر میں اِس آٹے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔اہلِ

خانہ نے اِس رات فاقہ کیا۔حضرت عائشہؓ نے شادی کے بعد تقریباً نو سال حضور کے ساتھ گزارے۔وہ فرماتی ہیں کہ اِن نو سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ آپ نے تینوں وقت پیٹ بھر کر کچھ کھایا ہو۔اگر دو وقت مسلسل کچھ کھانے کو مل جاتا تو تیسرا وقت فاقے کی نذر ہوتا۔قبیلہ غفار کا ایک آدمی آپ کا مہمان ہوا۔گھر میں صرف بکری کا دودھ تھا جو اُسے پلا دیا اور خود آپ اور آپ کی اہلیہ نے وہ رات فاقے میں گزاری جبکہ پچھلی رات بھی فاقے میں ہی کٹی تھی۔حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ یمن سے شام تک اسلامی حکومت وسیع ہو چکی تھی اور آپ اُس حکومت کے سربراہ تھے۔جو بھی کام کرتے پہلے دائیں سمت کا خیال رکھتے۔کپڑے اور جوتے پہلے دائیں پہنتے اور بعد میں بائیں۔اُتارتے وقت پہلے بائیں سے اُتارتے اور بعد میں دائیں سے۔گھر میں یا مسجد میں داخل ہوتے تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھتے اور باہر نکلتے تو پہلے بائیں پاؤں سے۔کوئی چیز تقسیم فرماتے تو پہلے دائیں جانب سے شروع فرماتے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور روزمرہ کے یہ معمولات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی اور دنیوی وجاہتوں اور مال ودولت سے آپ کی بے اعتنائی کا مرقّع ہیں اور ہمارے لئے تقلید کا حکم رکھتے ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی غرض اُن تمام اخلاق کو جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دنیا نے مشاہدہ کیا تھا، دوبارہ دنیا میں قائم کرنا تھا۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور آپ کے خلفاء کی زندگیاں اور اُن کے معمولات بھی اِسی سادگی اور بے تکلفی کا نمونہ رہے ہیں۔اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زندگیاں بھی ایسی سادگیوں سے عبارت رہی ہیں۔ہمیں خود اپنے کردار میں اور اپنے بچوں کی زندگیوں میں اِن ہی برکتوں کو سمیٹنا اور برتنا ہے۔اخلاق وکردار کی یہی سادگی تھی جس نے اُس وقت ایک عالَم کو تسخیر کر لیا تھا۔اسلام کا دوبارہ غلبہ بھی ویسی ہی سادگی اور عمل کا تقاضا کر رہا ہے۔دعاؤں کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ

سے نصرت طلب کرتے ہوئے ہمیں اپنے اندر اور اپنی نسلوں میں ایک پاک تبدیلی اور ایک نیک اور پاک تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا، ہم سب کا حامی و ناصر رہے اور اللہ تعالیٰ کی بیشمار اور بے حساب برکتیں اور رحمتیں نازل ہوں۔ اس پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اصحاب پر اور اسی طرح آپ کے حقیقی روحانی فرزند حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر اور آپ کے نیک نمونہ اصحاب و خدام پر اور آپ کا نیک و پاک نمونہ ہماری زندگیوں کو کامرانی سے ہمکنار کرنے والا بن جائے۔ آمین

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ط

۱۵ رستمبر ۱۹۹۴ء

(29)

عُلَمَآءُ اُمَّتِیۡ کَاَنۡبِیَآءِ بَنِیۡ اِسۡرَائِیۡلَ

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں حضرت موسیٰؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مشابہتِ تامہّ عطا فرمائی (جیسا کہ سورۃ مزمل کی آیت ۱۶۔ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلاً شَاھِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَآ اَرۡسَلۡنَآ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا) میں کما کے لفظ سے ظاہر ہے۔ وہاں ضروری تھا کہ واقعاتی رنگ میں بھی یہ مشابہت پوری ہوتی۔ چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی طرح صاحبِ شریعت نبی بنایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کی امت میں پے در پے انبیاء بھیجے۔ وہ انبیاء آپ کے نائب، خلیفہ اور ساتھ ہی نبی بھی ہوتے تھے۔ لیکن اُمّتِ محمدیہ میں بجائے انبیاء کے خلفاء کا سلسلہ چلا۔ گو کہ یہ سلسلہ بطورِ خلافتِ راشدہ حضرت علیؓ پر ختم ہو گیا، لیکن اُس کی عام حیثیت اور شہرت، تیرہ صدیوں تک مسلسل قائم رہی۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، انبیاء کے بجائے خلفاء کا سلسلہ، اپنے اندر ایک وجہ اور حکمت رکھتا تھا۔ وہ یہ کہ شریعتِ موسویہ ایک نامکمل شریعت تھی اور ایک خاص قوم اور ایک خاص وقت تک کے لئے محدود تھی۔ نامکمل شریعت کا یہ خاصہّ ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کا بکلی ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ضرورتِ زمانہ اور اِقتضائے حالات کے پیشِ نظر، وقفہ وقفہ سے انبیاء کو مبعوث کیا جاتا رہے، تاکہ وہ خدا تعالیٰ سے راست علم پا کر شریعت میں احکام اور قوانین کا اضافہ، یا پُرانے حکموں میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہیں۔ لیکن ہمارے آقا

ومُطاع حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوعطا کردہ شریعت یعنی قرآنِ مجید، ایک کامل اور مکمل قانونِ الٰہی ہے، جس میں آنے والے تمام زمانوں کی ضروریات اور تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اِس لئے قیامت تک کے لئے ممتد کردیا گیا ہے، اوراب ضرورت نہیں کہ اُس میں کسی قسم کی ترمیم اور تنسیخ یا حذف واضافہ کیا جائے۔ حضرت علیؓ تک خلافتِ راشدہ علی منہاجِ النبوۃ قائم کی گئی تھی۔ گوکہ خلافتِ اسلامیہ کا سلسلہ بظاہر تیرہ صدیوں تک قائم رہا، لیکن اُس کی حیثیت ظاہری اور دنیوی بادشاہت کی تھی۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا کہ اُمتِ محمدیہ اور موسویہ میں مشابہت قائم کی جائے، جس کا وعدہ اُس نے سورۃ نور کی ۵۶ ویں آیتِ استخلاف میں بھی بایں الفاظ فرمایا تھا۔ ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنہیں ضرور ضرور زمین میں خلیفے بنائے گا، جس طرح کہ اُس نے اُن لوگوں کو خلیفہ بنایا جو تم سے پہلے ہوکر گزرے ہیں)

چنانچہ اِس وعدے میں لفظ ''منکم'' کے مطابق، ہر صدی کے سَرے پر مجدد دین کا سلسلہ برپا فرمایا۔ اِس کے لئے خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی کہلوایا تھا کہ ''اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا'' (سنن ابی داوٗد، جلد ۲ کتاب الفتن صفحہ ۲۴۱) یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ اِس اُمت کے لئے ہر صدی کے سَرے پر مجدد مبعوث کرتا رہے گا جو آکر دین کو تازہ کیا کرے گا۔

اور اِس طرح مسلمانوں کے لئے خلافت روحانیہ کو قائم رکھا، دین کی تمکنت کے سامان بہم پہنچائے اور جب بھی حالتِ خوف طاری ہوئی، اُسے خلافتِ روحانیہ یعنی مجددیت کی برکت

سے حالتِ امن سے بدل کر اپنے وعدے کو پورا فرماتا رہا۔اور ساتھ ہی اپنے محبوب اور ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوا کر کہ ''میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں'' اِس سلسلہء مجددین کو پے در پے بھیجے گئے انبیاءِ بنی اسرائیل سے مشابہت تامہّ عطا فرما دی۔اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقعہ پر فرمایا تھا ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ'' کہ علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ واضح ہو کہ قرآنی اصطلاح میں علماء سے مراد ایسے لوگ ہرگز نہیں ہیں جو کسی یونیورسٹی یا دینی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہوں اور اپنے ناموں کے پیچھے ڈگریوں کی قطار رکھتے ہوں۔قرآنی اصطلاح میں عالم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خود عِلم سکھائے۔جیسا کہ فرمایا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ (البقرۃ: ع ۳۹،آیت ۲۸۳) ''اور تم اللہ کا تقوٰی اختیار کرو (اور اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تمہیں عِلم دے گا'' یعنی حقیقی تقوٰی یہ ہے کہ ساتھ ہی اللہ کی طرف سے اُس کی تصدیق ہو جائے اور اپنی پسند اور خوشنودی کا سرٹیفکیٹ اللہ تعالیٰ اپنے عِلم سے سرفرازی کے رنگ میں بندہ کو دے۔اور ظاہر ہے کہ اِس کا ذریعہ وحی والہام ہے۔ایک اور جگہ فرمایا۔''اَلرَّحْمٰنُ ۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' (الرحمن آیت ۲،۳) یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ وہ اپنی خصوصی صفتِ رحمانیت کے نتیجے میں یعنی بغیر کسی استحقاق کے محض اپنے فضل سے کسی انسان کو چُن لیتا اور اپنے پاک کلام قرآن کا عِلم عطا فرماتا ہے۔صفتِ رحمانیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ خود اپنے فضل سے خود چُن لے،اپنے عِلم سے اُسے سرفراز کرے اور حکمت و معارف کے موتیوں سے مالا مال کردے۔ ہمارے خود ساختہ معیارِ عِلم کی اُسے پرواہ نہیں ہوتی۔ایک اور جگہ فرماتا ہے۔''وَکَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَیُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ''(یوسف: آیت ۷) (اور جیسا کہ تُو نے دیکھا ہے) اُسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا اور (الٰہی) باتوں کا عِلم تجھے بخشے گا) یعنی عِلمِ

الٰہی حاصل کرنے کے لئے برگزیدگی ضروری ہے لیکن وہ بھی خود ہی عطا ہوتی ہے۔اِسی کو وہبیت کہتے ہیں اسی بات کو ایک اور رنگ میں یوں واضح کیا ’’لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ‘‘ (سورۃ الواقعہ ع ۳ آیت ۸۰) یعنی اِس قرآن سے مَس صرف ان ہی کو حاصل ہوسکتا ہے جو مُطہر وجود ہوں۔ چنانچہ مجددینِ اُمّت محمدیہؐ کے حالات کو غور سے پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے خود یہ دعوٰی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پڑھایا ہے اور اپنی وحی والہام کے ذریعہ علمِ الٰہی اور معارف واسرارِ قرآنی ہمیں سکھائے ہیں۔ایک طرف تو یہ فرمایا کہ اِس قرآن کی حقیقت سے صرف وہی لوگ واقف ہوسکتے ہیں۔ جو مطہر ہوں اور دوسری طرف طہارت اور برگزیدگی کو اپنے ذمہ لیا ہے اور ساتھ ہی اُس کے نتیجہ میں علمِ الٰہی سے سرفرازی کو بھی اپنی ذات تک محدود کرلیا ہے۔(یوسف: آیت ۷)

اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اِس لئے ہر زمانہ میں خاص الٰہی علوم سے بہرہ ور رہنے والے افراد ہی اُس زمانے کے مصلح بنائے جاتے ہیں، اِس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجود دنیا بھر کی مخالفتوں اور کفر کے فتوؤں کے وہ دلیرانہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس زمانے میں اصلاح کا کام ہمارے ذمہ لگایا ہے اور ہمیں مامور فرمایا، اور پھر کامیاب ہوکر بھی دکھادیتے ہیں، گویا کہ عالم ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ کوئی شخص کھڑا ہو اور اعلان کرے کہ مَیں اِن علوم سے بہرہ ور ہوں، اور یہ عُلوم میرے خدا نے محض اپنے فضل سے مجھے، اپنی فلاں وحی اور فلاں الہام سے سکھائے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مجددِدین ایسا نہیں گزرا، جس نے یہ دعوٰی نہ کیا ہو کہ اُسے خدا تعالیٰ نے اصلاحِ امت کے لئے مامور فرمایا ہے، خود ہی علم عطا کیا ہے اور اُس علم کی تبلیغ وتلقین کے لئے خاص حُکم کے ساتھ بھجوایا ہے۔معلوم ہوا کہ اصلاحِ امت اور اصلاحِ جہاں خودساختہ افراد یا جماعتوں کے ذریعہ نہیں بلکہ خدا کی طرف سے کھڑے کئے

گئے افراد اور اُن کے ذریعہ قائم کئے گئے سلسلوں سے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ ہم دو مثالیں دو عظیم الشان ایسے بزرگوں اور مجددینِ اُمت مسلمہ کی، جو ہمارے زمانے سے قریب تر گزرے ہیں، بطورِ شہادت یہاں درج کرتے ہیں۔

۱) حضرت امام ربانی مجدد الفِ ثانیؒ (مجدد گیارہویں صدی) علوم لَدُنِیّہ اور معارف کے حصول کے ذرائع وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد اپنے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ (ترجمہ) جس شخص کو علوم و معارف ملے ہیں، وہی اِس صدی کا، (گیارہویں صدی کا) مجدد ہے۔ چنانچہ یہ بات اُن لوگوں پر مخفی نہیں، جنہوں نے اِس کے علوم پر نظر کی ہے اور اُن معارف کو ملاحظہ کیا ہے۔ جو اِس شخص کو دئے گئے ہیں، یعنی جو کچھ اب تک لوگوں نے دیکھا ہے، وہ بہت قلیل ہے۔ اِس کی شان اِس سے بڑھ کر ہے اور یہ خاص اُس ذات کا فضل ہے جس نے لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک ہادی بھیجا ہے۔ ..اور معلوم ہو کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد ہوتا رہا ہے۔لیکن صدی کا مجدد اور چیز ہے اور الف کا اور...اور مجدد وہ شخص ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں جس قدر فیض امتوں کو پہنچتا ہے، وہ صرف اُسی مجدد کے توسط اور وسیلے سے پہنچتا ہے، خواہ اُس زمانے کے قطب اور اوتار اور ابدال اور نجباء بھی موجود ہوں۔

(مکتوبات امام ربانی جلد ۲، مکتوبات چہارم، جلد ۱۴، ۱۳ بحوالہ عَسَلِ مصفیٰ صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳)

۲) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ مجدد دوازدہم (بارہویں صدی) اپنی معرکتہ الآراء تصنیف ''**تفہیماتِ الٰہیہ**'' میں طریق سلوک اور اُس میں قرب کے پانچ ذرائع کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ترجمہ ''اور میرے رب نے مجھے مطلع فرمایا ہے کہ ہم نے تجھے اِس طریقہ کا امام مقرر کیا اور اُس کی اعلیٰ بلندی تک پہنچایا اور ہم نے آج کے روز سے باقی سب طریقوں کو حقیقت قرب

تک پہنچنے سے مسدود کر دیا، بجز اُس طریقے کے جو تجھے دیا گیا۔ اور وہ ایک ہی طریقہ ہے جو کُھلا رکھا گیا ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ تجھ سے محبت کریں اور تیری فرمانبرداری کو ذریعہ نجات سمجھیں۔ اور اَب آسمانی برکات اُس شخص پر نہیں ہوں گے۔ جو تیرے ساتھ عداوت اور بُغض رکھے گا اور نہ ارضی برکات کا مورد ہوگا۔ اور مشرق اور مغرب کے لوگ تیری رعیت کر دئے گئے ہیں اور تُو اُن کا بادشاہ مقرر کیا گیا ہے۔ خواہ وہ لوگ تیری اِس حقیقت سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ اگر واقف ہوں گے تو فائز المرام ہوں گے اور اگر بے خبر رہیں گے تو خسارہ اور ٹوٹا پائیں گے۔''

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں۔

''جب دورہ حکمت کا انتہاء تک پہنچ چکا تو اللہ تعالیٰ نے خلعتِ مجددیت سے سرفراز فرمایا اور جب حقانیت کا خلعت مجھے پہنایا گیا اور ہر نظری اور فکری علم مجھ سے زائل کر دئے گئے تو مَیں بادیہء حیرت میں سرگرداں رہا کہ مَیں کیونکر مجددیت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں گا''

(تفہیماتِ الٰہیہ بحوالہ عَسَلِ مصفی صفحہ ۱۷۴:۱۷۵)

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کِس طرح معلوم ہو کہ فلاں مدعی ماموریت واقعی اپنے دعوٰی میں سچا بھی ہے، اور اُس کا قائم کردہ سلسلہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اُس کے لئے اُس فرد کی طرف سے اپنی ماموریت کا اعلان کافی ہے، اور ساتھ ہی زمانہ بھی ایک مامور کی ضرورت کا متقاضی ہو۔ اور جب وہ یہ اعلان کر چکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے اور اپنی فلاں وحی یا الہام کے ذریعے اپنی ماموریت کے اعلان کا حکم دیا ہے تو پھر اُس کا معاملہ براہِ راست خدا کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ ہمارے لئے کوئی ایسی صورت نہیں رہ جاتی کہ ہم اُس کی صداقت کے لئے اپنا معیار یا اپنی کسوٹی پیش کریں۔ کیونکہ

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ ’’وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ. لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ. ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ‘‘(الحاقۃ:۴۵تا۴۷) اگر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹا) الہام بنا لیتے تو ہم اُن کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور شہ رگ یعنی رگِ جان کاٹ دیتے۔

اسی طرح فرمایا کہ

’’وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ. وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ‘‘ (المؤمن:۲۹)

’’اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ‘‘ (النحل:۱۱۷)

’’قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا‘‘ (احقاف:۹)

’’قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ‘‘(ھود:۳۶)

ترجمہ:۔ اگر یہ مدعی جھوٹا ہوگا تو اِس کے جھوٹ کا وبال اِسی پر پڑے گا اور اگر وہ سچا ہے تو اِس کی کی ہوئی بعض (انذاری) پیشگوئیاں تمہارے متعلق پوری ہو جائیں گی۔ جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (اے رسول) کہہ دے کہ اگر مَیں نے یہ افتراء کیا ہے تو اِس کا وبال (خود) مجھ پر پڑے گا۔ ہاں! مَیں تمہارے جُرموں سے بیزار ہوں۔ (وَالْاَصْلُ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فِعْلِيْ عَقُوْبَةُ اِفْتِرَائِيْ) یعنی سچ یہ ہے کہ اگر مَیں نے افتراء کیا ہے تو مجھے میرے افتراء کی سزا ملے گی۔

(روح المعانی جلد ۳ صفحہ ۵۴۶)

کوئی مجدد ایسا نہیں گزرا کہ علماءِ ظواہر یعنی فارغ التحصیل علماء نے مخالفت نہ کی ہو۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مامورین و مرسلین کے لئے بڑے ہی دُکھ کے ساتھ

فرمایا ہے کہ یَا حَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَأْتِیْہِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِئُوْنَ (یٰس :۳۱) یعنی ہائے افسوس! (انکار کی طرف مائل) بندوں پر کہ جب کبھی بھی اُن کے پاس کوئی رسول آتا ہے، وہ اُس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور تمسخر کرنے لگتے ہیں)

یعنی یہ ایک سنتِ مستمرہ ہے کہ اللہ کے رسول **(من حیث المجموع)** ہمیشہ مخالفتوں اور حقارت واستہزاء کا سامنا کرتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مجددین اُمّتِ محمدیہؐ نے بھی مرسلین کی اِسی سنت سے حصہ پایا ہے تو اُس حدیث کا مفہوم صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔ جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ ''یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کا درجہ رکھتے ہیں۔ (اور ساتھ ہی لفظ ''علماء'' کی بھی تعین ہوجاتی ہے)

نوٹ:۔ یہاں پر یہ نوٹ بے سبب نہیں ہوگا، اگر ہم یہ بتائیں کہ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے کَ یا کما کے حرف یا لفظ سے دو چیزوں میں مثبت مشابہت کا تعریفی رنگ میں ذکر کیا ہے، وہاں مُشبّہ عموماً مشبّہ بہ سے کمال میں بڑھ کر ہوتا ہے۔

مثلاً آیت اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلاً شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلاً (سورۃ المزمل) میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مُشبّہ اور حضرت موسیٰؑ علیہ السلام مشبّہ بہ ہیں۔ بظاہر مشابہتِ تامہّ کا ذکر ہے۔ لیکن مُشبّہ کا درجہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ حضرت موسیٰؑ سے بہت بڑھ کر ہے۔ اِسی طرح دُرودِ ابراہیمی میں جو صلوٰۃ اور برکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لئے ابراہیمی صلوٰۃ اور برکت کے مشابہ مانگی گئی ہے، لیکن اِنعام کے وقت اُسے بڑھا دیا، چنانچہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقصودِ تخلیق کائنات کہا تو اُمّتِ محمدیہ کو بھی خیر اُمّت کے خطاب سے نوازا۔ چنانچہ مذکورہ زیرِ

بحث حدیث میں بھی علماءِ اُمّتِ محمدؐیہ فضیلت اور برکت کے لحاظ سے انبیاء بنی اسرائیل پر فوقیت رکھتے ہیں۔ جو کام علماءِ اُمّتِ محمدیہؐ نے انجام دئے، اور اللہ کی خاطر جن دکھوں اور تکلیفوں سے گزرے وہ انبیاء بنی اسرائیل کے ذمہ داریوں سے بہت بڑھ کر ہیں۔ وہ علماءِ اُمّتِ محمدیہ یعنی مجددینِ کرام جنہوں نے قرآنی سنت کے مطابق خود خدا سے عِلم پا کر اصلاحِ جہاں کا بیڑہ اُٹھایا، انبیاء بنی اسرائیل ہی کی طرح دُکھ دئے گئے اور خدائی سنت کے مطابق فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ (مائدہ:۵۷) (یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب (ہوکر رہنے والی) ہے۔ غیر معمولی مخالف حالات میں کامیاب اور کامران ہو کر اپنی صداقت پر مہر لگا گئے۔

دِل دہلتے ہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

(چکبست)

غلبہ اور کامرانی کی یہی بات جو اللہ تعالیٰ نے اپنی جماعت یعنی اپنے پسندیدہ گروہ انسانی کے متعلق کہی ہے، اپنے انبیاء کے متعلق بھی کہی ہے۔ فرمایا ''کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ'' (المجادلہ:۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر چھوڑا ہے کہ مَیں اور میرے رسول ہی غالب آئیں گے) پس ایک سے حالاتِ مخالفت و کامرانی جو سلسلہ ہائے مجددین اور انبیاء میں مُشترک ہیں۔ مجددین کی اہمیت کو واضح کرتے اور بتاتے ہیں کہ مجددین دراصل انبیاء کے ظِل ہوتے ہیں۔ اور حقیقتاً وہی ہوتے ہیں جنہیں علماءِ ربانی کہا جاتا ہے۔ اِسی طرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے جو کنز العمال جلد ٦ صفحہ ۱۹۳ میں ابن عساکر نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔ ''رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

جس قدر انبیاء گزرے ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی نظیر یعنی مثیل میری اُمّت میں سے ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مثیل اور عمر حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے اور عثمان حضرت ہارونؑ کے مثیل ہیں اور علیؓ ابن ابی طالب میرا مثیل ہے۔ اور جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھنا چاہے وہ ابوذر غفاریؓ کو دیکھ لے"۔

نجم الثاقب جلد نمبر ۲ میں حضرت مولانا محمدؒ اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کے قصیدہ سے ایک شعر حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ کی شان میں نقل کیا گیا ہے کہ ؎

سید احمد باہمہ اصحابِ خود روزی رسید
باصحابہ گوئی آمد باز ختم المرسلیں

یہاں حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ کو مجازاً ختم المرسلیں اور آپ کے اصحاب کو صحابہء کرام کہہ دیا گیا ہے۔

ہم اپنے اِس مضمون کی تائید میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف تذکرہ سے بھی چیدہ چیدہ حوالے نقل کرتے ہیں۔ مولانا مجددینِ امت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"نظامِ شمسی کی طرح نظامِ انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں، مگر تم کو اُن کا حال نہیں معلوم۔ تم کو اجرامِ سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالَمِ انسانیت کے نظام و مراکز کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا؟ تاہم یہ معلوم رہے کہ ہر عہد و دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکزِ شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبہء انجذاب ہوتا ہے۔"

(تذکرہ: صفحہ ۵۵/۵۶)

"ازانجملہ سب سے اعلیٰ و اَمثل طبقہ اُن اخص الخواص نفوس مُزکی کا ہے جن کو قائدِ

توفیق الٰہی، وسائق فیضانِ ربانی، عزائم امور کے لئے چُن لیتا ہے کہ وَاِنَّ ذٰلِكَ لَمِنَ الْعَزْمِ الْاُمُوْرُ اور جن کا نورعلم وعمل مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ اور جن کا قدم طریق منہاجِ نبوت پر واقع ہوتا ہے۔اُنہی افرادِ خاصہّ کوحدیثِ بخاری میں مُحَدَّ ث (بالفتح) کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔اور یہی مورِد ومِصداق حدیث مجدّ د کے ہیں۔جومختلف طرق سے مروی اور اِس لئے بلحاظِ صحتِ متن اُس کی صحت میں کلام نہیں۔یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظامِ حق وہدایت کا مقوّم ومنظم ہے، اورانبیاء کرام کی اصلی وراثت اُن ہی میں منتقل ہوتی ہے.....اِس کے لئے نہ تو مُجرّ دعلم وتدریس کتب کام آتی ہے، نہ رسوم وہیئات زُہدوانقطاع۔نہ مَدارس ومَعابد دینی کے غُلغُلہ وہنگامہ ءفضیلت کو اِس میں دخل ہے اور نہ صومعہ وخانقاہ کے گوشہءِ انزوا کو۔اُن کے عہد میں علماء اوراصحابِ مشیخت کی کمی نہیں ہوتی اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مَدرسے اُجڑ جاتے ہوں اور خانقاہیں مُنہدم ہوجاتی ہوں، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت وشہرت کے لحاظ سے اُن کا زمانہءعلماء ومشائخ امت کا سب سے بڑا مجمع و ماوٰی ہوتا ہے۔اور آبادیوں کی آبادیاں اصحابِ علم وپیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں۔تاہم مقامِ عزیمت ودعوت وقیامِ ہدایت کی اُن میں سے کسی کو بھی توفیق نہیں ملتی۔کوئی دامنِ رخصت میں پناہ لیتا ہے۔کوئی گوشہءانزواو انقطاع میں صرف اپنی حفاظت وعافیت کو ڈھونڈ تا ہے۔کوئی راہ میں فتنہ وفساد کا شورسُن کر اِسی کو کافی سمجھ لیتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کرلے۔کِسی پر ضُعف الایمان کا درجہءتنزل وتشغّل اِس طرح طاری ہوجا تا ہے کہ زبان کو یکسر گُنگ اور دستِ عمل کو یک قلم شل پا تا ہےاور کسی کو نفسِ خادع اور خاطرِ فاسد، ضلالتِ حیل ونفاق میں مبتلا کرکے سرگرمِ دنیا پرستی ودین فروشی کردیتا ہے.....تو اُس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سنتِ الٰہی، عادتِ جاریہ کے مطابق، قیامِ حق ووضع باطل کیلئے سرگرمِ اِنبعاث وظہور ہوتی ہے اور توفیق الٰہی اپنے کسی اَصلح واَمثل بندے کے قلب کا عزیمتِ دعوت

کے لئے انشراح کر دیتی ہے اور اُس کے قدم طریق کو منہاج نبوت پر ثابت و مُستقیم فرما دیتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام اصحابِ علم وفضیلت، اور اربابِ صوامع ومدارس کو تنگنائے رُخصت وضُعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے.....مقامِ عزیمت و دعوت کی جس بلندی تک بڑے بڑے کارفرمایانِ عہد کی نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتی تھیں اور ضُعفاءِ زمان و بیچارگانِ رخصت کے وہم وگمان کو بھی اُس تک بار نہ تھا، اُس کا شہبازِ ہمت اور سیمرغِ عزم اُس کی چوٹیوں پر بھی جا کر دم نہیں لیتا اور پیوستہ سرگرمِ بال افشانی وہموارۂ صغیر زنانِ بلند پروازی رہتا ہے۔"

(تذکرہ: صفحہ ۹۴ تا ۹۶)

پھر آگے فرماتے ہیں۔

"پس اپنے عہد کا مجدّد ومحی الملت وہ شخص یا چند نفوسِ خاصہ ہوتے ہیں جو مُجرّد دعوت نہیں بلکہ عزائم اُمورِ دعوت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور قیامِ حق کا صُور اِس زور سے پھونکتے ہیں کہ یکا یک فضاءِ مِلّت جنبش میں آجاتی ہے اور تمام امواتِ غفلت اپنی اپنی قبروں کے اندر چمک اُٹھتے اور اُٹھ کر دوڑنے لگتے ہیں.....یہی وہ مقامِ مخصوص ہے جو ہر عہد میں صرف ایک یا چند افرادِ عالیہ ہی کے حصہ میں آتا ہے، اور گو کاروبارِ دعوت سے معاملات رکھنے والے بہت سے موجود ہوں، مگر اُس عہد کے فتح یاب اور سلطانی وامرِ دعوت کی فضیلت اُن کو نصیب نہیں ہوتی۔ سب ناچار ہوتے ہیں.....اُس عہد کے خزائن وبرکات کی کُنجی اُسی کے قبضہ میں دے دی جاتی ہے۔ پس طالبینِ فیضان اُس کے حلقہءِ ارادت سے الگ رہ کر کچھ نہیں پا سکتے۔ اگر کسی نے بطریقِ استراقِ سمع، کوئی کلمہء حقیقت حاصل بھی کر لیا تو اول تو وہ مُثمر برکات نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چونکہ عہد کی سلطان فاتح وعازمِ دعوت ہی کو پہنچتی ہے، اِس لئے وہ بھی بالواسطہ

اُسی کے فیضان و بخشش میں سے شمار کیا جاتا ہے۔''

(تذکرہ: صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹)

حضرات! سامعینِ کرام! سُن لی آپ نے صحیح تعریف ''علماء'' کی؟ اور سمجھ لیا آپ نے حقیقی مفہوم حدیث ''عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِبَنِیْ اِسْرَائِیْل'' کا؟

ایک اور مقام پر مولانا آزاد اِس مفہوم کو یوں متعین و مشخص کرتے ہیں کہ

''کوئی قائم حق و داعی اصلاح و کاشف حقائق، فوز و نصرت نہیں پاسکتا، جب تک اُس کا قدم منہاجِ نبوت پر واقع نہ ہوا ہو..... اور اِس راہ و تشبّہ بالانبیاء میں جس داعیءحق کا قدم جس حد تک پہنچتا ہے، اُسی حد و مقام کے مطابق، کم و بیش ثمرات و برکاتِ ظاہر و باطن حاصل ہوتے ہیں۔ یہی حقیقت شیخ اکبر کی اصطلاح میں خصوص اور بعض اصحابِ اشارات کی اصطلاح میں نسبت کے لقب سے ظاہر کی گئی ہے، کہ کسی واصلِ باللہ کا قدم تاسی و اتباع، حسبِ استعداد و داعیاتِ وقت، کسی ایک نبی کی منہاج پر واقع ہوتا ہے اور کسی کا کسی دوسرے نبی کی منہاج پر۔ اور اُس کو بوجہءغلبہءمابہ الاختصاص، اُس نبی سے ایک خاص طرح کی نسبت حاصل ہوجاتی ہے۔''

(تذکرہ: صفحہ ۲۴۸)

اِسی کی طرف اُس حدیث میں اشارہ ہے، جسے پیچھے ہم نے بیان کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''ابوبکرؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور عمر حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کا مثیل ہے۔ اِسی طرح عثمان حضرت ہارونؑ کا اور علیؓ ابن ابی طالب میرا مثیل ہے۔ اور جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھنا چاہے وہ ابوذر غفاریؓ کو دیکھ لے''۔

پیارے دوستو! اِس زمانے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے عین

مطابق، صدی کے سَرے پر حضرت مسیح موعود اور مہدی معہود کی بعثت ہوئی۔ جب وہ اپنا کام کر کے جا چکے تو اُن کی پیشگوئیوں کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں عطا کی تھیں۔ قدرتِ ثانیہ یعنی خلافتِ راشدہ کا علیٰ منہاجِ نبوت قیام عمل میں آیا اور آج ہم اُس خلافت کے پانچویں دور سے گزر رہے ہیں۔ اِسلام کا غلبہ جماعتِ احمدیہ کے ذریعہ مقدر ہے۔ وہ ہو کر رہے گا۔ بس یہ دُعا مانگیں کہ ہمارا اور ہماری نسلوں کا بھی اُس غلبہ میں حصہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں ہم اور ہماری اولادیں سب شامل ہوں۔ آمین یارب العٰلمین۔

(30)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی للہ تعالیٰ عنہا

عائشہ نام تھا اور صدیقہ اور حمیرا لقب
امِّ عبد اللہ کنیت تھی
ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں
ماں کا نام زینب اور ام رومان کنیت تھی

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین حقیقی مونسِ وغم گُسار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جب سال سنہ ۱۰ نبوی میں فوت ہوئیں تو حضور تقریباً بے سہارا ہو گئے تھے۔ نبوت کے کام کو آگے بڑھانے اور عورتوں کی تربیت کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ آپ دوسری شادی کرتے۔ عورتوں کے بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ براہِ راست کسی عورت ہی سے حل ہو سکتے ہیں اور اُس عورت کا نبی کے حرم میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ وہ عظیم خاتون تھیں، جنہوں نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور آپ کی ذمہ داریوں میں یوں مددگار ہوئیں کہ خَم ٹھونک کر دامے، دِرہمے اور سُخنے آپ کی تائید میں کھڑی ہو گئیں۔ اہلِ مکہ کی مخالفتیں اور دشمنیاں حضرت خدیجہؓ کے مقام اور مرتبے اور نیز آپ کے اثر ورسوخ کی وجہ سے آپ کی زندگی میں کھل کر سامنے نہیں آسکیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کے بعد جو غم کے پہاڑ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹوٹے اور کفار کے جور وستم جس رنگ میں آپ پر عام ہو گئے، اُن کی ایک الگ تاریخ ہے۔ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ نبوی کے اُس سال کو **عام الحزن** یعنی غم و

اندوہ کا سال قرار دیا تھا۔اب قریش کو کسی کا ڈر وخوف یا پاس نہیں رہ گیا تھا اور وہ کھل کر آپ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے تھے۔اسی سال آپ اہلِ مکہ سے مایوس ہو کر تبلیغ کے لئے طائف تشریف لے گئے تھے۔

حضرت عائشہؓ اول المؤمنین حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں۔حضرت ابوبکرؓ کا کاشانہ وہ بُرجِ سعادت تھا جہاں آفتابِ اسلام نے سب سے پہلے ضیا پاشی کی۔حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ خیال کہ نکاح کے وقت اُن کی عمر چھ سال اور شادی کے وقت نو سال تھی۔صحیح نہیں ہے۔نئ تحقیق کے مطابق شادی یعنی رُخصتی کے وقت آپ کی عمر پندرہ یا سولہ سال تھی۔تمام ازواجِ مطہرات میں صرف آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ کنواری بیوی تھیں ۔حضرت خدیجہؓ کے بعد الموت جب خولہ بنتِ حکیم نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ دار تھیں۔آپؐ کے سامنے شادی کی تجویز رکھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر عرض کیا کہ ایک چھوڑ و، دو رشتے ہیں۔ایک سَودہ اور دوسری عائشہؓ۔اِس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ کی تجویز کے وقت حضرت عائشہؓ بالغ تھیں۔اور اتنی کم عمر نہیں تھیں جتنی کہ عام طور پر بیان کی جاتی ہیں۔ چھ سال عمر کی بچی کو شادی کے لئے تجویز کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہے۔لڑکی کا ایسے موقعہ پر بالغ ہونا ضروری ہے۔عربوں میں کم عمر لڑکیوں سے شادی عام تھی۔اور اِسے عیب نہیں سمجھا جاتا،لیکن لڑکی کا بلوغت کی عمر کو پہنچ جانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔حضرت عائشہؓ کا نکاح تو مکہ میں ہو گیا تھا۔لیکن وِداعی اور رخصتی کی تقریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ جانے کے بعد عمل میں آئی۔

حضرت عائشہؓ کے نکاح سے عربوں کے بعض بے ہودہ خیالات کی اصلاح ہوئی۔

۱) حضرت ابوبکرؓ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بھائی تھے۔اور عرب

منہ بولے بھائی کی لڑکی سے نکاح نہیں کرتے تھے۔جب حضرت ابوبکرؓ نے خولہؓ سے کہا کہ عائشہ تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی ہے۔پھر یہ نکاح کیونکر جائز ہے،تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْتَ اَخٌ فِی الْاِسْلَامِ کہ تم میرے دینی بھائی ہو۔حقیقی بھائی نہیں۔واضح رہے کہ حضرت ابوبکر نے یہ نہیں کہا کہ چھ سال کی بچی سے شادی کا کیا سوال؟

۲) حضرت عائشہؓ کا نکاح اور شادی دونوں شوال کے مہینے میں ہوئے۔کسی قدیم زمانے میں شوال کے مہینے میں عرب میں طاعون کی وبا پھیلی تھی۔اِس لئے عرب شوال میں شادی نہیں کرتے تھے۔

غزوۂ بنی مصطلق کے موقعہ پر حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔راستے میں آپ کا ہار گُم ہو گیا۔قافلے کو ٹھہرایا گیا اور ہار کی تلاش شروع ہوئی۔یہاں تک کہ نماز کا وقت ہو گیا،اُس مقام پر پانی دستیاب نہیں تھا۔وہیں تیمم کی آیت نازل ہوئی اور اِس اجازت نے سب کو خوش کر دیا۔حضرت سعید بن حضیرؓ نے کہا۔''اے آلِ ابوبکرؓ! تم ہم سب کے لئے سرمایہ برکت ہو۔''

سنہ ۹ ہجری میں ایلاء اور تخیّر کے واقعات پیش آئے۔ایلاء یہ تھا کہ اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں مالِ غنیمت اور دیگر امدادی فنڈوں میں اس قدر آمد ہونے لگی تھی کہ اس کا بہت معمولی سا حصہ بھی اگر امہات المؤمنین پر خرچ کیا جاتا تو وہ سب فراغت کی زندگی بسر کر سکتی تھیں۔تمام ازواج نے مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اِس مد میں خصوصی توجہ کی درخواست کی۔لیکن ابتدائی مرحلے میں ہی حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے خود کو اس مطالبے سے ہٹا لیا۔رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کے اِس مطالبے کو اپنے ضروری کاموں میں حارج سمجھ کر ارادہ کر لیا کہ ایک ماہ تک ازواج سے دور رہیں گے۔آپ نے بالا خانے پر قیام

فرمایا اور ایک ماہ بعد جب نیچے آئے تو سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے ملے۔ وہ ایک ایک دن گِن گِن کر گزار رہی تھیں لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا انہیں اس قدر پاس تھا کہ عرض کیا، یارسول اللہ ابھی تو اُنتیس دن ہوئے ہیں۔ آپ نے جواب دیا۔ ہاں! بعض مہینے اُنتیس دن کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ جو واقعات میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں دو، دو مہینے آگ نہیں جلتی تھی اور اکثر فاقوں کی نوبت رہتی تھی، اُس کی اصل وجہ ازواج مطہرات کی فیاضی، خیر خیرات اور صدقات کی زیادتی تھی۔ جو بھی آتا اُسی وقت مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں اور یہ طریق اُن کی زندگیوں بھر قائم رہا۔

جب آیت تخیّر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔ یا تو اللہ اور اُس کے رسول کو لے لو اور ابدی راحت حاصل کرلو۔ یا پھر دنیا کو پسند کر کے جو کچھ تم چاہتی ہو تو وہ لے کر مجھ سے رُخصت ہو جاؤ۔ تمام ازواج نے دنیا سے بیزاری اور اللہ اور اس کے رسول سے رغبت کا اظہار کیا، لیکن حضرت عائشہؓ نے سب سے پہلے اپنا عندیہ ظاہر کیا کہ مَیں سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور اُس کے رسول کو لیتی ہوں۔

ربیع الاول ۱۱ھ ہجری میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ تیرہ دن علیل رہے۔ جن میں سے آٹھ دن حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں مقیم رہے۔ درمیان میں ایک دن اتوار آیا تو پوچھا کہ کل مَیں کہاں ٹھہروں گا۔ تمام ازواج نے کہا جہاں آپ پسند فرمائیں۔ پیر کے دن حضرت عائشہؓ کے ہاں ٹھہرنے کا تھا۔ ضعف بہت زیادہ ہو گیا تھا اور چلا نہیں جاتا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں نے بازو تھام کر آپؐ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں پہنچایا۔ وفات سے پانچ روز قبل آپؐ کو اچانک یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں حضرت عائشہؓ کے پاس رکھوائی

تھیں۔اُن سے کہا کہ کیا محمدؐ اپنے خدا سے بدگمان ہوکر ملے گا۔جاؤان کوخدا کی راہ میں خیرات کردو۔جس دن آپ نے وفات پائی،یعنی دوشنبہ(پیر کے دن)بظاہر طبیعت ٹھیک تھی اورسکون تھا۔لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا تھا،بے چینی بھی بڑھتی جاتی تھی۔یہاں تک کہ غشی طاری ہوگئی تندرستی کی حالت میں آپ اکثرفرمایا کرتے تھے کہ انبیاءکواختیار دیاجاتا ہے کہ وہ موت کو قبول کریں یا دنیا کی حیات کوترجیح دیں۔بیماری کی حالت میں بار بار یہ الفاظ آپ کی زبان پر جاری تھے۔''مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ '' اورکبھی فرماتے'' اللّٰھُمَّ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی ''حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقت الٰہی مطلوب ہے۔

وفات سےتھوڑی دیرقبل حضرت عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمن خدمت میں حاضر ہوئے ۔اُن کے ہاتھ میں نئی مسواک تھی۔حضورؐ نے نظر بھر کر مسواک کو دیکھا۔حضرت عائشہؓ نے خیال کیا کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔اپنے بھائی سے مسواک لے کراپنے دانتوں سے نرم کی اورحضور کی خدمت میں پیش کی۔حضور نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی۔حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ تمام بیویوں میں مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ آخری وقت میں حضور نے میرا جوٹھا منہ سے لگایا۔ وفات کا وقت قریب آرہاتھا۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کوپکڑےاورسنبھالے بیٹھی تھیں۔دفعتاً بدن کا بوجھ بڑھ گیا۔دیکھاتوروحِ پاک رفیق اعلیٰ سے جاملی تھی۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آہستہ آہستہ سے سرتکیہ پر رکھ دیااوررونے لگیں۔

حضرت عائشہؓ کے مناقب میں یہ بات بھی ہے کہ آپ کے حجرے کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن بننا نصیب ہوا۔ازواجِ مطہرات کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں امہات المؤمنین یعنی مؤمنوں اورمسلمانوں کی مائیں قرار دیاتھا۔اس لئے وہ دوسرا نکاح توکرنہیں سکتی

تھیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اڑتالیس (۴۸) سال بیوگی میں بسر کئے۔آپ کا مقصد اولین قرآن وحدیث کی تعلیم تھی۔آپ کے شاگردوں کی تعداد دوسو ہے۔جو بعد میں بلکہ آپ کی زندگی میں ہی بڑے بڑے محدّث اور عالم کہلائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضور کے پہلو بہ پہلو، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے میں ہی مدفون ہوئے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے خاص طور پر اجازت لے لی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کی اغراض میں، یہ غرض بھی پیش نظر تھی کہ آپ غیر معمولی ذہین، حافظہ کی تیز، ذکی الحس اور معاملہ فہم تھیں۔مشاہدہ بہت قوی تھا، مشکل سے مشکل مسئلہ منٹوں میں حل کر دیا کرتی تھیں، آپ کی نقد وجرح اتنی مکمل اور دلائل سے پُر ہوا کرتی تھی کہ بڑے بڑے صحابہ بھی اُن سے اتفاق کرتے تھے اور کوئی دم نہ مار سکتا تھا، آپ سے شادی کی اغراض میں ایک یہ بھی تھی کہ آپ نوعمر تھیں اور امید تھی کہ حضور کے بعد آپ لمبا عرصہ زندہ رہیں گی اور تعلیم وتربیت کے کام عمدگی سے ادا کرسکیں گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ''ہمیں کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی کہ ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا ہو اورانہوں نے اُسے حل نہ کر دیا''

امام زہری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''حضرت عائشہؓ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں۔اکابر صحابہؓ ان سے پوچھا کرتے تھے۔'' امام زہری کی ایک اور روایت ہے۔ ''اگر تمام مردوں کا اور تمام عورتوں اور تمام امہات المؤمنین کا عِلم ایک جگہ جمع کیا جائے تو

حضرت عائشہؓ کا علم سب سے بڑھ کر ہوگا''

عُروہ بن زبیرؓ کا کہنا ہے کہ

''قرآن، فرائض، احادیث، حلال وحرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ اور انساب کا عالم حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا''

حضرت عائشہؓ کا شمار مجتھدین صحابہ میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اُن کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے وقت میں وہ فتوٰی دیا کرتی تھیں۔ انہوں نے بڑے بڑے صحابہ پر جو دقیق اعتراض کئے ہیں اور مدلل بحثیں کی ہیں، انہیں علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ جس کا نام ''عین الاصابة'' ہے۔ انہوں نے (۲۲۱۰) احادیث روایت کی ہیں۔ جو حضرت ابوہریرہؓ کے بعد سب سے بڑی تعداد ہے۔ قرآنِ مجید کی ترتیبِ نزول، مدینہ میں اسلام کی کامیابی کے اسباب، غسلِ جمعہ، نماز قصر کی علّت، صومِ عاشورہ کا سبب، حج کی حقیقت، اور ہجرت کے معانی کی انہوں نے خاص تشریحیں کیں۔ تاریخِ عرب کے متعلق اُن کا علم لاجواب تھا۔ عرب جاہلیت کے حالات، رسم ورواج، انساب اور طرزِ معاشرت کے متعلق ایسی باتیں انہوں نے بتائی ہیں جو کسی اور جگہ نظر نہیں آتیں۔ اسلام کی تاریخ سے متعلق مثلاً آغازِ وحی کی کیفیت، ہجرت کے واقعات، واقعہ اِفک، نزولِ قرآن، ترتیبِ قرآن، نماز کی صورتیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کے حالات، غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ خندق، بنوقریظہ کے واقعات، غزوۂ ذات الرقاع، نمازِ خوف، فتح مکہ پر عورتوں کی بیعت، حجۃ الوداع کے حالات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات، خلافتِ اولیٰ، حضرت فاطمہؓ اور ازواجِ مطہرات کا دعوٰی میراث، حضرت علیؓ کا ملالِ خاطر، اور پھر بیعتِ

خلافت کے مفصل حالات حضرت عائشہ کے ذریعہ ہی ہم تک پہنچے ہیں۔

ادب میں اُن کا ایک خاص مقام تھا۔نہایت شیریں کلام اور فصاحت سے لبریز تھیں۔حضرت موسیٰ ابن طلحہؓ کا قول ہے کہ مَیں نے حضرت عائشہ سے زیادہ فصیح اللسان کسی اور کونہیں دیکھا۔احادیث کے بیان میں جہاں جہاں اُن کے بیان کردہ الفاظ محفوظ رہ گئے ہیں۔ ادب کی جان ہیں۔آغازِ وحی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔آپ جوبھی خواب دیکھتے تھے، سپیدہ سحر کی طرح عیاں ہوجاتا تھا۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا۔اُس کیفیت کو یوں بیان فرماتی ہیں۔ 'پیشانی پر موتی ڈھلکتے تھے''

واقعہ اِفک کا ذکر کرتے ہوئے جس میں آپ پر جھوٹا الزام منافقوں کی طرف سے لگایا گیا تھااور کئی راتوں تک آپ سونہیں سکی تھیں۔فرماتی ہیں۔''مَا کتَحِلُ بِنَوْم'' اُن دنوں مَیں نے کبھی سرمہ خواب نہیں لگایا۔خطبات میں یعنی تقریروں میں ان کا درجہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کے بعد تیسرا ہے،جنگِ جمل کے موقعہ پرانہوں نے جوتقاریر کیں،وہ محفوظ ہیں اور عربی انشاء کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔اُن کے شاگردوں کی تعداد دوسو(۲۰۰) ہے۔وہ نہ صرف بہت سے علوم کی ماہر تھیں، بلکہ اپنے شاگردوں کوبھی ماہر بنادیتی تھیں،صحیح بخاری میں ان کے ذریعہ امِّ زرع کا جوقصہ بیان ہوا ہے وہ ادب کی جان ہے۔اورادب کے شائقین نے اُن کی شرحیں لکھی ہیں۔علم الکلام کے بے شمار مسائل میں انہوں نے گفتگو کی ہے۔رؤیت باری تعالیٰ،علم الغیب، عصمتِ انبیاء، معراج النبیؐ، ترتیبِ خلافت، سماعِ موتیٰ، وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر انہوں نے مدلل بحث کی ہے۔جن سے اُن کی دقّتِ نظری کا پتہ چلتا ہے۔

اخلاق وعادات کے لحاظ سے بھی اُن کا درجہ بہت بلند ہے۔بے حد قانع تھیں۔یعنی

جو مل جاتا اُسی پر شکر کرتیں۔ غیبت سے بہت دور تھیں۔ احسان کم ہی قبول کرتی تھیں۔ خودستائی پسند نہ فرماتی تھیں۔ نہایت خوددار تھیں۔ شجاعت اور دلیری میں بھی اُن کا بڑا درجہ تھا۔ اُن کا نمایاں وصف جود وسخا تھا۔ ایک بار امیرِ معاویہؓ نے اُن کی خدمت میں ایک لاکھ درہم بھجوائے۔ شام ہوتے ہوتے سب تقسیم کر دئے۔ اُن کا روزہ تھا۔ لونڈی نے کہا کہ افطار کے لئے کچھ نہیں ہے۔ فرمایا پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیر جو اُن کے بھانجے تھے اور انہیں حضرت عائشہؓ نے گود لے لیا تھا، اُن کی فیاضی دیکھ کر گھبرائے اور اُن کا ہاتھ روکنا چاہا۔ جب معلوم ہوا تو اُن سے سخت خفا ہو گئیں، اور ایک عرصہ تک اُن سے خفا رہیں۔ نہایت عبادت گزار تھیں۔ چاشت کی نماز پابندی سے پڑھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات میں تہجد بلا ناغہ پڑھتی تھیں۔ اور یہ عادت ہمیشہ قائم رکھی۔ اکثر روزے رکھتیں اور حج کی بے حد پابند تھیں اپنی زندگی میں انہوں نے اپنی جیب سے خرید کر ۶۷ غلام آزاد کئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ۴۸ سال زندہ رہیں اور امیر معاویہ کے اخیر زمانہ میں رمضان سن ۵۸ ہجری میں وفات پائی۔ (۶۷) سال سِن تھا۔ حسبِ خواہش اور وصیت جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

(31)

سیرت حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حکیم الامت حضرت مولوی نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بہت بڑے عالمِ دین، جید حکیم، مُناظر، فقیہ، مُحدّث اور اعلیٰ پایہ کے منتظم تھے۔ ایک بار سرسید احمد خان سے کسی نے پوچھا کہ ایک مسلمان اپنی روحانی ترقیات میں کیا کچھ بن سکتا ہے تو سرسید نے کہا کہ وہ ترقی کرکے ولی، قطب، اور ابدال وشہید کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اُس شخص نے پوچھا سب سے آخری درجہ کیا ہے تو سرسید نے جواب دیا کہ پھر سب سے آخری درجہ یہ کہ وہ نورالدین بن جاتا ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مسیح موعود علیہ السلام نے ابھی مسیحیت کا دعویٰ نہیں فرمایا تھا اور حضرت مولانا نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ سرسید احمد کے ساتھیوں اور علیگڑھ کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے تھے۔ تمام زندگی آپ کی مختلف علوم کی تلاش اور سیکھنے میں گزری، بچپن ہی سے ذہین اور حافظِ قرآن تھے، اسلام اور بانئ اسلام سے بے پناہ عشق رکھتے تھے، اپنے مُرشد حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریب اور آپ کی سب سے بڑھ کر اتباع کرنے والے تھے۔ ایک بار حضرت مسیح موعود علیہ السلام قادیان سے باہر تھے۔ ایک آدمی آیا۔ آپ اپنے دواخانے میں بیٹھے تھے۔ اُس آدمی نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پیغام دیا کہ حضور نے آپ کو بلوایا ہے۔ اور کہا ہے کہ جس حالت میں بھی ہوں فوراً چلے آئیں۔ آپ بسم اللہ کہہ کر اُٹھے، گھر میں اطلاع بھی نہیں دی۔ پگڑی بھی نہیں پہنی اور اُس آدمی کے ساتھ چل پڑے۔ ایک بار بٹالہ سے

ایک ہندو آیا اور کسی مریض کو دکھانے کے لئے بٹالہ تک چلنے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تو حضرت مرزا صاحب کے غلام ہیں۔ اُن سے اجازت لے لو۔ چنانچہ وہ شخص گیا اور حضور علیہ السلام سے اجازت حاصل کر لی۔ حضور نے مولانا صاحب سے پوچھا کہ آپ کب تک واپس آ جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ وہاں رکنا نہیں ہے۔ بس مریض کو دیکھ کر اور دوائی دے کر چلا آؤں گا۔ آپ اُس ہندو کے ساتھ ٹانگے میں سوار بٹالہ پہونچے۔ بٹالہ کے قریب جانے تک زبردست بارش شروع ہوگئی جو رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ مریض کو دیکھنے کے بعد جب آپ نے واپس جانے کا اظہار کیا تو وہ ہندو کہنے لگا کہ مولانا حکیم صاحب راستہ میں بے حد کیچڑ ہوگئی ہے اور اب کوئی ٹانگہ ملے گا نہیں اس لئے آپ یہیں رات گزار لیں۔ آپ کے آرام کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہم اپنے مرشد سے وعدہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ آپ پیدل ہی چل پڑے۔ ذرا دور پر ہی آپ کے پاؤں ایک دلدل میں پھنس گئے۔ آپ نے جوتیاں اتاریں اور ہاتھ میں پکڑ لیں اور پیدل ہی چل پڑے۔ راستے میں پتھروں، گڑھوں اور کانٹوں سے الجھتے ہوئے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔ لیکن آپ رکے نہیں اور صبح فجر کے وقت گھر پہونچ کر اور نہا دھو کر نماز کے لئے مسجد مبارک میں حاضر ہو گئے۔ ایک عیسائی سے مناظرہ ہوا تو آپ نے کہا کہ ہمارا جو عقیدہ ہے ہم روزانہ پانچ بار اونچی جگہ کھڑے ہو کر اُس کا اعلان کرتے ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور وہ ایک ہے۔ اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ کیا تم بھی اسی طرح اعلان کرتے ہو کہ اللہ ایک نہیں تین ہیں، وہ عیسائی خاموش ہو گیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سب سے پہلے بیعت کی اور آپ کے بعد پہلے خلیفہ بنے۔

۲۵/اکتوبر/۱۹۹۶ء

(32)

سات آسمان اور سات زمین سے کیا مراد ہے؟

عربی زبان میں اَلسّمآء کا لفظ آسمان کے لئے اصطلاحی لفظ نہیں ہے بلکہ ہر اُس منظر کے لئے بولا جاتا ہے جو اونچا دِکھائی دے۔ قرآنِ مجید میں سماء کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے، جیسے اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ اور اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً میں بادل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ میں فضائے بسیط کے معنوں میں۔ بحث طلب امر یہ ہے کہ اگر سماء سے مراد فضائے بسیط یا فضائے بلند ہے تو پھر سبع سماوات کے کیا معنی ہوئے؟ واضح ہو کہ سبع، سبعین، سبع مائۃ کے الفاظ عربی میں جہاں اپنے اصلی معنوں میں یعنی سات (۷)، ستر (۷۰) اور سات سو (۷۰۰) کے لئے استعمال ہوتے ہیں، وہیں مبالغہ کے لئے اور کثرت کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

سورۃ برأت میں ارشادِ باری ہے۔ وَاِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ یعنی "تم اُن کے لئے ستر (۷۰) مرتبہ بھی مغفرت کے طلبگار ہو گے تب بھی اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔" یہاں ستر کا عدد مبالغے کے طور پر اور کثرت اور بے حساب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ تم ستر کے بجائے اکہتر مرتبہ مغفرت طلب کرو گے تو قبول کر لی جائے گی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم کتنا ہی اُن کے لئے استغفار کرو، قبول نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ سورۃ طلاق میں سات آسمانوں اور سات زمینوں کا جو ذکر ہے، اُس سے مراد بہت سے آسمان اور بہت سی زمینیں ہیں۔ اب تحقیق طلب امر لفظ سمٰوٰت اور ارض رہ

جاتا ہے۔یعنی سماوات اورارض کے کیا معنی ہیں۔سماء کا لفظ اگر بادل اور بلندی کے لئے استعمال ہوا ہے تو دوسری جگہ مدار کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔مداراُس خط کو کہتے ہیں جس پر کوئی سیارہ گردش کرتا ہے۔ انگریزی میں اس کو ORBIT کہتے ہیں۔قرآنِ مجید سورۃ مؤمنون آیت سولہ(١٦) میں فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ یعنی ہم نے تمہارے اوپر فضاء میں بہت سے یا بےشمار راستے یا مدار بنائے ہیں۔جن پر ستارے گردش کرتے ہیں۔یعنی طرائق کے معنی ہوئے ''وہ فضاء جس میں سیاروں کے مدار واقع ہوئے ہیں۔''

سورۃ الذّاریات میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔حبک جمع ہے حبیکہ کی اور حبیکہ راستے کو کہتے ہیں۔لہٰذا یہاں سماء کے معنے ہوئے وہ فضاء جس میں سیاروں کے راستے یا مدار واقع ہوئے ہیں۔سورۃ طلاق میں ارشاد ہوتا ہے۔اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ○(طلاق:١٣)یعنی اللہ وہ ہے جس نے پیدا کئے سات آسمان اوراُتنی ہی زمینیں بھی۔اللہ کا حکم ان میں نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان سکو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

سماء کے معنے جہاں بلند منظر کے ہوتے ہیں، وہاں کواکب اور سیارگان بھی اُس میں شامل ہیں۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بےشمار آسمان پیدا کئے ہیں، وہیں اُن کے حساب سے اتنی ہی زمینیں بھی پیدا کی ہیں۔بےشمار آسمان تو سمجھ میں آ گئے ہیں،لیکن بےشمار زمینوں کا کیا مطلب ہے؟ امام راغب نے اِس کا فیصلہ اِس طرح کیا ہے کہ ہر سیارہ اپنے زیریں سیارے کے لئے بمنزلہ آسمان کے ہے تو ہر زیریں سیارہ اپنے سے اوپر والے سیارے

کے لئے زمین کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ جس قدر سیارے یا آسمان موجود ہیں اتنی ہی زمینیں بھی اُن کے تحت سیاروں کی شکل میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ جس قدر ہم نے افلاک پیدا کئے ہیں اتنی ہی زمینیں بھی پیدا کیں، حقیقت کے عین مطابق ہے۔

15-1-2001

(33)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک

ہمارے پیارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام نبیوں سے بڑھ کر اخلاق دکھائے اور سکھائے آپ نے ماں باپ کو حکم دیا کہ اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ یعنی اپنی اولاد کی عزت کرو۔ اولاد چھوٹی ہوتی ہے اور ماں باپ بڑے۔ لیکن بڑوں کو یہ حکم دے کر کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کی عزت کریں۔ چھوٹوں کو سکھایا کہ تم چھوٹے ہو کر ہزار درجہ زیادہ بڑوں کی عزت اور احترام کا خیال رکھو۔ بچوں کے ساتھ آپ کو بہت محبت تھی۔ آپ کہیں باہر سے اونٹ پر سوار آ رہے ہوتے تو راستے میں بچوں کو دیکھتے ہی اُنھیں بھی اونٹ پر سوار کرا لیتے۔ چھوٹا بچہ ہوتا تو اُسے آگے بٹھا لیتے اور بڑا ہوتا تو پیچھے۔ چھوٹے بچوں کی دوڑیں کراتے اور اول آنے والے کو انعام دیتے، آپ لیٹے ہوتے بچے دوڑ کر آتے اور آپ پر گر جاتے۔ کوئی پیٹ پر گرتا، کوئی سینے پر، آپ بے حد مسرت محسوس فرماتے، دونوں نواسے حسن اور حسین چھوٹے چھوٹے تھے، آپ نماز پڑھ رہے ہوتے تو بچے آپ کی ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر جاتے۔ روکنے والے روکتے تو نماز سے فارغ ہونے پر آپ اُنھیں منع فرماتے کہ بچوں کو کچھ نہ کہو۔ اُن کے کھیلنے سے میری نماز میں خلل نہیں پڑتا ہے۔ حضرت انسؓ بچے تھے کہ اُن کی والدہ نے اُنھیں آپ کی خدمت کے لئے آپ کے ہاں چھوڑ دیا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ مَیں دس سال حضور کی خدمت میں رہا۔ نہ کبھی

ڈانٹا نہ مارا اور نہ کبھی یہ پوچھا کہ تم نے وہ کام ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ انسؓ کے ایک چھوٹے بھائی عُمیرؓ تھے۔ انھوں نے ایک ممولہ پالا ہوا تھا۔ وہ مرگیا۔ حضور باہر سے تشریف لائے۔ معلوم ہوا تو عمیر کو آواز دی اے عمیر! تمہارا ممولہ کہاں گیا۔ کبھی مذاق میں انسؓ کو کہتے یَا ذَاالْاُذُنَیْنِ۔ یعنی اے دو کانوں والے۔ ایک حدیث میں آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر شخص اپنی رعیت یعنی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یعنی ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے اپنے بچوں، غلاموں وغیرہ کی تربیت کس ڈھنگ سے کی ہے۔ آپ پہلے رسول اور نبی ہیں جس نے ماں باپ کے ترکہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کا خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کا حصہ رکھا۔ عربوں میں چھوٹی ننھی ننھی بچیوں کو زندہ دفن کردینے کی جو رسم تھی اُسے ختم کیا اور فرمایا کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد و بارك وسلم انك حميد مجيد

❁❁❁

۲۵/اکتوبر/۱۹۹۶ء

(34)

اطاعتِ والدین

صاحبِ صدر و معزز سامعینِ جلسہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مَیں آپ کے سامنے والدین کی اطاعت کے تعلق سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے کہ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً یعنی اے لوگو تم اپنے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اُن کی ہر طرح سے اطاعت کیا کرو۔ چونکہ والدین کی اطاعت سے انسان کیلئے دنیا میں بہت بڑی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے اور ایک مقام پر فرمایا ہے کہ وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ۔ (بنی اسرائیل: ۲۴) اے انسانو تم اپنے والدین کی ایسی اطاعت اور فرمانبرداری کرو کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی تم اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو۔ بلکہ اُن کو اپنی زبان سے اُف تک نہ کرو۔ اور ہمیشہ والدین سے نرمی اور پیار محبت اور خیرخواہی سے پیش آیا کرو۔ اور کبھی بھی اپنے والدین کو ناراض نہ کرو۔ چونکہ والدین کو ناراض کرنے سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتا ہے۔ جس شخص سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو۔ وہ ہلاکت تک پہونچ جاتا ہے ایسا شخص دنیا میں بدنام و رسوا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے کہ وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً۔ (بنی اسرائیل: ۲۴) یعنی اور کہو دونوں کو یعنی والدین کو نہایت ہی کریمانہ طور پر۔ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا لفظ تمہارے منہ سے نہ نکلے جو تمہارے والدین کیلئے تکلیف دہ ثابت ہو۔ ہرگز والدین کے ساتھ سختی سے پیش نہ آیا کرو۔

حدیث میں آتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ

اُمَّهَاتِكُمْ ۔یعنی جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کروگے اوراُن کی باتوں پرعمل کروگے تو اللہ تعالیٰ تم کو جنت نصیب کرے گا۔

بچو یادرکھو۔ہمارے والدین ہمارے دکھ اور سُکھ ،اور ہر درد و بیماری کیلئے رات دن ہمارے لئے تکلیف اُٹھاتے رہتے ہیں۔راتوں کواُن کیلئے نیند حرام ہوجاتی ہے۔اور ہمارے لئے ہر قسم کی دکھ وتکلیف برداشت کرکے ہم کو آرام اورسکون وچین فراہم کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے کھانے۔کپڑے اور تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ہم کو ہر طرح سے آرام وسکون پہونچاتے ہیں۔ہماری ذرا ذراسی خواہش پوری کرتے ہیں۔اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم بچے اپنے والدین کی ہر طرح سے اطاعت وفرمانبرداری اور اطاعت گذاری سے اُن سے سلوک کریں۔

والدین کی اطاعت گذاری وفرمانبرداری میں ہی ہماری دنیا کی اور دین کی کامیابی ہے۔اوراس سے ہم دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب بچوں کو اپنے والدین سے حُسنِ سلوک اورمحبت و پیار سے اطاعت گذاراورفرمانبرداری سے اپنی زندگی گذارنے کی توفیق عطافرمائے۔آمین

(35)

تبلیغِ اسلام اور خواتین کی ذمہ داریاں

اِسلام نے دیگر تمام مذاہب کے بالمقابل عورت کو مردوں کے برابر کا درجہ دیا اور دنیا کے ساتھ دین کے معاملے میں بھی اُنھیں مردوں کے برابر حقوق دئے۔ عورتیں اپنے دائرے اور حدود میں رہ کر تبلیغ کے عظیم الشان کام انجام دیتی رہی ہیں۔ اور احمدی عورتوں نے بھی اِس خصوص میں بے حد نمایاں کام کئے ہیں۔ دین کا سیکھنا اور اپنی روزمرہ زندگی میں اُس کو برتنا جیسا مردوں کیلئے آسان ہے ویسا ہی عورتوں کے لئے بھی آسان ہی ہے۔ تبلیغ کے کام میں ہمیشہ سب سے مؤثر ذریعہ اپنا کردار، سلوک اور اخلاق ہوا کرتا ہے۔ یعنی خواتین اپنے آپ کو سچے اسلامی نمونہ کے مطابق ڈھالیں اور اُن کا اُٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا سب کچھ اسلام کے عین مطابق ہو۔ حضرت اماں جانؓ اور حضرت اماں جیؓ جو کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول کی زوجہ تھیں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ آج احمدی خواتین دنیا میں مردوں کے دوش بدوش اللہ کی محبت سے سرشار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے مخمور اپنے امام کی ہدایت پر تبلیغ کے وہ سارے حربے آزمائے ہوئے ہیں جو اسلام کو زندہ کرنے اور انسانوں کو اپنے حقیقی رب سے ملانے کیلئے ضروری ہیں۔ سب سے بڑی ذمہ داری عورت کی یہ ہے کہ وہ اپنی نسل کو اسلام کے تمام اخلاقی ہتھیاروں سے لیس کریں اور اپنی بچیوں اور بچوں دونوں کو اللہ اور اُس کے رسول سے محبت کرنے والے اور اللہ اور اُس کے رسول کیلئے بے حد غیرت مند بنائیں۔ بچوں کو اعتماد دیں۔ اُنھیں سکھائیں کہ وہ ہر بات پر اور ہر حکم پر ہاں کہنے والے بن جائیں۔ اُنھیں جتائیں

کہ مائیں اُن سے بے حد محبت کرنے والی اور اُن پر اعتماد کرنے والی ہیں۔ جھوٹ سے اور بُری صحبت سے اُنھیں بچائیں۔ اس کیلئے اللہ کے حضور گڑگڑائیں اور تمام قوتوں اور تبدیلیوں کے حصول کیلئے اللہ ہی سے مدد مانگیں۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اسلام کے غلبہ کا اصل مسلمان عورتوں اور مردوں دونوں کے کرداروں میں پاکیزگی اور حوصلوں کی بلندی میں چھپا ہوا تھا۔ آج بھی کردار کی بلندی اور عمل کی پاکیزگی، انسانیت سے محبت اور انسانیت کی بلندی کیلئے قربانی کی روح ہی صحیح تبلیغ کا حق ادا کرسکتی ہے۔ خواتین کی ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گھروں کو جنت کا نمونہ بنائیں۔ اپنے شوہروں کے ساتھ محبت، خدمت، امانت داری و دیانت داری کا اُن کا رویہ بے ریا اور بے غرضانہ ہو۔ اللہ اور رسول کے نام کیلئے اور اپنے مسیح موعود اور اُن کے خلفاء کی خاطر قربانی کیلئے اُن کے سینے فراخ ہوں اور دلوں سے تمام کدورتیں، بغض و عناد، تعصب و تکبر اور حرص و طمع کے تمام گندے مواد خارج کئے جا چکے ہوں۔ نہایت عاجزی والی اور بنی نوع انسان سے بلا لحاظ مذہب و ملت محض انسانی ہمدردی میں بے حد خلوص اور محبت کا اظہار کرنے والی ہوں۔ علم کی اہمیت کو سمجھنے والی بنیں اور اپنا مشن بنالیں کہ وہ جہالت اور بے علمی کے خلاف ہمیشہ جہاد کرنے والی ہوں۔ خود بھی علم سیکھیں اور اولاد کو علم کے زیور سے خوبصورتی عطا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہو۔ اور ہمارے کاموں میں مددگار رہے۔ آمین۔ (۲۵/اکتوبر/۱۹۹۹ء)

۞ ۞ ۞

(36)

وقت کی پابندی

وقت کی پابندی اِسلامی اخلاق میں سے ایک خلق ہے۔ جولوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، وقت بھی اُن کی قدر نہیں کرتا اور اُنھیں بُھلا دیتا ہے۔ انسان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا اور امانت ہے۔ وقت اِسی زندگی کا ایک حصہ ہے، جس قدر وقت بیکار ضائع ہوگا اُسی قدر زندگی کم ہوتی جائے گی اور جب احساس ہوگا کہ ہم نے بہت وقت کھودیا ہے یا بہت عمر یونہی گنوادی ہے اور اب فلاں اچھا کام کرنا چاہیئے تو وقت تھوڑا رہ جائے گا۔ اور کام بہت طویل اور تھکا دینے والا معلوم ہوگا۔ ہم کسی دعوت میں یا کسی کانفرنس میں جاتے ہیں اور وقت کی پابندی نہیں کرتے تو نہ صرف یہ کہ اپنی قدر کھودیتے ہیں بلکہ دوسرے مہمانوں کو بھی پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ لوگ زبان سے نہ کہیں لیکن وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ دیر سے آنے والوں کے انتظار میں بعض دفعہ کام رُک جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں شادیوں کے موقعہ پر دُلہا کا دیر سے آنا ایک معمولی بات ہے۔ لیکن غور فرمایئے کہ میزبان کو اُس کی وجہ سے کتنی تکلیف اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ آیا ہوا قاضی دُلہا کی تاخیر کی وجہ سے دوسری شادی میں شرکت کیلئے روانہ ہوجاتا ہے۔ اور میزبان کو دُلہا کے آنے کے بعد دوبارہ قاضی صاحب کیلئے آدمی دوڑانا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ جو اپنی تجارتی یا اور پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث وقتِ مقررہ پر آجاتے ہیں، میزبان کو طعنہ دے کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ اگر کھانے کی دعوت ہو تو دُلہا کی وقت کی پابندی نہ کرنے

کی وجہ سے سارے مہمانوں کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وقت کی پابندی کا خیال نہ رکھنے والے کبھی کامیاب انسان نہیں بن سکتے۔ لوگوں کے دلوں میں اُن کیلئے زیادہ عزت کا جذبہ نہیں رہتا اور سمجھدار لوگ آئندہ تقریبات میں ایسے لوگوں کو دعوت دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔

ویسے بھی وقت کی پابندی نہ کرکے میزبان کو پریشانی اور کوفت میں مُبتلا کرنا کسی بھی شریف آدمی کو زیب نہیں دیتا۔ وقت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا اور گزرتا رہتا ہے۔ سمجھدار شخص وہ ہے جو وقت کی قدر جانتا ہے اور اُسے گرفت میں رکھ کر اپنے کام پورے کر لیتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والا پھر وقت کو نہیں پکڑ سکتا۔ وقت کی پابندی نہ کرنے والے ہمیشہ دوسروں کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۲۴ر اکتوبر ر ۱۹۹۶ء

(37)

سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا کی عظیم شخصیتیں ہمیشہ ہی دوسروں سے مختلف ایک الگ زاویے اور الگ الگ ڈھنگ رکھتی ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام اپنی شان میں دوسروں سے مختلف ہونے کے علاوہ اخلاق وکردار میں اور انسانیت سے محبت اور انسانیت کے شرف کو اونچا کرنے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سیرۃ کی مجالس اور تقاریر کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ حضور کے کردار و اخلاق کی مشعلِ راہ ایک بار پھر نور پاش ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی انسانیت کی محبت میں قربانیاں ہی دیں۔ کامیاب تجارت چھوڑی، جو کچھ سرمایہ تجارت کے ذریعہ کمایا تھا اسلام کے مشن پر نچھاور کر دیا۔ کامیابی کا دور جب آیا تو دولت کے ڈھیروں ڈھیر اپنے ہاتھ سے تقسیم کئے، لیکن گھر کی حالت غریبانہ ہی رکھی، جب وفات پائی تو گھر والوں کے لئے، خاندان کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ نہ جائداد بنائی، کوئی مابہ الامتیاز حقوق اپنے گھر والوں کے قائم کئے نہ کوئی موروثی گدی چھوڑی، نہ دربان اور نہ خادم بھرتی کئے، نہ سواریاں جمع کیں اور نہ گھر کی آرائش پر فضول خرچ کیا۔

سیاسی لحاظ سے اپنے لئے کوئی نمایاں اور ترجیحی حقوق نہیں حاصل کئے۔ کسی کے خلاف خدا کے احکام سے بڑھ کر کچھ نہیں کیا۔ اپنا مقام اونچا کرنے کیلئے من مانا قانون نہیں بنایا۔ مدینہ میں یہود اور منافقوں کی شرارتوں کی وجہ سے ایمرجنسی کی کیفیت موجود رہی لیکن کبھی کسی کو نظر بند نہیں کیا۔ لوگوں کی ذاتی آزادی پر پہرے نہیں بٹھائے، ہنگامی عدالتیں نہیں قائم کیں،

تازیانوں اور کوڑوں سے کسی کی چمڑی نہیں اُدھیڑی، بلکہ الٹا لوگوں کو تنفیذ اور رائے زنی کا حق دیا۔ یہ تمام حقوق صرف کاغذ کی زینت نہیں رہے بلکہ عوام نے عملاً انھیں استعمال کیا۔ کئی بار اپنی قیمتی رائے ترک کر کے اختلاف رائے کو قبول فرمایا۔ کسی کو اگر رعایت دینی چاہی تو جماعت سے وضاحت لی۔

ابوالعاص قیدی بن کر آئے تو اُن کے فدیہ کے طور پر حضرت زینب نے وہ ہار بھجوایا جو حضرت خدیجہؓ کی نشانی تھا۔ اُسے واپس کرنا چاہا تو پبلک میں اپیل کی، اُن کا مالِ غنیمت بھی جماعت کی اجازت سے واپس کیا۔ جنگِ حنین کے قیدیوں نے رضاعی قرابت کے حوالے سے رہائی کی درخواست کی تو بنو ہاشم کے حصے کے قیدیوں کو تو خود چھوڑ دیا لیکن دوسرے قیدیوں کے لئے کہا کہ مجمع عام میں مسلمانوں سے درخواست کرو۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ اِن لوگوں کے ساتھ حضور کا رضاعی رشتہ ہے۔ اور حضور نے اپنے حصے کے قیدی چھوڑ دئے ہیں تو سب نے بھی اپنے اپنے قیدی چھوڑ دئے۔

مجلسی اور سماجی اعتبار سے ہمیشہ مساوات پسند کی۔ امتیاز پسند نہیں کیا۔ اونچی جگہ نہیں بیٹھے۔ یہ بھی پسند نہیں کیا کہ لوگ تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔ جنگ میں، مسجدوں کی تعمیر میں، خندق کی کھدوائی میں، مٹی ڈھونے، پتھر اور گارا اُٹھانے کا کام خود بھی کیا۔ قرض خواہوں کو اپنے تقاضے کا اِذن دیا اور بھری مجلس میں اپنے آپ کو پیش کیا کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو متعلقہ شخص اُس کا انتقام یا بدلہ لے سکتا ہے۔

حضور کی زندگی کسی جوہڑ یا کنویں کی مانند نہیں کہ اُس کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر پورا نظارہ کر لیا جائے۔ آپ کی زندگی ایک مواج دریا اور مسلسل بہتے رہنے سے معنون ہے۔ اس میں انقلاب ہیں، روانی ہے، حباب ہیں، موتی ہیں، ساتھ دینے کے لئے اُس کے ساتھ

ساتھ بہنا ضروری ہے۔ یہ وہ پانی ہے جس سے مردہ ٹہنیاں ہمیشہ سیراب ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

گفتگو اور تکلم، انسان کے حسن و قبح کا مظہر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے کہ کوئی یاد کرنا چاہے تو یاد کرلے۔ لہجہ کا اتار چڑھاؤ، لفظوں کا انتخاب، مفہوم کی معنی آفرینی آپ کے کلام کا جز ہوتے۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کے ستھرے اور پاک موضوعات پر گفتگو فرماتے، فِراح کا رنگ بھی کبھی جھلکتا اور سنجیدگی بھی نمایاں رہتی، لیکن فرماتے تھے کہ میری زبان سے کبھی غیر حق یا جھوٹ کوئی بات نہیں نکلتی، مصلحتاً بھی جھوٹ سے پرہیز رہتا اور کیوں نہ ہو جھوٹ کو اُمّ الخبائث یعنی برائیوں کی جڑ کہا گیا ہے۔ ام معبد نے کیا خوب تعریف کی کہ گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی یعنی مربوط، الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ، نہ کوتاہ سخن اور نہ طویل گو، تفہیم اور تاکید کے لئے اور آسانی حفظ کے موقعہ پر خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے، مکروہ، فحش اور حیا سے عاری موضوعات یا کلمات سے نفرت تھی، گفتگو کے دوران ہلکی مسکراہٹ نمایاں رہتی تھی۔

(38)

خطبہ حجۃ الوداع

خطبہ عرفات ۹/ذی الحجہ:۔ اللہ عزوجل کی حمد وثناء کے بعد ارشاد فرمایا۔

اے لوگو! مَیں جو کچھ کہوں اُسے بگوشِ ہوش سنو۔ شائد آئندہ سال اور اُس کے بعد پھر کبھی میری تمہاری ملاقات نہ ہوسکے۔

اے لوگو! تم پر ایک دوسرے کا جان ومال اُس دن تک حرام ہے جب تم اپنے پروردگار سے ملاقات کرو۔ جس طرح اِس مہینہ میں تم ایک دوسرے کی بے حُرمتی کرنا حرام سمجھتے ہو۔

تم میں سے جس کسی کے پاس دوسرے کی امانت ہو، وہ اُسے لوٹادے۔

آج سے ہر قسم کا سود ختم کیا جاتا ہے۔ اپنی قرض دی ہوئی اصل رقم کے اوپر تم کچھ نہیں لے سکتے۔ اگر ایک دوسرے پر ظلم نہ کروگے تو قیامت کے دن تم پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سود لینے اور دینے کو منع فرمادیا ہے۔ عباس کا سود جو دوسروں پر واجب الادا ہے، اُسے ختم کیا جاتا ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں قتل کئے جانے والوں کا قصاص اور دیت دونوں کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے مَیں ہی بنوہاشم کے بیٹے ابن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کے فرزند کا بدلہ اور دیت معاف کرتا ہوں۔

غور سے سنئے کہ اب عرب میں شیطان کی پرستش نہ کی جائے گی۔ لیکن اُس کو پوجنے

کے بجائے اگر شیطان کی صرف اتباع واطاعت ہی کی گئی، تب بھی وہ بہت خوش ہوگا۔ اِس لئے دینی امور میں شیطانی وساوس کو اپنے قریب نہ آنے دو۔ مذہب میں خارجی رُسوم کا دخل منع ہے۔

اے لوگو! ادب والے مہینوں کا دوسرے مہینوں سے ادل بدل کرلینا کفر ہے۔ جس میں مؤمن آلودہ نہیں ہوسکتا مگر کافر کا اِس سے بچنا محال ہے، جو اِس سال اِن چار مہینوں میں ایک مہینہ آئندہ سال کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور آنے والے سال میں اُسے بدستور اپنے محل پر رکھتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے حرام کردہ امور کو حلال کرلینا اور حلال شدہ امور کو حرام کرلینا ہے۔

اور دیکھو! جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں زمین وآسمان کو پیدا کیا تھا، زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اُسی نقطہ پر آ گیا ہے۔ چار ادب والے مہینے ہیں۔ یعنی تین متواتر ہیں، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم اور ایک مفرد ہے یعنی رجب کہ جمادی الآخر اور شعبان کا درمیانی مہینہ ہے۔

اِس کے بعد اے لوگو! بیوی اور خاوند دونوں ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اُن میں سے ایک بات یہ ہے کہ کسی عورت کے لئے غیر مرد کو اپنے قریب کرنے کا حق نہیں ہے، خاوند کے تن بدن میں آگ لگ جائے گی، اگر بیویاں فحش کا ارتکاب کر بیٹھیں اور عورتوں کو چاہئے کہ وہ بے حیائی سے بالکل بچ کر رہیں۔ اگر اُن سے یہ قصور ہوجائے تو اُن کے شوہر اُن کو بدنی سزا دے سکتے ہیں، مگر وہ سزا ضربِ شدید کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ (یہاں فاحشہ اور بے حیائی سے مراد وہ عام معاشرتی برائیاں ہیں جن سے مرد اپنے ملنے جلنے والوں میں یا پڑوسیوں میں بدنام ہوتا یا سُبکی محسوس کرتا ہے۔ یہاں زنا ہرگز مراد نہیں ہے، کیونکہ اُس کی سزا قرآنِ مجید نے بالکل علیحدہ تجویز کی ہے) پھر فرمایا۔ اگر وہ باز آجائیں اور تمہاری اطاعت میں چلیں تو

قاعدے کے مطابق اُن کا نان ونفقہ تمہارے ذمہ ہے، یقیناً خواتین تمہارے زیرِ نگیں ہیں جو اپنے لئے بطور خود کچھ نہیں کرسکتیں۔تم نے اُن کو اللہ کی امانت کے طور پر اپنی رفاقت میں لیا ہے اور اُن کے جسموں کو اللہ ہی کے قانون کے تحت تصرف میں لیا ہے۔سو خواتین کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور بہتر رنگ میں اُن کی تربیت کرو۔آگاہ رہو کہ مَیں نے بات پہنچادی ہے۔ اے اللہ آپ بھی گواہ رہئے۔

اے لوگو! مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں کسی شخص کے لئے اُس کے بھائی کا مال لینا، اُس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے۔

آگاہ رہو کہ مَیں نے بات پہنچادی۔اے اللہ آپ بھی گواہ رہیو۔

سو میرے بعد کہیں پھر کافرانہ ڈھنگ اختیار کر کے ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا۔ مَیں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جارہا ہوں کہ جب تک اُس پر کاربند رہوگے کبھی راہِ راست سے نہ ہٹوگے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!! آگاہ رہو کہ مَیں نے بات پہنچادی۔اے اللہ آپ بھی گواہ رہیو!

اور تم لوگوں سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو اب تم بتاؤ کہ کیا کہوگے؟

لوگوں نے پکار کر کہا ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پیغام پہنچادیا۔امت کو نصیحت کرنے کا حق ادا کردیا۔حقیقت سے سارے پردے اٹھادیئے اور امانتِ الٰہی کو ہم تک کما حقہ پہونچادیا۔ اے اللہ! آپ گواہ رہئے ۔اے اللہ! آپ گواہ رہئے ۔اے اللہ! آپ گواہ رہئے۔

جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچادیں۔ممکن ہے کہ بعض سامعین کے مقابلے بعض غیر حاضر لوگ اِن باتوں کو زیادہ اچھی طرح یادرکھیں اور اُن کی

حفاظت کریں۔

اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے میراث میں سے ہر وارث کے لئے ثابت کردہ حصہ مقرر کیا ہے۔اور ایک تہائی مال سے زائد کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔

بچہ اُسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا ہو۔اور بدکار کے لئے پتھر ہے۔

جس نے اپنے باپ کے بجائے کسی دوسرے کو باپ قرار دیا۔ یا جس غلام نے اپنے آقا کے سوا کسی اور کو آقا ظاہر کیا تو ایسے شخص پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی طرف سے لعنت ہے۔اُس سے قیامت کے دن کوئی بدلہ یا عوض قبول نہ ہوگا۔

تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہو اور اُس کی رحمتیں نازل ہوں۔

خطبہء منیٰ ۱۰/ذی الحجہ:۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے اور نہ تمہارے بعد کوئی اور امت برپا کی جانے والی ہے۔پس غور سے سنو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو۔نماز پنجگانہ قائم کرتے رہو۔رمضان کے روزے رکھا کرو اور اموال کی زکوٰۃ دلی رغبت سے ادا کیا کرو۔اپنے رب کے حرم پاک کا حج ادا کرتے رہو اور اپنے اُمراء وحُکام کی اطاعت پر کاربند رہو تاکہ اپنے رب کی جنت میں جگہ پاسکو۔

خطبہء حجۃ الوداع دو ہیں۔ پہلا خطبہ آپ نے عرفات کی پہاڑی سے ۹/ذی الحجہ (یعنی حج کے دن) دیا،اور دوسرا خطبہ ۱۰/ذی الحجہ کو یعنی عید کے دن منیٰ کے میدان میں ارشاد فرمایا۔خطبہ کے دوران ہادیء اکمل صلی اللہ علیہ وسلم ہر جملہ کے بعد لمحہ بھر کے لئے خاموش

ہو جاتے اور حضرت ربیعہ بن اُمیہؓ رضی اللہ عنہ، بلند آواز سے آپ کے ارشاد کو دوسروں تک پہنچاتے۔ یہ خطبات مطہرہ ایک چارٹر اور ایک منشور ہیں۔ جسے ہم تمدنِ اسلام کی عمارت کا بنیادی پتھر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کی تمام تعلیمات خلاصۃً اس میں آ گئی ہیں اور یہ ارشادات اُس وقت کے ہیں جبکہ دنیا خوابِ غفلت کے پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ انسانیت نے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا پورا اندازہ ابھی نہیں کیا تھا۔ آج بھی دنیا کی تمام اعلیٰ اور ارفع عقلیں بہبود انسانی کے لئے جو کچھ سوچ سکی ہیں اور فروغ انسانیت کے جو کام ہوئے اور ہو رہے ہیں، اُن کا متن اور اُن کی گہرائی و گیرائی اِن ارشاداتِ عالیہ سے نیچے اور کم تر ہی ہیں اور اُن میں بہت سی مصلحتیں جرأتِ رندانہ کو پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔ یو۔ این۔ او کے چارٹر کا اِس سے مقابلہ کر کے دیکھئے۔ آپ حجۃ الوداع کے کلماتِ منورہ کی افادیت اور عالی حوصلگی پر غور کر کے حیران اور ششدر رہ جائیں گے کہ کیا یہ ایک اُمی نبی کا کلام ہوسکتا ہے۔

❁❁❁

(39)

اجتہاد فی الدین

اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم مسئلہ جس کا حل ہمیں قرآن یا سنت یا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھ نہ آ سکے تو آپس کے مشورے، علمی استعداد اور عقل وشعور کی کسوٹی پر رکھ کر اُس کا حل تلاش کیا جائے اور وہ حل ایسا ہو کہ قرآن کی کسی نص کے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا عمل کے خلاف نہ جائے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ سعادت میں ایسے مسائل بارہا پیش ہوتے تھے کہ اُس وقت تک وحی الٰہی سے اُن کا حل دستیاب نہ ہوتا تھا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب فرماتے اور اپنی فراستِ خداداد سے اُس کا حل نکال لیتے لیکن کبھی یہ نہ کہتے یہی اصل اور حقیقت ہے یا یہ کہ یہی دین ہے بلکہ اُسے اپنی سوجھ بوجھ کا نتیجہ قرار دیتے۔ آگے چل کر وحی الٰہی کے ذریعہ اگر آپ کے فیصلہ کی تائید ہو جاتی تو اللہ کا شکر ادا کرتے اور اگر اللہ کا فیصلہ آپ کے فیصلہ کے خلاف ہوتا تو اپنی غلطی سے فوری رجوع فرمالیتے اور مسئلہ زیرِ بحث کی اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی روشنی میں اصلاح فرمادیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو ایسے مسائل پر سر کھپانے سے اور ایسی دقیق باتوں پر بحث ومباحثہ سے جن کا تعلق فلسفہ سے ہو یا ایسے مسائل ہوں جن کا فائدہ اور نقصان نامعلوم ہو، یا ایسی باتیں جو انسان کے دل میں خوامخواہ شبہ بن کر یا وہم بن کر اُبھرتی ہیں، روکا ہے۔

(ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ ''مَیں نے کسی کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتا ہو)

اجتہاد فقہ اور دین میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ایسا درپیش ہو جس کا حل کتاب اور سنت سے معلوم نہ ہو سکے تو بجائے اِس کے کہ اُس مسئلے کو لنگڑا چھوڑ کر شرع کو مُتّہم کیا جائے، اجتہاد کے ذریعہ اُس کا حل نکالنا چاہئے۔ حضرت عمرؓ بن عاص سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ دو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا ''اِن کے درمیان فیصلہ کرو'' مَیں نے عرض کی کہ یارسول اللہ آپ مجھ سے بہتر فیصلہ فرما سکتے ہیں۔ فرمایا ''تمہی کو یہ فیصلہ کروانا ہے'' مَیں نے پوچھا ''کس چیز پر فیصلہ کروں'' فرمایا ''اگر تم نے صحیح فیصلہ کیا تو دس نیکیوں کا اجر پاؤ گے۔ اور اگر اجتہاد کیا اور اُس میں تم سے غلطی ہوگئی تو ایک نیکی کا ثواب ملے گا''۔ یعنی پوری جستجو اور ایمانداری کے ساتھ اور مخلصانہ دلچسپی اور عدل کے ساتھ اجتہاد کیا جائے تو خواہ اس میں غلطی ہوگئی ہو، فیصلہ کرنے والا ثواب سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن بھجوایا کہ وہاں لوگوں کو دین سکھائیں تو اُن سے پوچھا کہ ''کس چیز کے مطابق فیصلہ کرو گے؟'' انھوں نے عرض کی کہ ''کتاب اللہ کے مطابق'' فرمایا اگر اُس میں نہ ملا تو کیا کرو گے؟'' جواب دیا کہ ''سنت رسول اللہؐ کے مطابق'' حضور نے فرمایا ''اگر اس میں بھی نہ ملا تو؟'' کہنے لگے ''پھر مَیں اجتہاد کروں گا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تائید کی اور فرمایا ''اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو وہ توفیق بخشی جسے اللہ اور اُس کا رسول دونوں پسند کرتے ہیں'' حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ''اگر کتاب وسنت میں کوئی چیز مل جائے تو اُس کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر اُن میں کوئی حکم نہ ملے تو اجتہاد کرو۔''

حضورؐ کے دورِ سعادت میں اجتہاد کا مقصد فقہ کے مختلف مذاہب قائم کرنا نہیں تھا اور نہ ہی بحث یا مشورہ ایسے مسائل کے مطابق ہوتے تھے جو محض مفروضات پر یا ایسے خیالات پر مشتمل ہوں جو دلوں میں گزرتے رہتے ہیں۔ اجتہاد صرف اُن معاملات تک محدود ہوتا تھا جو واقعی پیش آتے تھے اور فوری توجہ اور دوٹوک فیصلے کے محتاج ہوتے تھے۔ صحابہ رضوان اللہ علیھم اجمعین صرف ایسے سوالات پر ہی اکتفا کرتے تھے جو اُن کے لئے مفید ہوا کرتے تھے۔ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ پورے عہد رسالت میں انھوں نے صرف تیرہ سوال دریافت کئے اور وہ سب کے سب قرآنِ کریم سے متعلق تھے۔ حضرت عمر اس شخص پر لعنت کہتے تھے جو غیر واقعی اور لایعنی باتوں کے متعلق سوال کرتا تھا۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تقدیر کے مسئلہ پر بحث کرتے سنا تو امتناعی لہجے میں فرمایا ''تم سے پہلے جن لوگوں نے اِس مسئلہ میں غور کیا ہے وہ ہلاک ہو گئے ہیں''۔ اِسی لئے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ منقول نہیں کہ فلفسیانہ مسائل پر غور کرتے تھے اور نہ ہی فلسفیانہ مسائل پر کسی کا کوئی اجتہاد ہمارے سامنے ہے۔ جن بزرگوں نے زندگی کے واقعی مسائل پر اجتہاد سے کام لیا ہے انھوں نے کبھی بھی اپنے فیصلہ کو مبنی برحق یا واجب التسلیم کہہ کر پیش نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اُسے اپنا گمان کہہ کر پیش کیا۔ ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ سے استفسار بھی کرتے جاتے تھے۔ اکثر اُن کی منشاء یہ ہوتی تھی کہ فریقین میں صلح ہو جائے اور آپسی تنازعہ ختم ہو جائے۔ کسی ایک نے بھی اپنے اجتہاد کو ''دین'' کا درجہ دے کر یا واجب التعمیل کہہ کر پیش نہیں کیا۔

۱۸ر مئی ر ۱۹۹۶ء

(40)

تحریکِ جدید

تحریکِ جدید کا اِجراء ۱۹۳۴ء میں حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا۔ پہلے یہ تحریک تین سالوں کے لئے جاری ہوئی تھی۔ پھر سات سال اور بڑھا کر دس سالوں کے لئے اِسے وسیع کر دیا گیا تھا۔ جب دس سال پورے ہوئے تو حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مزید نو سال بڑھا کر اِس دفترِ اول کو انیس سالوں پر مُحیط کر دیا۔ پھر ۱۹۵۳ء نومبر میں دفتر دوّم کا اجراء ہوا اور ۱۹۷۲ء میں دفتر سوئم اور ۱۹۹۱ء میں دفتر چہارم جاری ہوئے۔ تحریکِ جدید کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان سے باہر ساری دنیا میں تبلیغی مشن کھولنا، مبلغین اور مربیوں کو بھجوانا، مساجد کی تعمیر، قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں تراجم، جو اَب تک ستّر زبانوں سے اوپر طبع ہو چکے ہیں اور دیگر تبلیغی لٹریچر کا شائع کرنا اور مخالفوں کی شرارتوں کا علمی رنگ میں جواب دینا وغیرہ بے شمار کام ہیں جو خوبصورت احسن طور پر انجام پا رہے ہیں۔ تحریکِ جدید کو حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود آپ کے الفاظ کے مطابق قربانیوں کا ایک تنور تیار کر کے اُس کے قریب تمام احمدیوں کو کھڑا کر دیا ہے تا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے جب چند لوگ اِس قربانی کی تنور میں کود یں تو دوسروں کے دلوں میں بھی قربانیوں کے جذبات ایسے اُمڈیں کہ وہ بے دریغ یکے بعد دیگرے اس تنور میں چھلانگ لگاتے چلے جائیں۔

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم جماعت کے لوگوں کو اجازت دیدیتے کہ گھروں میں آرام سے بیٹھے رہیں تو وہ گرمیوں میں کام کرنے پر بھی کبھی آمادہ

نہ ہوتے اور بزدلوں کی طرح پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاتے۔ مگر اب جبکہ افراد کو قربانیوں کے تنور کے قریب کھڑا کر دیا گیا ہے جب اُن سے مطالبہ ہو تو وہ بے دھڑک قربانیوں کی آگ میں چھلانگ لگا دیں تو اب جب بھی وقت آئے گا تو اُس وقت یہ سوال نہیں ہوگا کہ یہ مبلغ کب واپس آئیں گے۔ کیونکہ ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں کہ عیسائیوں نے جب تبلیغ شروع کی تو اُن کا جو بھی حواری یا مبلغ کسی علاقے میں گیا ہے تو پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں کو فلاں جگہ پھانسی دیدی گئی۔ فلاں کو فلاں جگہ قید کر دیا گیا۔ ہمارے دوست اِس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ حضرت صاحبزادہ عبد اللطیف صاحب شہید نے تمام احمدیت کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا، لیکن ایک عبد اللطیف ہمارے لئے کافی نہیں ہیں۔ سینکڑوں عبد اللطیف چاہئیں۔ اسی وقت احمدیت کا رعب اور دبدبہ قائم ہوگا۔ رعب کے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر شخص کو گھر سے نکال کر قربانیوں کے تنور کے پاس لا کھڑا کیا جائے تا کہ جب پہلی قربانی دینے والے کو لوگ دیکھیں تو خود بخود یکے بعد دیگرے قربانی کی اس آگ میں کودنا شروع کر دیں۔ پس اسی ماحول کو پیدا کرنے کے لئے مَیں نے تحریکِ جدید جاری کیا ہے۔

تحریکِ جدید معمولی ادارہ نہیں بلکہ اسلام کے اِحیاء کی زبردست تحریک ہے۔ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کی تفسیر ہے۔ ''مَیں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا'' والے الہام کی عملی تصویر ہے۔ اُس تحریک میں بچوں، جوانوں، عورتوں اور بوڑھوں سب کا حصہ ہے۔ خصوصاً نوجوانوں کو چاہئے کہ اس میں پہلوں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اِس وقت دنیا کی آبادی میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً ۵/۱ ہے۔ گویا کہ چودہ سو سالوں میں مسلمانوں کی جو عددی ترقی ہے وہ ۵/۱ تک پہونچی ہے اور باقی ۵/۴ دنیا کا غیر مسلم ہے۔ اور اُنھیں اسلام سے روشناس کرانے کے لئے اللہ کی اور اللہ کے رسول محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزوئیں میں

ہمارے ساتھ وابستہ ہیں۔ دنیا بھر کے ایک ارب مسلمانوں کے مقابلہ میں احمدیوں کی آبادی کا تناسب نکالا جائے تو بہت ہی تھوڑا ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ یہ اہم اور مشکل ترین کام عام مسلمانوں سے لے، بلکہ اُس کی نظر انتخاب ہم کمزوروں اور کم مایہ لوگوں پر پڑی۔ دنیا کے ایک ارب جو مسلمان ہیں، وہ احمدیت کے دشمن ہیں اور اُن سے کسی قسم کے تعاون اور اِمداد کی اُمید عَبث ہے۔ اب اندازہ لگایئے کہ یہ جو کام تبلیغ کا اور اسلام کے غلبہ کا ہم احمدیوں کے ذمہ لگایا ہے، کس قدر اہم، کتنا مشکل اور کس درجہ دشوار طلب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ کام ہمیں سونپا ہے تو یقیناً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہمارے ہی ذریعہ پورا بھی ہوگا لیکن محض اللہ کا فضل، اُس کی خاص تائید اور اُس کی نصرت ہی یہ سب کچھ کر دکھائے گی۔ ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں کہ ہماری معمولی کوششوں کے کس قدر عظیم نتائج رونما ہو رہے ہیں۔ ہماری معمولی کاوش، صرف اللہ کے فضل اور تائید سے ہمہ گیر اور اثر انگیز تحریک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہماری کوشش کے ایک ایک یونٹ پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے ہزار ہزار گنا اثر رکھتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا کام تو بس ایمان اور نیتوں کو سدھارنا ہے۔ قبولیت اُس احسان شناس خدا کا فعل ہے کہ جب وہ دینے پر آتا ہے تو معمولی نہیں دیتا اور ہماری سعی کو بھی معمولی نہیں رہنے دیتا بلکہ جس قدر عظیم اُس کی شان ہے اُسی قدر عظیم اور بلند اُس کی عطا ہے۔ پہلے مسلمانوں کی کوششوں کے جو نتائج چودہ سو سالوں میں نکلے، دیکھ لو وہ کس قدر معمولی اور تھوڑے نکلے۔ اب اللہ نے یہ کام اُن سے چھین کر ہمارے حوالے کر دیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اِس تحریک کو غیر معمولی برکتوں سے نوازے۔ دنیا کی آبادی کا چار ارب غیر مسلم جو حصہ ہے وہ کس قدر بڑا اور وسیع ہے، اور حالت یہ ہے کہ اسلام کی آواز اور تبلیغ اُن تک پہونچی ہی نہیں۔ پھر یورپ اور امریکہ نے کروڑوں صفحات پر مُشتمل جو لٹریچر اسلام اور رسولِ اسلام کے کردار

واخلاق کے خلاف شائع کر کے دنیا میں پھیلا یا ہے اگر اُس میں سے تھوڑا سا بھی آپ لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنا یا جائے تو یقینا بہتوں کی چیخیں نکل پڑیں گی۔ اِس مخالف اور جھوٹے لٹریچر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روشن اور حسین چہرے پر اُس قدر گرد وغبار اڑایا گیا ہے کہ اصل چہرہ بالکل چھپ گیا ہے یہاں تک کہ مغربی اقوام میں سے جو لوگ مسلمان ہوتے ہیں، انھیں یہ بات سمجھانے اور یقین دلانے میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ عیسیٰ علیہ السلام سے بلند وبالا ہے، بہت دن لگ جاتے ہیں اور بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔تحریکِ جدید کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزگی اور خوبصورتی کے عکس دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچائے جارہے ہیں اور اِس سعی وکاوش کے خوش کُن نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کام ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ دو ہزار سالہ مخالفانہ کوششوں کو کچلنے میں کچھ وقت لگے گا۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیوں کے مطابق یہ کام تین صدیوں میں مکمل ہوجائے گا۔ انشاء اللہ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم وہ قربانی کی مثال پیش کریں کہ آئندہ نسلیں یاد رکھیں۔

۲۳/۱۱/۱۹۹۶ء

(41)

تصویر اور اِسلام

تصویر کے بارہ میں مسلمانوں میں غلط خیالات رائج ہو گئے ہیں۔ یہ تصویر جو کیمرے کے ذریعہ اُتاری جاتی ہے اور حقیقی شبیہ اور صحیح عکس اپنے اصل کا ہوتی ہے کسی طرح بھی حرام قرار نہیں دی جاسکتی۔ تصویر آج کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے اور اُس کے بغیر دنیا کے بہت سے کام ٹھپ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تصویر کے بغیر نہ تو طُلّاب امتحانات اور انٹرویوز میں شرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی پنشنرز احباب اپنے وظائف حاصل کر سکتے ہیں۔ تصویر کے بغیر پاسپورٹ کا بننا اور ممالکِ مختلفہ کا سفر کرنا ممکن نہیں، یہاں تک کہ تصویر کے بغیر حج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر ملک میں سکّوں اور کرنسی نوٹوں پر تصاویر اُتاری جاتی ہیں۔ کیا اِس خیال سے ہم اُن کا استعمال ترک کر دیں کہ اُن پر تصویریں کندہ ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جیب میں سکّے اور کرنسی نوٹ رکھ کر نمازوں کا پڑھنا بھی ناجائز قرار دیا جائے؟

آئینہ دیکھنا بھی حرام قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اُس میں بھی آدمی کی صحیح تصویر اور عکس کھنچ آتا ہے۔ اور اصل میں آئینہ کے عکس کا کاغذ کی تصویر میں کوئی فرق نہیں سوائے اِس کے کہ آئینہ میں وہ عکس اُس وقت تک قائم ہے جب تک کہ ہم اُس کے سامنے ہیں۔ اور تصویر میں وہی عکس ایک خاص ترکیب سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔

اِسلام کی تعلیمات قیامت تک ممتد ہیں اور آنے والے تمام زمانوں اور اُن کی

ضروریات کا اُن میں خیال رکھا گیا ہے۔خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا میں حضرت عائشہؓ کی تصویر ایک سبز کپڑے پر دکھائی گئی اور کہا گیا کہ اب یہ تیری بیوی ہے، دنیا وآخرت میں۔ اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت یعنی آنکھ میں ہر مقابل شئے کا عکس اور تصویر اُتر آتی ہے۔ظاہر ہے ہم اِس خیال سے کہ تصویر حرام ہے، اپنی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتے ۔لبِ جُو کھڑے ہو کر ہم اپنا عکس پانی میں دیکھتے ہیں۔کیا اِسے بھی حرام قرار دیا جا سکتا ہے؟

خود قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام مُصور بتایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیمرے والی تصویر کا رواج نہیں تھا اور تصویریں ہاتھ سے اُتاری جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ہاتھ سے اُتاری ہوئی تصویر نقل در نقل کے مراحل سے گزر کر کچھ کی کچھ بن جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ چیز تھی کہ گزرے ہوئے زمانوں میں بیشتر امتوں اور اقوام نے اپنے اپنے انبیاء و مصلحین و نیز اپنے اپنے قومی ہیروؤں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ اُن کی تصاویر اور اُن کے مجسمے بنا کر پوجنے لگے تھے اور چونکہ ہمارے آقا تمام انبیاء اور تمام مصلحین سے بڑھ کر شرک سے بیزار اور خدا کی وحدانیت کے قیام کے لئے سخت حریص تھے، اِس لئے آپ نے جہاں اپنی زندگی بھر حتی المقدور سعی فرمائی کہ آپ کے ماننے والے پیر پرست نہیں بلکہ پیر نما بن جائیں اور صرف اور صرف خدائے یگانہ و برتر ہی کے آگے سجدہ ریز ہوں اور اپنی ہر حاجت کے لئے اُسی سے نُصرت اور عون طلب کریں، وہیں اپنی زندگی کے آخری مرحلہ پر (حجۃ الوداع کے موقعہ پر) جو وصیت اور نصیحت قوم کو فرمائی، اُس میں بھی شرک کی سخت مذمت کی۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی تصویر کے اُتارے جانے کی کبھی بھی ہمت افزائی نہیں فرمائی، نتیجتاً آج ہمارے پاس آپ کی کوئی تصویر موجود نہیں۔

اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں جو جذبہ محبت ووفاداری ودیعت فرمایا ہے، وہ کسی اور نبی یا کسی اور بادشاہ کے خدام کو نہیں ملا۔ اُس محبت و شیفتگی اور اُس جذبہ فدائیت کے تقاضے سے مجبور ہو کر ممکن تھا کہ کمزور مسلمان آپ کی تصویر پاتے تو اُسے پوجنے لگتے۔ بلکہ اپنی اُس پرستش کو اِس کمال تک بھی پہونچا سکتے تھے کہ کسی مشرک قوم نے اپنے کسی معبود کی پرستش کو وہاں تک نہ پہونچایا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ہزاروں سلام ودرود ہوں اُس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جس نے تصویر سے رغبت نہ دلا کر مسلمانوں کو ایک امکانی شرک سے محفوظ کر دیا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ نے تصویر کو حرام ہی قرار دے دیا، درآں حالیکہ وہ مستقبل میں صحیح عکس میں آ کر مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت بننے والی تھی۔ یہ تو ایک عیب ہے جو اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ایسی چیز کو حرام قرار دے دیا جس میں ویسے کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی اور جو آئندہ کسی زمانے میں خود مسلمانوں کے لئے ایک بڑی اور بہت ہی اہم ضرورت بننے والی تھی۔ ایسی ضرورت کہ اُس کے بغیر دنیا کے بہت سے ضروری کام انجام پذیر ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

(یہ مضمون بدر مجریہ ۱۱/ ۱۲/ ۱۹۷۵ء میں چھپ چکا ہے)

(42)

قادیان کی حسین یادیں

۹ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو ہمارا قافلہ نامپلی سے روانہ ہوا اور ۱۲ر ڈسمبر ۱۹۷۴ء کو صبح ساڑھے چھ بجے دارالامان پہنچا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ امرتسر تک سردی کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ لیکن قادیان کے قریب خنکی بڑھ گئی تھی۔ آدھا میل پیچھے ہی سے لوگ کھڑکیوں میں سر ڈالے کہرے کی دُھند میں منارۃ المسیح کو تلاش کرنے لگے۔ جونہی منارۃ المسیح پر نظر پڑی۔ ایمانی حرارت نے دلوں پر چھائی تمام اوس کو اُڑا دیا۔ کہرے کی چادر میں لپٹا مسجد اقصیٰ کا یہ مینار ایک پروقار منظر پیش کر رہا تھا۔ پنجاب کے چہار اطراف نظریں دوڑائیے، نمونہ کے لئے بھی آپ کو مسلمان نظر نہیں آئے گا۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے اپنی ایمانی جرأت اور دلی وقار کو بالائے طاق رکھ کر فرار میں ہی عافیت ڈھونڈی تھی۔ اپنے پیچھے اپنی مسجدیں، اپنے آباء کے مقابر، اپنی جائیدادیں، یہاں تک کہ بیشتر اپنی مستورات کو بھی چھوڑ بھاگے۔ اور یہی احمدی جنھیں آج غیر مسلم اور کافر کہتے ہوئے مسلمان خوشی سے پھولے نہیں سماتے، اپنے ۳۱۳ نوجوانوں کے ساتھ اپنی جان سے زیادہ پیارے اور مقدس مرکز، قادیان دارالامان کی خدمت و آبادی کے لئے وہیں ڈٹے رہے اور اپنی انفرادی، ہمت، ایثار، وفا، قربانی، محویت، خلوص، عزم، حوصلہ اور خدمت خلق کا وہ عظیم الشان مظاہرہ کیا کہ آج نہ صرف اُن کی مساجد، مدرسے، کالج، ہاسپٹل اور دفاتر کی عمارات بلکہ زمینات، قبرستان اور دیگر تمام قسم کی اُن کی ملکیت اُن کے قبضہ میں ہے۔ اور قادیان اور اُس کے نواح میں جہاں یہ ڈیڑھ، دو ہزار احمدی مرد وزن اور بچے بیس ہزار غیر

مسلم ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اپنی فقید المثال روایتوں کے ساتھ، حسنِ سلوک، رفاہ، ایمان داری، محنت، صلح جوئی، خلوص نیت اور اٹوٹ کردار کے باعث تمام غیر مسلموں کے لئے قابل قدر تعظیم بنے ہوئے ہیں۔ قادیان کے اِن درویش صفت احمدیوں کی خوبصورتی عمل و مقبولیت کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جیسے ہرے ہرے اور زرد زرد پتوں اور خشک کانٹوں کے بیچ گلاب اپنی جاذبیت، کشش، نکھار اور فرحت رنگینی وخوشبو کے ساتھ نظر نواز ہے۔ زندگی اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ذرائع کے لحاظ سے اُن کے لئے بے حد محدود ہے۔ وہ لوگ اپنی معاش کے اعتبار سے ہر طرح آزاد نہیں۔ اُن کا محورِ نظر قادیان ہے۔ اُس سے باہر اُن کیلئے کوئی کشش نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اُن کا آقا و محبوب و رہنما مسیح موعود پیدا ہوا۔ یہ وہ بستی ہے جہاں خدا کے ایک نبی نے اپنی زندگی کے ۶۷ سال گزارے۔ اُس کے در و دیوار آج بھی اُس کے ہاتھوں کے لمس سے اور اُس کی نظروں کی کرن کے منتظر ہیں۔ وہاں کی سڑکیں آج بھی اُن قدموں کے نشانوں کو پانے سینے سے لگائے، ایک امانت کی طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہاں یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں ایک پاک وجود نے اپنے جسم و جان سمیت اپنی سانسوں کی خوشبو بکھیری اور اپنے مسیحی نفس سے روحوں پر وہ دم کیا کہ آج بھی اُن کے کردار، گفتار، جوش عمل اور عزم و حوصلہ سے اِس کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جس پر آج دنیا کی نظریں اٹھی ہوئی ہیں۔ یہی وہ نادرِ زمانہ حصہ ارضی ہے جس نے متنوع شخصیات پیدا کیں۔ مختلف جہالت کی روحوں پر وہ نمک چھڑکا کہ انہوں نے لاکھوں لاکھ اور نفوس کو اپنی اثر انگیزی اور چھاپ سے مسیحا بنا دیا۔ یہاں وہ مسیح دوراں آرام کناں ہے۔ جسے فخر الانبیاء نے بھی سلام پہونچایا۔ ایسا وجود جس کے دیکھنے کیلئے کروڑوں آنکھیں ترستی اور کروڑوں دل تڑپتے ہی رہ گئے۔ اِس قطعہ خاکی کے ایک ایک ذرے پر اُس مہدی دوراں کی دعاؤں کا اثر ہے۔ سورج

کی اولین کرن اُسی محبوب کی جبینِ تاباں سے پھوٹتی تھی اور چاندنی کی پھوار اُس کی مسکراہٹ سے مسرور ہے کہ اُن کے چہروں کو کھلائے جارہا ہے۔ اُن کی زندگیاں اپنے روشن کردار، مسکراتے چہروں، حسنِ عمل کی تابانی اور جہدِ پیہم کی خوشبو کے ساتھ نمایاں دلکشی لئے رواں دواں ہیں۔

کسی ایک بچے کو بھی آپ اشارہ کردیں وہ حاضر ہوجائے گا۔ آپ کوئی کام اُسے سونپیں فوراً انجام دے گا اور کوئی پیغام کہیں پہونچانا چاہیں، وہ اُس کے انجام سے آپ کو اطلاع بخشے گا۔ آپ خواہ صبح چار بجے جاگ پڑیں اور ضرورت سے اپنے کمرے سے باہر نکلیں آپ کو آپ کا متعلقہ خادم تیار ملے گا، وہ گرم پانی کے لئے آپ سے استفسار کرے گا اور حکم پر فوراً بہم پہونچائے گا۔ اُس کی یہ مُستعدی رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک کہ آپ سونہ جائیں، قائم رہے گی۔ اور پھر صبح چار بجے سے وہی گہما گہمی، وہی بھاگ دوڑ، وہی مستعدی اور وہی جولاں قدمی۔ نہ تو تھکن کا شائبہ نہ اضمحلال اور پژمرُدگی کے آثار، آپ آرام پاتے تھک جائیں وہ خدمت کرتے نہیں تھکیں گے۔ یہ ہمت اور یہ حوصلہ کسی مردِ نبی صفت کے دم اور اُس کی صحبت وتربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

سَحر خیزی میں جو لطف اور مزہ وہاں پایا، زندگی میں کہیں اور نہ ملا۔ نہ کوئی انقباض اور نہ کوئی تنگی وافسردگی۔ ایک انشراح، ایک تازگی، اور ایک حلاوت ایمانی جیسے سانسوں میں گھول دئے گئے ہوں۔ ایک شگفتگی اور ایک حرارت درِ دل پر دستک دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ چار بجے سب بیدار ہوجاتے، عورتوں اور بچوں میں بھی یہی روح نظر آئی۔ معمول کا ایک محدود جہاں چشم و گوش سے دور ہوگیا تھا لیکن فکر ونظر کے بے شمار جہاں اپنی بے کراں اور بے کنار کیفیت وکمیت کے ساتھ حضورِ چشم ودید تھے۔ سینہ ودل معلوم ہوتا تھا تمام کدورتوں اور

آلائشوں سے پاک کردئے گئے ہیں۔ نمازوں میں ایک سرور، دعاؤں میں ایک کیف، گفتگو میں ایک شیرینی، خدمت میں ایک نشہ، جی چاہتا کہ تمام علائق کو خیر باد کہہ کر انہی کاوشوں اور کام جوئیوں میں زندگی کے دن پورے ہوں۔

پونے پانچ بجے صبح تہجد کی نماز باجماعت ہوتی تھی۔ مسجد مبارک چار بجے سے ہی بھرنی شروع ہوجاتی اور ساڑھے چار بجنے کے بعد اوپر چھت پر شامیانے کے نیچے بھی لوگ جگہ بنا لیتے۔ نہ تو کسی سے سنا کہ اوپر سردی اور کہرے کی شکایت کر رہا ہے۔ اور نہ کسی کو دیکھا کہ نیچے مسجد ہی میں گھسے رہنے پر مُصر دھینگا مُشتی اور دھکا پیلی کرتا ہے۔ بس ایک ادا کہ ذہن و دل گھائل ہو جائیں۔ ایک بانکپن جو صاحب نظر کو شاد کام کردے، ایک استغناء جو فکر و فہم کو سوچ پر اُکسائے اور ایک سادگی و خلوص جو بدظنی کو شرمندہ اور کور باطنی کو بینا کردے۔ ہر انسان کی اپنی اور حسی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ انہی کے مطابق وہ اپنا زاویہء نگاہ متعین کرتا ہے۔ میرے تجسس آمیز اور تنقیدی شعور نے مختلف زاویوں اور نظریوں کے تحت اپنی جولانگاہی دکھائی لیکن یہ کہتے ہوئے کوئی باک نہیں محسوس ہوتا کہ مَیں اپنے ہر خیال اور ہر انداز کو شکست یاب ہی پاتا رہا۔ یہاں تک کہ الجھن ہونے لگی کہ کیا اُس کرہَ ارض پر ایسی مخلوق بھی موجود ہے جو اپنے خالق و مالک کے ساتھ شدید محبت اور وابستگی رکھتے ہوئے اپنی ہی جنس کے دیگر انسانوں کی فلاح و بہبود اور انھیں اونچائی پر اٹھانے اور خدائے بزرگ و برتر اور محسن سے اُن کا رشتہ استوار کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہیں جو محض اثباتی قوت وشوکت کا مظہر ہوتا ہے۔ جس سے منفی تمام مواد خارج کردئے جاتے ہیں۔ میری فکر اور میری سوچ مجھے پیچھے کئی جہانوں کی سیر کرانے لگی۔ اسلام کے قرنِ اول کا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا کہ مسجدِ نبوی ایک جھونپڑی کی طرح ہے جس کی چھت پر پھونس اور کھجور کی شاخیں پڑی

ہوئی ہیں۔فرش کچا ہے اور بارش کے قطرے ٹپک ٹپک کر اُس فرش کو گیلا کئے دیتے ہیں۔ چند صحابہ اُسی ناپختہ فرش پر بیٹھے مصروفِ گفتگو ہیں۔اُن کے جسم پر پوری طرح تن ڈھانکنے والا لباس بھی نہیں۔اوراُن کے چہرے بھوک اور کمئی غذا کے باعث زرد ہورہے ہیں۔میری سوچ اُن کے قریب چلی جاتی ہے کہ سنیں وہ کیا باتیں کررہے ہیں۔ایک حیرت زا استعجاب کہ وہاں بیٹھے وہ ایک نقشہ بنارہے ہیں کہ رسول کریم کی پیشگوئیوں کے مطابق جب قیصر و کسریٰ کی حکومتیں فتح ہوں گی تو وہ کس طرح اُمورِ مملکت کو سنبھالیں گے۔وقت کی سست رفتار سوئی بھی اُن کی اِس ادا پر مسکرا دیتی ہے۔تاریخ اُن کی معصومیت اور سادہ لوحی پر قہقہہ لگانا چاہتی ہے،مگر چند ہی سال گزرتے ہیں کہ نیم برہنہ اور زرد یہ چہرے اپنی کامرانی و کامیابی پر سرخ ہوجاتے ہیں۔ کمزور اور پژمردہ یہ ہاتھ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔بھوک اور ضعف سے لڑکھڑانے والے یہ قدم دنیوی مال و متاع کو پامال کرتے اور جگمگاتے ایوانوں کو روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔تاریخ اپنی پیش قیاسی پر شرمندہ ہوجاتی ہے۔وقت اپنے غلط اندازے پر منفعل ہوتا ہے اور دنیا انھیں اپنا امام اور ہادی و رہنما تسلیم کرلیتی ہے۔مَیں سوچتا ہوں کہ معجزہ کچھ نہیں مگر ایسی چیز کا خوگر ہونا جس سے دوسرا عاری ہو۔پس وہی بات یہاں بھی دیکھی۔ایک حَرکی قوت اور ایک مواجِ عمل ہے جس نے ایک مُنفرد اصول اور تربیت کو اپنا کر اپنے ماحول کو مستقبل کے امکانی بہشت میں داخل کردیا ہے۔

اہلِ قادیان!تم ہمارے آقا مسیح زماں کے چاہنے والے ہو۔تم سے جس قدر بھی پیار کیا جائے کم ہے۔تم نے اپنے امام سے ایک وعدہ کیا اور آج تک اُسے نبھار ہے ہو۔تم نے ایک امانت کا بارگراں اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور آج بھی اُسی عزم اور استقلال کے ساتھ اُسے اُٹھائے ہوئے ہو۔تمہارا خدا تمہاری اِن مساعی کو ناکام نہیں ہونے دے گا۔ وہ بڑا ہی

قدرشناس اور حد سے سوا دینے والا ہے۔ دعا کرو کہ ہمیں بھی وہ دست و باز و عطا ہوں جو ایک دنیا سے اپنی قوت اور طاقت کا لوہا منوالیں۔

تنظیم کی پابندی ہر احمدی کا احساسِ اولین ہے۔ بلکہ مَیں تو یہ کہوں گا کہ تنظیم کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں سے صَرفِ نظر کر کے ایک احمدی زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ ایسا خیال اُس کے لئے مضحکہ خیز اور ناممکنات میں سے ہے۔ قادیان کے احمدیوں کو جس قدر اس احساس کا پاس ہے۔ اور ہونا چاہئے، وہ اُن کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے عیاں ہے۔ منوں سامان جو باہر سے آنے والے ساڑھے بارہ سو احباب کے ساتھ لدا ہوا تھا، یوں دیکھتے دیکھتے اسٹیشن سے مہمان خانہ اور مہمان خانہ سے ایک ایک مہمان کے رہائشی کمرہ میں پہونچا دیا گیا کہ ممکن نہیں کہ روپے خرچ کر کے بھی اِس قدر جلد اور سہولت سے یہ کام کروایا جاسکے۔ خدام کا یہ حال تھا کہ منٹوں میں لوگوں کا سامان ٹھکانے لگایا اور پھر حاضر خدمت ہوگئے کہ جناب آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمادیں۔ کھانا ابھی لگوادیا جائے یا توقف سے وغیرہ وغیرہ۔ اُن کے قول و فعل میں ایک یکسانیت ہے۔ جو نمائش اور ریا سے بالکل پاک ہے۔ خدمت کرنے میں ایک لطف اور مزہ انھیں حاصل ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بھی دیکھا کہ آپ خواہ اپنی ذاتی غرض سے بازار سے کوئی سامان خرید کر رہے ہیں، وہ اُسے اٹھانے اور ٹھکانے تک پہنچانے کا پیشکش کریں گے بلکہ آپ کو مجبور کر کے وہ سامان پہونچا کر ہی دم لیں گے۔ مہمانوں کے لئے دیر تک کمر جھکائے نلکہ سے پانی پمپ کئے جاتے ہیں اور خوش ہو رہے ہوتے ہیں۔

لنگر خانہ مسیح موعودؑ دن رات مہمانوں کی ضیافت اور خدمت کے لئے وقف تھا۔ صبح ساڑھے دس بجے سے جلسہ کی پہلی نشست کا آغاز ہوتا تھا۔ لیکن نو بجے تک ہی مہمان ناشتہ سے

فارغ کروائے جاتے۔ کسی احمدی کو سڑک پر یا سڑک کے کنارے تمبا کو نوشی کرتے نہیں دیکھا۔ کسی احمدی کی ناک بھوں چڑھی نظر سے نہیں گزری۔ کسی کی تیوری کے بل میں نہیں گن سکا۔ غیر سنجیدگی اور گرم مزاجی کا نظارہ میری نظروں میں نہیں آیا۔ غصہ اور خشک طبعی سے وہ متعارف نہیں اور غیبت و بہتان طرازی اُن کے علم میں لایعنی الفاظ ہیں۔ شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ یہ تمام سادگی، پاکیزگی، اخلاص، عزم حوصلہ اور چکا چوند کر دینے والی کرداری قوت وطاقت کسی نیک نمونے اور پاک روح کے پاک اثر سے مزین ہے۔ ممکن نہیں کہ انسان ایک جھوٹ اور ملمع والی زندگی کو گلے سے لگائے اور آئینے سے زیادہ صاف اور روشنی سے زیادہ لطیف زندگی کا مظہر بن جائے۔ اپنے مرشد مہدی و مسیح کے بارے میں ہمارا یہی ایقان ہے کہ اُس سے زیادہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کا خواہاں اور اُس سے بڑھ کر اپنے آقا ومطاع رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چاہنے والا کوئی اور نہیں گزرا اور یہ بھی کہ اُس کی تمام صلاحیتیں اور طاقتیں اور اس کی تمام خوبیاں اور بڑائیاں اور اُس کا اپنے خدا کے ساتھ تمام ربط وگفت محض اس کے اپنے آقا ومطاع کے ساتھ اس کی محبت وشیفتگی کا نتیجہ تھا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ آج کوئی فردِ بشر خدائے قدوس اور رب العٰلمین کا قرب صرف ایسی صورت میں حاصل کرسکتا ہے کہ وہ اُس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہو اور نام لیوا ہو۔ خدا تعالیٰ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو سورج سے تشبیہ دی ہے کہ اُس کے طلوع کے بعد اندھیرا اپنے آپ کو قتل کر لیتا ہے۔ سورج کبھی نہیں ڈوبتا اور نہ ہی جگہ چھوڑتا ہے۔ ہاں یہ زمین اور زمینی طاقتیں اپنی گردش اعمال کی وجہ سے خود کو اُس نورِ مجسم سے پھیر لیتی اور دور کر لیتی ہیں۔ پھر بھی اُس کے فیض کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی روشنی اور اپنے نور کو چاند کے ذریعہ منعکس کرتا اور دنیا کے لئے راحت اور شادمانی کے سامان مہیا کرتا ہے۔ پہلی تاریخ کا چاند چھوٹا ہوتا ہے، تاہم نور سے خالی نہیں ہوتا۔ دوسری تاریخ کو کچھ بڑا ہوتا

ہے اور نور اور خوبصورتی میں بھی قدرے زیادہ۔ یہاں تک کہ تیرہ تاریخ آجاتی ہے۔اور چودھویں شب کا چاند سورج کی روشنی کا اُسی طور پہ مکمل انعکاس کرتا ہے اور ایک دنیا کو اپنے حسن اور جلوہ سامانیوں سے مسحور کر دیتا ہے۔ بدر کامل کی انعکاسی پوزیشن ہی بجائے خود واضح کر رہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مشبّہ بہ کے مساوی ہوتا ہے لیکن نہیں کہہ سکتے کہ اُس کی روشنی سورج سے زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ اُس کی ذاتی روشنی نہیں۔ جو کچھ ہے وہ سورج ہی کی دین اور عطا ہے۔

ایسی ہی صورتِ حال اِس امتِ محمدیہ کی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے نور اٹھاتی ہے۔آج ایک غلام احمد نے اپنی غلامی کو اِس قدر تکمیل تک پہونچادیا کہ نکتہ نواز اور محسن حقیقی نے اُسے یونہی چھوڑ دینا نہ چاہا بلکہ چودھویں شب کے چاند کی تمام خوبیاں اور صلاحیتیں اسے عطا کیں اور عین چودھویں صدی کے سر پر وہ عیاں ہوا۔تمام ستارے اُس کے آگے ماند پڑ گئے۔ یہ جائے حسد نہیں بلکہ جائے فخر وتقلید ہے۔آج اُس کے چہرے کو دیکھ کر ہی تابناک سورج کے چہرے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پس آیئے کہ اِس چاند کو دیکھ کر سورج کی قوت وشوکت کا اندازہ کریں۔ اِس رو پہلی، ٹھنڈی وخوشگوار اور راحت افزاء چاندنی کی چادر اوڑھ کر بالواسطہ سورج کے عظیم الشان اور بے کراں نور سے فیضیاب ہوں اور خدائے قدوس کے انتہائی قرب اور گود میں جگہ بنائیں۔ یہ راہ بہت آسان ہے بلکہ یہی ایک راہ ہے اِس میں روشنی ہے جو ہمیں بھٹکنے سے بچائے گی اور گڑھوں اور خندقوں کے خطر سے محفوظ رکھے گی۔

(یہ مضمون اخبارِ بدر'' مجریہ ۱۶ رجنوری ر ۱۹۷۵ء میں چھپ چکا ہے)

(43)

وقت

وقت کا پہیہ اپنی پوری رفتار سے گردش میں ہے، پتہ نہیں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ سالوں سے دنیا کے یہ ہنگامے جاری ہیں، فطرت کا بانکپن کبھی زوال پذیر نہیں ہوا، کیسے کیسے قہار اور جبّار اِس پردۂ گیتی پر نمودار ہوئے اور فنا کے گھاٹ اُتر گئے، وقت نے اُن کی کوئی پرواہ نہیں کی، لوگ کہتے ہیں کہ وقت بے حس ہوتا ہے، لیکن مَیں یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ وقت کی قدر کرتے ہیں، وقت بھی اُن کی قدر کرتا ہے، یہ جو بڑے بڑے مصلح اور مُفکر پیدا ہوتے ہیں، انسانیت کا دردرَ کھتے ہیں۔ یا کم از کم اپنی قوم کیلئے بہت کچھ کرتے اور کرنا چاہتے ہیں، اُن کی زندگیوں کے حالات اور واقعات ذہن میں لائیے، خداداد صلاحیتوں اور صحت وتندرستی کو انھوں نے کس طرح، انسانیت کی بہبود اور ترقی کے لئے وقف کئے رکھا، اور ایسے ایسے کارنامے اپنے پیچھے چھوڑ گئے، جو رہتی دنیا تک انسانیت کو اُن کا گراں بارِ احسان رکھیں گے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قوم کو بھی اُن کے احسانات کا اِدراک ہو، اگر ایسا ہوتا ہے تو بہت اچھی بات ہے، لیکن وہ جو درد مند دِل رکھتے ہیں، کام میں یقین رکھتے ہیں۔ ؎

کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے　　کئے جاؤ کچھ لے کر نامِ خدا
کام کرنا ہی کامیابی ہے　　کامیابی کوئی اور چیز نہیں

بیسویں صدی، جس کی ازل سے دھوم تھی، اپنے اختتام کے قریب ہے۔ اُن سے پوچھئے جن کی عُمریں سو سال یا اُس سے زیادہ ہیں۔ بلکہ ہم خود اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم

نے اپنی عمر کے تیس، چالیس، پچاس یا ساٹھ سال کیسے گزارے۔ کہاں کھو آئے اُن لمحوں کو جو دِلوں کو گداز بخشنے اور کچھ کر گزرنے پر اُکساتے تھے، وہ خنک چاندنی راتیں کہاں گئیں جو جمالیات کے مُطالعہ کے لئے وقف ہوتی تھیں۔ کھلے میدانوں میں بیٹھ کر چاند کو تکا جاتا تھا، وہ لمحے آج بھی زندگی کا اصل اور سعادت عُظمیٰ محسوس ہوتے ہیں۔ جتنا بھی غور کیجئے، یہی سمجھ آتا ہے کہ یہ ساری کائناتِ حیات صرف چند مہینوں یا سالوں کی بات ہے۔ آئندہ بھی جمال کے فدائی پیدا ہوتے رہیں گے اور اُن کی حیرانیاں بھی بدستور قائم رہیں گی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت تمام بزم ہائے خیال کو نقش و نگارِ طاقِ نسیاں بنا دیتا ہے اور آدمی عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہ جاتا۔

وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ آج ہم جس بات کو بہت اہم سمجھتے ہیں اور اُس سے گریز کو محال جانتے ہیں، کل وہی اہم بات سوچ کر ہنسی آتی ہے، عقل کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے، بچہ اپنی ماں سے پیار کرتا اور اُسی سے بہلتا ہے، پھر وہ اُس کا ایسا عادی ہو جاتا ہے کہ وہی اُس کی کائنات، وہی اُس کا ماویٰ اور ملجا، وہی اُس کی پناہ، وہی اُس کا سہارا اور وہی اُس کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دن گزرتے ہیں کہ وہی وابستگی اور وہی مقصدِ حیات اُسے اپنے بہن بھائیوں اور ہمجولیوں میں نظر آنے لگتا ہے۔ جوانی میں قدم رکھتا ہے تو دوست احباب ہی اُسے سب سے بڑا سہارا اور اپنے ہی جسم کا حصہ نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر شادی کرتا ہے تو ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوستوں کی محبت میں وہ گرمی نہیں رہ جاتی، زندگی کے ہر نئے محاذ پر وہ پچھلے محاذ کو بھولتا جاتا ہے۔ یہ سب فراموشیاں اور نئے ماحول میں سکونِ دِل کا یقین، آخر کیا ہے؟ یہ وہی اندر چھپی ہوئی متلاشی اور مُتجسس اپنے اندر محبوب کو پا لینے کی خواہش مند بے قرار و بے چین حِس ہے جو آدمی کو سرگرداں رکھتی ہے اور تھکنے نہیں دیتی۔ جب

وہ اپنے حقیقی محبوب یعنی اپنے خدا کو پالیتا ہے تو تلاش و جستجو بھی ختم ہوجاتی ہے اور وہ چین سے بیٹھ جاتا ہے۔

وقت کو قید نہیں کیا جاسکتا لیکن جذبات واحساسات اُسے بھی قید کر لیتے ہیں۔ ؎

ہجر کا لمحہ الگ ہے وقت سے
آتو جاتا ہے مگر جاتا نہیں

لیکن جذبات کے غلبے اور احساس کی فِراوانی سے ہٹ کر سوچا جائے تو یہ محال، ممکن نظر آنے لگتا ہے۔ ''ایسی بھی کوئی شب ہے جس کی سحر نہیں'' والا خیال ایسے ہی موقعہ کی پیداوار ہے۔ یہ خیالِ اُمنگ اور عزم کا حاصل ہے۔ لوگ سکون کو نیند کا حاصل جانتے ہیں، نیند ایک ایسی فطری توانائی ہے کہ جب آنے پر آئے تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے لیکن شاعر کہتا ہے کہ آگ پر بھی اِس سے مفر نہیں۔ ؎

رکھ کے منہ سوگیا اُن آتشیں رُخساروں پر
تھا سُکوں دل کو تو نیند آگئی انگاروں پر

لیکن یہ سُکون زندگی جو ہمیں درکار ہے کس نیند پر منحصر ہے؟ کیا اُس نیند پر جس میں ہم ایک ہزار سال سے مُبتلا ہیں؟ سُکون کی نیند وہ ہوتی ہے جو خوب محنت اور کام کے بعد مُیسر آتی ہے۔ وہ محنت اور کام آج پھر درکار ہے۔ وہ لگن اور جذبہ آج پھر مطلوب ہے۔ اُس کے بغیر نہ سُکون میسر آئے گا اور نہ مُسرت وشادمانی نصیب ہوگی۔ اگر مُردوں کا اٹھنا حشر پر موقوف ہے اور حشر روزِ قیامت پر، تو سُنو! زمانے کی پکار کیا ہے۔ زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ؎

اُٹھو وگرنہ، حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

وقت جابر ہے، قاہر ہے۔ وقت مُشفق ہے، مہربان ہے۔ وقت بے لگام ہے، لیکن بے دام بھی ہے، جب نکلتا ہے تو نکلا چلا جاتا ہے۔ بس ہاتھ ملتے رہ جایئے، جب وہ دینے پر آتا ہے تو عطا میں کمی نہیں آنے دیتا۔ مٹی سونا بن جاتی ہے، یہ سب کیا ہے؟ سوچ اور فکر کی نیرنگی، جذبہ اور خیال کی جادوگری! انسان مختار ہے یا مجبور؟ کیسے کیسے مسائل لوگوں نے ایجاد کئے اور اُن کو حل کرتے کرتے خود تحلیل ہو گئے۔ انسان دراصل عامِل ہے۔ کام کئے جانا ہی اُس کی شان ہے۔ نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر اور اِس خیال سے بھی بے نیاز رہ کر کہ وہ کچھ کئے جا رہا ہے، پس کئے جایئے، ہاں نیت کا نیک اور درست ہونا شرط ہے۔ آئینہ منافق نہیں ہوتا۔ حُسن و قبح دونوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ ہماری بصیرت اور اِدراک کا امتحان مطلوب ہوتا ہے۔ یہی حال وقت کی انگڑائی کا ہے۔ اُس کے مزاج کو پہچاننا اور اُس کے مطابق اپنے اندر ضروری تبدیلی پیدا کرنا یہی تو امتحان ہے جس کی کامیابی اور ناکامی پر، مقصدِ حیات کا حصول یا محرومی مقدر ہے۔

میرے دوستو! میرے پیارو! انسانیت سے پیار کرو۔ اخلاق کے معیار اور پیمانے وسیع کرو، کم ظرفی بے شناختی ہے۔ کیا ہم بے شناخت رہنا پسند کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اُن راہوں پر قدم ماریں جو جانی پہچانی ہیں۔ اسلام کی فراہم کردہ راہیں، وہی اُسلوب، وہی میدان جو ہمارے آزمائے ہوئے ہیں۔ جنھیں ہم برت چکے ہیں، جن کی آن بان اور شان کے ہم قائل ہیں، مسرت و شادمانی کے انقلاب جن کے ہم رکاب رہے ہیں، وقت وقت کا راگ الگ ہوا کرتا ہے۔ وقت کے راگ کو پہچاننا بھی ایک ظرفِ شان ہے۔ ؎

اسمعوا صوت السماء جاء المسیح جاء المسیح
نیز بشنو از زمیں آمد امامِ کامگار

(44)

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ

دنیا کی تمام رونقیں مُسابقت کی روح سے قائم ہیں، ہر مذہب کا دعوٰی ہے کہ وہ نیکی کی طرف بلاتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کسی مذہب نے جھوٹ، دغا، فریب یا کسی اور برائی کی تعلیم نہیں دی۔ لیکن اِسلام پہلا اور واحد مذہب ہے، جس نے نہ صرف نیکی کی تعلیم دی، بلکہ نیکیوں اور اچھے کاموں میں، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا حُکم دیا۔ یہ حُکم ہر نیک مقصد پر حاوی ہے۔ خواہ وہ مقصدِ علمی ہو، تمدنی یا اقتصادی ہو یا اخلاق سے تعلق رکھنے والا۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (النّازعات:۵) کہہ کر بتایا کہ دنیا میں مقابلہ جاری ہے۔ ہر انسان، ہر قوم اور ہر گروہ نے اپنا کوئی نہ کوئی مقصدِ حیات مُتعیّن کر رکھا ہے۔ اور وہ حتی المقدور اُس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے سعی کرتا ہے۔ کھانے، پینے، عیش و آرام، اچھے لباس، گپیں ہانکنے سے لے کر، تجارت، سیاست، جاہ طلبی، علم کا حُصول، زمین و جائیداد کو بڑھانا، مختلف مقاصد اور عزائم ہیں جو لوگوں نے اپنے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور اُن کی جدوجہد اُسی کاوش کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن اسلام نے حُکم دیا کہ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (البقرۃ:۱۴۹) ”اور ہر ایک (شخص) کا ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے جسے وہ (اپنے آپ پر) مُسلط کر لیتا ہے، سو (تمہارا مطمحِ نظر یہ ہو کہ) تم نیکیوں (کے حصول) میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو“

یہ ایک حُکم ہے جس سے اعتنا کرنا ہر مؤمن پر فرض ہے، ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہر انسان،

ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔فراغت انسانی فطرت میں داخل نہیں۔کاہل الوجود بھی اگر وہ سوتے اور آرام کرتے زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں تو یہ بھی ایک مقصد ہے، گو قابلِ تعریف نہ ہو، زراعت اور سائنس کی ترقی کے لئے کوشاں ہونا، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کو مقصد قرار دے لینا، دین و مذہب کی اشاعت کے لئے دیوانہ وار کوشش کرنا، قوم سے جہالت دور کرنے اور علم میں ترقی دِلانے کے لئے مشغول رہنا، وغیرہ یہ سب نیک اور اعلیٰ مقاصد ہیں۔ان مقاصد میں استباق پیدا کرنے کا جو حکم دیا۔وہ چونکہ ہر مؤمن پر فرض قرار دیا گیا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اسی طرف متوجہ ہوتا اور نیکیوں میں دوسروں سے آگے بڑھ جاتا ہے تو یہ حکم ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ دوسرے کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی توانائیوں کو آزمائے اور اُس پہلے شخص سے آگے بڑھ جائے۔جب وہ ایسا کر لیتا ہے تو پھر پہلے شخص کی ذمہ داری دوبارہ اُسے اُکساتی ہے کہ وہ اپنی سعی و کاوش پر مطمئن نہ بیٹھے بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش و جُستجو کو ہمیشہ جوان رکھے اور اِس طرح یہ جذبہ کبھی سرد نہ ہونے دے۔

اب غور فرمایئے! دنیا میں کروڑوں انسان رہتے بستے ہیں۔اگر ہر ایک اِس جذبے کو قائم رکھے اور نیکیوں میں مُسابقت کی روح کو برقرار رکھنا اپنا مقصد قرار دے لے تو دنیا کی ترقی کی رفتار کس قدر تیز ہو جائے گی۔برسوں کی جد و جہد دنوں میں اور دِنوں کی گھنٹوں میں تبدیل ہو جائے گی اور نیک مقاصد سہل الحصول ہو جائیں گے۔آج دنیا کی جو ترقی یافتہ شکل ہے اور آئے دن انسان کے فائدے، اُس کی سہولت اور آسانی کے لئے ہر شعبے میں نئی نئی ایجادات اور تجربے ہو رہے ہیں۔اِن کا بیشتر سہرا مغربی دنیا کے سَر ہے۔مسلمانوں نے بے شک عُلوم وفنون میں اپنے وقت میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دئے اور اُس وقت کی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، لیکن یہ سب پُرانی باتیں ہیں۔

ب

فسانے بادشاہی کے، قصیدے خانقاہی کے
لکھے ماضی نے لیکن، حال کا ہر صفحہ خالی ہے

اِس کی بے شمار وَجوہ موجود ہیں، معقول سے بے اعتنائی اور منقول کو سب کچھ سمجھ لینا ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے۔ جزیرۃ العرب کی سنگلاخ اور بنجر زمین سے اُٹھنے والا علم و آگہی کا بگولہ، زبردست قوتِ حرکی کا مظہر تھا کہ جہل کی تاریکیوں کو نگلتا چلا گیا اور بے ہُنری و ''پدرم سلطان بود'' کے کھوکھلے نعروں پر تعمیر بودے معاشرے کی تمام صفوں کو پراگندہ اور منتشر کر کے چھوڑا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب نورِ ایمان سے مسلمانوں کی پیشانیاں تاباں اور فروزاں تھیں اور اُن کے سینے ایقان کے خزانوں سے معمور۔ انسان دوستی اور انسان نوازی اُن کا عزم اور خدائے بزرگ و برتر کے نام کی بلندی اُن کا جزوِ ایمان تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ساری دنیا کو اُس ہی آبِ حیات سے سیراب کریں جس کا نام قرآن اور کتاب اللہ تھا۔ لیکن یہ دور عارضی ثابت ہوا۔ خلافت کے خاتمہ کے ساتھ ہی جاہ طلبی، دنیاداری اور ملوکیت نے سَر نکالنا شروع کیا تو معتدل جذبات واحساساتِ ایمانی، مادّی خواہشات کی کثافتوں سے آلودہ ہوکر ذہنی خَلّاقیوں کو تاریکیوں میں دھکیلتے چلے گئے اور آگہی کا شعلہ جو فروزاں ہوکر آگ بننے نہ پایا تھا کہ راکھ ہوکر رہ گیا۔ خلافت کے جاتے ہی اللہ کی رحمت و برکت نے بھی مُسلمانوں سے منہ موڑ لیا۔

جنگِ خندق کے موقعہ پر باوجود دباؤ اور آثارِ بے اَمانی کی فراوانی کے، مؤمنوں کے دِلوں سے یہ پکار اُٹھ رہی تھی کہ یہ سب تو خدا اور اُس کے رسول کا فرمودہ ہے اور کوئی نئی چیز نہیں۔ اِس مشاہدے نے اُن کے ایمان کو قوت اور ڈھارس دی اور وہ اِس طاغوتی اِستیلاء سے مرعوب ہونے کے بجائے، اُس کے عارضی ہونے کے یقین سے مالا مال ہوکر اپنی تمام

صلاحیتوں اور استعدادوں کے ساتھ نیچا دکھانے پر ڈٹ گئے، آج ہمارا یقین و ایمان بھی اُسی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ دنیا مایوس ہوسکتی ہے، مگر ہم نہیں۔ مایوسی کفار کا حصہ ہے۔ مؤمن کی کمائی ایمان اور یقین ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا نعرہ یہی ہے کہ۔ ؎

آپ ہوں، مَیں نہیں انساں سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے، ابھی کمسن ہے بہار

اِسلام کے قرنِ اول کی رحمت و برکت جو نبوت اور خلافت سے مرکب تھی، تین سو سالوں تک اپنی روشنی اور چمکار سے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کرتی رہی، گو یہ سلسلہ آگے بھی بڑھا۔ اِسلام اور اہلِ اسلام کی ضیا پاشیاں آگے کی صدیوں میں بھی خیر و برکت کے مظاہرے کرتی رہیں، تاہم وہ زوال آمادہ ہوتی گئیں۔ اب اُن کے آگے چڑھائی نہیں بلکہ نشیب حائل ہوتے گئے، قعرِ مذلت کا دور بھی اُن کا نصیب بنا، لیکن یہ سب کچھ اُنھیں مٹانے اور فنا کر دینے کے لئے نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اُن کی غیرت پر ایک طمانچہ تھا۔ ایک جھنجوڑ تھی، ایک چیلنج تھا اور اُن کے ذہنوں پر ایک دستک تھی کہ اب بھی وہ اپنی کوتاہیوں، غلطیوں اور کم ہمتی کو شناخت کر لیں۔ اُن کے تدارک کے لئے کوشاں ہوں۔ اِسلام کے حقیقی مقصد کو ذہن میں لائیں۔ وقت کی آواز کو پہچانیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے اِسلام کی اشاعت ثانیہ کے اُن سے کئے تھے، اُس کی قدر و عافیت کے خوگر ہوں۔ منتظر اور بے تاب رہیں کہ کب اِس بُھس میں سے چنگاری پھوٹے اور وہ اپنے ہاتھ سینکنے کے لئے اُس کی طرف دوڑیں، وہ چنگاری پھوٹی اور شعلہ بنی اور آہستہ آہستہ ظلمتوں کو پاش پاش کرتی ہوئی اپنی تکمیل کے مراحل کی جانب رواں دواں ہوگئی۔ صاحبِ بصیرت ایک ایک کر کے اُس قافلے میں شامل ہوتے گئے اور قافلہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

آج پھر اُسی خلافتِ الٰہیہ اسلامیہ کا دور دورہ ہے جو خلافتِ اولیٰ کے ہم رنگ اور اُسی

کے شانہ بشانہ اپنی فعالیت سے حیران کئے دے رہی ہے۔ معرفت کی باتیں جو سرگوشیوں میں کہی اور سنی جاتی تھیں، مشکوں لُٹائی جارہی ہیں۔ اَسرارِ شریعت کے اُلجھے ہوئے تار، ناخنِ ہوش وخرد کے آگے کُھلے جارہے ہیں۔ دِلوں کی بنجر زمین علومِ روحانی کے پانی سے سیراب وسرشار اور بہکے ہوئے فلسفے، نُکاتِ معانی کے آگے سَرنگوں ہیں۔

یکم رجولائی ر ۲۰۰۰ء

(45)

ہم دوسروں کو مُطمئن کرنے کے لئے ہزار دلیلیں دیتے اور بحثیں کرتے ہیں، لیکن ہمیں اپنا اطمینان بھی مطلوب ہونا چاہئے۔ آئینے میں اپنی صورت بھی دیکھنی ضروری ہوتی ہے، بلکہ آئینہ کی ضرورت بھی نہیں، ایک آئینہ تو ہر آدمی کے اندر بھی ہوتا ہے۔ یہیں سے عِلم کا پودا اپنا سَر نکالتا ہے۔

ادب سے محبت کرنے والے رسالہ نکال کر مُطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بھی ادب کی خدمت کے لئے کوئی کوشش تو کی یہ رسالہ کاری، ہُنر مندی کا تقاضا کرتی ہے، ناپختہ کار اور ناتجربہ کار خواہ خلوص کی دولت سے کتنے ہی مالا مال ہوں، ناکام رہ جاتے ہیں۔ آگے اندھا مستقبل راستہ روکے کھڑا ہوتا ہے، ایک ہَیجان سا اندر بپا رہتا ہے اور تلاطم کی کیفیت طاری رہتی ہے وسائل کی کمی سِدّ راہ ہو جاتی ہے۔ تخلیق کا شوق اور اظہار کا اضطراب یا لفظ وخیال کی آرائش ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ صرف عزم اور اِرادہ رہ جاتا ہے۔ نئے سَودے سماتے ہیں اور کچھ کر دکھانے کو دِل مچل جاتا ہے، لیکن سب سے پہلا مرحلہ حرف شناسی کا ہے، لکھنے کے لئے شوقِ عِلم شرط ہے، جو اِس معیار پر پورا اُترتے ہیں، اُنھیں چاہئے کہ ضرور لکھیں کسی کا مقولہ ہے کہ علم روحانی اور ذہنی آسودگی پیدا کرتا ہے، تو اظہار کے لئے بھی بے قرار رہتا ہے۔ علم سے خیال کی کرنیں اور فکر کے سَوتے پھوٹتے ہیں۔ خیال آفرینی نئے راستے سُجھاتی ہے اور نئے تصورات جنم لیتے ہیں۔ عِلم اندھیروں کو دور اور ظلمتوں کو پاش پاش کرتا ہے۔ امکانات پیدا کرتا

اور آ گہی کے نور کو دوسروں تک منتقل کرنے کی تحریص دلاتا ہے۔سوچ اور خیالات کی تنگنا ئیاں و سعت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ سچ ہے علم یقین ہی نہیں، شک بھی پیدا کرتا ہے،لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ شک مزید علم کی جانب متوجہ اور مائل بھی کرتا ہے کسی کا قول ہے شک فضیلت ہے، اِس سے ارتقاء کاعمل تیز تر ہوجاتا ہے۔انسان خود کو قابو کر لے،یہی ایک کارنامہ ہے، وہ اپنے آپ کو قابو نہیں کرسکتا۔اُس کے دِل و دماغ اُس کے تابع نہیں رہتے،اُس کے دست و بازو اُس سے باغی اور مُنحرف ہوجاتے ہیں۔اچانک کوئی اُفتاد پڑتی ہے۔کوئی حصہّ ءجسم اینٹھنے اور درد کرنے لگتا ہے،اچانک دِل و دماغ بے قابو ہوجاتے ہیں۔انسان کی سب سے بڑی فتح خود یافتگی ہے۔ اِس کے لئے وہ شعور درکار ہے جو عِلم کی توانائی سے وجود پاتا ہے۔خدا کی معرفت یعنی اُس کی پہچان عِلم ہی سے تو عبارت ہے۔ مامورِ وقت کی شناخت علم ہی کا تقاضا کرتی ہے۔علم ہی سے دل کی راحت اور دماغ کا سکون نصیب ہوتا ہے۔علم ہی خدمت پر اُکساتا ہے۔اور خود شناسی بخشتا ہے۔آج انسان کی خدمت کے لئے اور اُس کے آرام و آسائش کے لئے دِن رات جو کوششیں جاری ہیں، اُن کا سہرا علم ہی کے سَر ہے۔علم ہی انسان پر اُس کی زندگی کے مقصد کو عیاں کرتا ہے۔علم روشنی ہے ورنہ انسان اندھیروں میں ٹھوکر کھاتا پھرے۔عِلم نور کی وہ سیڑھی ہے جو انسان اور اُس کے خالق کے درمیان ایستادہ ہے۔عِلم عزّت ہے،عِلم ہی سے انسانیت کا وقار، اُس کا حِلم اور شعور زندہ و متحرک ہیں۔علم ہی سے طاقت ہے، اقتدار ہے، جَولانی ہے، مُسرتوں کے سوتے جو دل سے پھوٹتے ہیں علم ہی سے عبارت ہیں۔ ہر حرکت،میلان،شیفتگی، کشش،کسی چیز کو پا لینے کی خواہش، ولولہ، جوش،عزم،حوصلہ، ارادے کی قوت اور تسخیر کے خواب علم ہی کے شاخسانے ہیں۔علم کے حصول کے لئے ہر دم مُستعد رہو۔اِنسان تادمِ زندگی طالبِ علم ہی رہتا ہے،اِسی لئے قرآن نے یہ دُعا سکھلائی،''رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا''اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا

(ابن ماجۃ، باب الحکمۃ)

''علم مؤمن کی کھوئی ہوئی میراث ہے، جہاں پائے فوراً اُٹھالے۔''

(46)

اخلاقِ حسنہ

اِسلام کی تعلیم کا اصل الاصول تصفیہ اخلاق اور تزکیہ نفس ہے۔انبیاء اور مامورین کا مقصد یہی اُصول کو پیشِ نظر رکھ کر ایک ایسی جماعت کا قیام عمل میں لانا ہوتا ہے، جو حُسنِ خلق، پاکیزگیءدل اور خلوصِ نیت کے ساتھ انسان کی ترقی میں اِس طرح ممد ومعاون ہو کہ دنیا سے اور کم ازکم اُن کے اِرد گرد کے ماحول سے وہ تمام سِفلی جذبات اور خواہشات ختم ہو جائیں جو اخلاقِ حسنہ اور پاکیزگیءقلب کے لئے سَمِ قاتل ہیں۔یہی وہ بنیادی تعلیم ہے جسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔جسے قرآنِ مجید نے واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔اور انسانیت کے سب سے بڑے خادم اور محسنِ انسانیت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اپنے کردار میں بسایا اور عملاً دنیا کے آگے ظاہر فرمایا۔اِسی کام کو آگے بڑھانے اور بڑھاتے چلے جانے کیلئے اِس زمانے میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہوئی۔اللہ تعالیٰ نے جو عالم الغیب ہے، اپنے پاک اور معصوم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور خادم سب سے بڑے عاشقِ صادق کو، اُسی کام کو آگے بڑھانے کے لئے مامور فرمایا۔

تیرے منہ کی ہی قَسم! اے میرے پیارے احمد
تیری خاطر سے یہ سب بار اُٹھایا ہم نے

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلافتِ حقہ اسلامیہ کا دوبارہ قیام اِسی سلسلے کی کڑی اور ''حبل اللہ'' ہے۔جسے اجتماعی طور پر تھامے رکھنے کا قرآن نے حُکم دیا ہے۔اور

آج اِسلامی دنیا کے تمام بالغ نظر اور دانشور اِس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں اَمن کا قیام خلافتِ راشدہ اسلامیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اُس کے لئے پلان بنتے ہیں۔ اپنی سی کوششیں کی جاتی ہیں، لیکن ایک معمولی سی غلطی اُن کی تمام سعی وکاوش اور عزائم کو ناکام بنا دیتی ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ انسانی دماغ، عقلی کاوشوں، وسعتِ علمی اور اَن گنت دولت کے ذخائر کو ہی وہ کامیابی اور کامرانی کا خاص ضامن سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا سب سے پیارا نبی اَن پڑھ اور غریب مسکین نہ ہوتا۔ اللہ کے دیگر مامورین اور سچے مجددین اپنے ناموں کے آگے علمی ڈگریوں کے ڈھیر ساتھ ساتھ لئے پھرتے۔ دولت کے انبار سے اُن کی کمریں جھکی ہوتیں۔ فرعون، قارون، شداد اور ہامان اِس کام کے لئے مامور کئے جاتے کیونکہ دنیوی اعتبار سے وہ اُن تمام اہلیتوں کے حامل تھے، جن اہلیتوں کو آج کے مُسلمان علماء اور لیڈر اولین اہمیت دیتے بلکہ اُن پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارے امام وآقا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفہ خامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے آج خطبات اور تقریروں کے ذریعہ جس تربیتِ روحانی واخلاقی کا بیڑہ اُٹھایا، وہ اِسلام کی اَساسی اور بنیادی تعلیم اخلاق اور تزکیہ کی ایک کڑی ہے۔ اِسی کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام مامور کئے گئے تھے۔ اِسی کام کے لئے مہدی معہود کا آنا مقدر تھا۔ یہی وہ خزائن تھے جن کو لیتے لیتے سب کے دامن بھر جانے تھے۔

اسلام ایک مقدس اور پاک تحریک کا نام ہے۔ اِس کی تعلیم پر عمل کرنا سراسر انسان کے مفاد میں ہے اور اِس تعلیم سے روگردانی نہ صرف یہ کہ فوائد سے محروم ہونا ہے، بلکہ نقصان کے انتہائی پہلوؤں کو آواز دینا ہے۔ جھوٹ، فریب، دغا، بے وفائی، کینہ، حسد، بغض وعداوت اور شر وفساد وہ شیطانی ہتھیار ہیں جو شیطان انسان کو انعام کے طور پر مُفت دیتا ہے، اِس یقین

دہانی کے ساتھ کہ جہادِ زندگانی میں یہ تمہارے دفاع کا اسلحہ ہے جو بہت کام آئے گا، جو لوگ شیطان کی یقین دہانی پر ایمان لے آتے ہیں، بدنصیبی اُن کا سایہ بن جاتی ہے۔ انجام کار خود بھی بےعزت اور رُسوا ہوتے ہیں، اور دنیا میں بھی بے آرامی اور بدامنی کا بیج بو جاتے ہیں۔ آج دنیا میں ہر وہ تحریک جو امن و سلامتی کے نام پر قائم ہوتی ہے، اِن ہی متذکرہ برائیوں کے خلاف جہاد کا نعرہ لے کر اُٹھتی ہے، لیکن ناکامی اِس لئے اُن کا مقدر بن جاتی ہے کہ اُس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اور اُس کی تائید نہیں ہوتی ہے اور وہ ذاتی مفادات کی آلودگیوں سے پاک نہیں ہوتی۔ الٰہی تحریک صرف اِصلاحِ احوال اور دنیا میں امن کی بحالی کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ اُن کے کاموں اور اِرادوں میں خدمت کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ ذاتی منفعت سے اُن کا دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا۔ خلافتِ احمدیہ بھی چونکہ الٰہی تحریک ہے، اِس لئے اُس کے مقاصد میں بھی قلوبِ انسانی میں طہارت اور اعمال میں پاکیزگی کا پیدا کرنا شامل ہے۔ نتائج اللہ کے فضل سے حاصل ہوں گے کیونکہ ''يَدُ اللهِ فَوْقَ الْجَمَاعَةِ'' پر ہمارا یقین اور ایمان ہے۔

❁❁❁

(47)

اِسلام اور اَمنِ عالَم

انسانی فطرت اَمن کو چاہتی ہے، جنگ وجدل، افراتفری اور بداَمنی دراصل حیوانی جذبات کی پیداوار ہیں اور انسانی معیار کے مخالف ہیں۔ دنیا میں مذاہب کا آنا امن وشانتی کے قیام کے لئے ہوتا ہے۔ بغیر مذہب کے امن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں بداَمنی کے مظاہرے زیادہ تر مذہب کے نام پر ہی کئے گئے، لیکن اِس بات سے نفسِ مذہب پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ ہر مذہب نے اخلاق، رواداری اور امن کی تعلیم دی ہے۔ اور سب سے زیادہ اِس بات پر زور دینے میں مذہبِ اسلام سب کا سرخیل ہے، اِسلام کے معنی ہی سلامتی کے ہیں، یعنی امن، شانتی، رواداری اور اخلاق۔ اسلام سے پہلے دیگر مذاہب نے بھی سلامتی اور امن ہی کی تعلیم دی، لیکن اُن کے مقاصد، اُن کے زمانے اور اُن کے دائرے مختصر اور محدود تھے۔ اسلام اِسی لئے آخری مذہب اور تعلیم ہے کہ قیامت تک کی تمام ضرورتوں اور تمام زمانوں کا اِس کی تعلیم نے احاطہ کیا ہوا ہے۔ آج جبکہ ساری دنیا بدامنی اور نزاع کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، امن کے نام پر قائم ہونے والی تمام انجمنیں اور تمام ادارے اپنے مقاصد میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب اسلام ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو دنیا کے امن کا ضامن بن سکتا ہے۔ یہ صِرف نِرا دعویٰ نہیں ہے بلکہ اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اِسلام کے بانی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، اُن کا اثر اور اُن تعلیمات کے ذریعہ قائم کی گئی اخلاق اور امن وانصاف کی سطح ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ دنیا کے مفکرین نے جب تمام

زمانوں، حکومتوں اور تعلیمات کا جائزہ لیا تو اُن کی نظر جا کر ٹھہری صرف اِسلام کے ابتدائی زمانے پر اور اُنھیں کہنا پڑا کہ دنیا کی تاریخ میں انسانیت کے لئے سب سے زیادہ برکت و رحمت کا زمانہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ حکومت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ برکت اور رحمت حضرت عمرؓ کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اِسلام کی تعلیم اور اُس پر عمل کا نتیجہ تھی۔ گو یہ دور بہت عارضی ثابت ہوا لیکن دنیا کی تاریخ میں اپنا نمونہ چھوڑ گیا اور یہ پیغام دے گیا کہ آئندہ جب بھی انسانی عقلیں دنیا میں امنِ عامہ کے قیام کے لئے غور و فکر کریں تو اُن کی نظریں صرف اور صرف اِسلام کی تعلیمات پر جا کر رُکیں۔ آج دنیا کی حکومتیں، فلاسفر اور سیاست دان اقتصادیات کو نظامِ حیات اور اَمنِ عامہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن امنِ عامہ کی اَساس اخلاق ہے اور اخلاق کا منبع اور مخرج مذہب ہے۔ مذاہبِ عالم میں اخلاق کے فلسفہ کو اِسلام نے اِس ڈھنگ اور ایسے قرینے سے پیش کیا ہے کہ انسانی فطرت اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور جب بھی انسانی عقول امن کیلئے کوئی ذریعہ تلاش کریں گی تو اُن کے لئے اِسلام کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ اِس لئے برنارڈ شاہ نے کہا تھا کہ دنیا میں بہترین مذہب، اسلام ہے۔ بھارت کے سابقہ پریسیڈنٹ اور فلاسفر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنے ایک مضمون "THE FUTURE RELIGION OF THE WOLRD" میں بحث کا نتیجہ یہی نکالا کہ دنیا میں آئندہ امن کا قیام صرف مذہب کے ذریعہ ممکن ہے اور دنیا کا آئندہ مذہب وہی ہوگا جو انسانی فطرت کے مطابق ہوگا۔ اِسلام کے اِسی غلبہ اور دنیا بھر کے انسانوں کو دُکھوں اور پریشانیوں سے نجات دینے کے لئے اُن کے خالق و مالک اور سب سے زیادہ مہربان اُن کے خدا نے اُسی نمونہ اور اُسی خو، بو، پر آج پھر اسلام کی خلافتِ راشدہ اولیٰ کا نمونہ قائم فرمایا ہے اور وہ تمام پاکیزہ تگ و دَو اور سعی و کاوش جو

امنِ عامہ کے قیام کے لئے ضروری ہے، خلافتِ احمدیہ اسلامیہ کے ذریعہ کی جارہی ہے اور وہ زمانہ قریب ہے دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا یعنی اسلام جو امن کا ذریعہ بنے گا اور ایک ہی نبی ہوگا یعنی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم، جن کی تعلیم اور جن کے اخلاق کا فیضان دنیا میں قیامِ امن کا موجب ہوگا۔

تاریخ: ۲۲رفروری:۲۰۰۱

(48)

رُسومات کے متعلق اسلامی تعلیم

بلا لحاظ مشرب ہر مسلمان کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک مکمل شریعت اور ایک کامل ضابطہ حیات ہے۔ اب قیامت تک مذہبی تعلیمات اور رہنمائی کے لئے کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آسکتی جس کے لئے قرآنِ مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر ہمیں کسی اور جگہ سے خوشہ چینی کی ضرورت لاحق ہو۔ بدلتے ہوئے زمانوں کے نئے نئے تقاضے اپنی تکمیل اور رہبری کے لئے کلام اللہ اور اُسوۂ رسولِ کریم سے باہر کسی اور کے چہرے کی طرف ہماری نظروں کو پھیر دیں۔

قرآن کا سب سے آخری پیغام کہ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡناً (المائدۃ:۴) ایک کامل حُجّت ہے۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ لَقَدۡ کَانَ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُو اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡراً (الاحزاب:۲۲) یعنی تمہارے لئے اُن لوگوں کے لئے) جو اللہ اور آخری دن سے ملنے کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کا بہت ذکر کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول میں ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ (جس کی اُنھیں پیروی کرنی چاہئے) اب کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ ہم قیل وقال اور حُجّت سے کام لیں اور خوامخواہ اُن بزرگانِ دین کے جو ہم سب مسلمانوں کے لئے واجب التعظیم اور واجب التسلیم ہیں۔ حوالے دے دے کر ہمیں قائل کرنے کی کوشش کریں۔

سب سے پہلے تو مَیں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایسی حجت کرنے پر مائل وہ لوگ ہوتے ہیں، جنہوں نے اُن بزرگوں کی تعلیمات کا جن کا وہ حوالہ دے رہے ہوتے ہیں، کبھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اُن کا سارا علم اور زور سنی سنائی باتوں پر ہوتا ہے۔ ورنہ ذاتی علم اور غور وفکر کے جواہر سے اُن کا دامن خالی ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہاں بات قرآن کی چل رہی ہے اور اُس کا سب سے زیادہ ادراک رکھنے والی ذات جس نے قرآن کو برت کر بھی دکھا دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی، اور اُن کے اُسوہ کے ایک ایک پہلو کو سمجھنے، پرکھنے اور عملاً برتنے والا گروہ آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ جو قرآنِ کریم کے اول المخاطبین تھے۔

حضرت عائشہؓ کا یہ کہنا کہ خلقہ القرآن سب سے قریبی اور مُستند جواب ہے۔ جب کبھی شیعہ حضرات سے مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتی ہے تو منجملہ اور مسائل کے اِس مسئلہ پر بھی وہ زور دیتے ہیں کہ قرآنِ مجید کے تیس نہیں بلکہ چالیس پارے تھے۔

یہ اضافی دس پارے حضرت علیؓ پر وحی کئے گئے تھے۔ جنھیں حضرت عثمانؓ نے جب وہ قرآن جمع، ترتیب کا کام کر رہے تھے، ضائع کر دیا تھا۔ ہم اُن سے ہمیشہ یہی پوچھتے ہیں کہ آپ کے عقیدے کے مطابق آج کا قرآنِ مجید جو ہمارے پاس بھی ہے۔ اور آپ کے پاس بھی ہے۔ گو یا نامکمل ہے۔ اور اگر وہ نامکمل ہے اور بہت کچھ تعلیم اِس میں سے حذف کر دی گئی ہے، تو آپ یہ بتائیں کہ مثلاً انسانی ضرورت اور تقاضے کی وہ کون سی تعلیمات ہیں جنھیں ہم آج قرآن سے حذف شدہ پاتے ہیں۔

وہ کون سی ضرورتیں ہیں جو ہمیں درکار ہیں اور موجودہ قرآن میں وہ موجود نہیں؟ ہمارے شیعہ دوست اِس کا کوئی جواب نہیں دیتے ہیں اور دے بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ قرآنِ مجید

مکمل ضابطہ حیات اور ہر نقص اور ہر کمی سے پاک ہے۔ اب اگر غیروں نے نہیں بلکہ خود ستون سے بعض و قیع فرقوں نے بے شمار بدعتیں اسلام میں داخل کر دی ہیں اور کرتے جا رہے ہیں تو گویا وہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق اُن گم شدہ اور حذف شدہ تعلیمات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے اور اپنی دانست میں قرآن کی تکمیل کے سامان کر رہے ہیں اور اِس پر مفتخر اور نازاں بھی ہیں۔

اے مسلمانو! کیا تم میں کوئی صاحب دل بھی موجود ہے؟ جس کا دل تڑپ اور کانپ رہا ہو؟ جس کی آنکھیں بھر آئی ہوں؟ اور بیان شدہ حقیقت سے اُس کا جسم تھرا رہا ہو؟ کوئی صاحبِ علم ہے جسے اپنے دینی بھائیوں کی اِس کٹھور ایمانی پر پسینہ آ گیا ہو؟ کلام اللہ اور اُسوۂ رسول کے ساتھ یہ مذاق کب تک روا رکھا جائے گا؟ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کا سبق کب یاد آئے گا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے عقل اور شعور اسی لئے عطا کیا تھا کہ حق و باطل کے فرق کو بُھلا بیٹھو؟ آج ملتِ اسلامیہ کن دکھوں اور اذیتوں سے دو چار ہے؟

❁❁❁

(۲۴ راگست ۲۰۰۵ء)

(49)

احمدیت اور امنِ عالَم

اِس مضمون کا عنوان ''احمدیت اور امنِ عالَم'' کے بجائے ''اِسلام اور امنِ عالَم'' بھی رکھا جا سکتا تھا، لیکن ''احمدیت اور امنِ عالَم'' رکھا گیا ہے۔ کیا اِسلام اور احمدیت دو الگ الگ مکاتیبِ فکر ہیں؟ جواب یہ ہے کہ نہیں، احمدیت اسلام ہی ہے اور اسلام کا وجود احمدیت ہی میں ہے۔ اگر اسلام اور امنِ عالم کہا جائے تو لوگوں کی نظر اسلام کو ڈھونڈتی رہ جائے گی اور وہ ملے گا کہیں نہیں۔ وہ تو کھو چکا ہے۔ اسلام دراصل عملی مذہب ہے۔ کوئی نظریاتی خاکہ نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے اِس پاک مذہب کا نام جماعت رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ موعود جماعت ''اسلام'' ہی ہوگی۔ پھر الگ سے ایک جماعت کہنے کا مطلب یہی ہوا کہ ''اسلام گم شدہ ہو چکا ہوگا'' اور آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ واقعی ''اسلام کا رہ گیا فقط نام باقی'' ایک حقیقت بن چکا ہے۔ جتنے ممالک اِس وقت اسلامی ہونے کے دعویدار ہیں، اُن میں سے کسی کا نام تو لیجئے، جسے اسلام کے نام پر پرکھا جا سکتا ہو۔ ہر جگہ افراتفری، خودغرضی، جھوٹ، سیاست بازی، لوٹ کھسوٹ، تکبر، ریاکاری اور جہالت کا دور دورہ ہے اور اِس سے بھی بڑھ کر بعض مُلک، دہشت گردی، تخریب کاری اور بدکرداری کے لیبل کے ساتھ زندہ ہیں اور مُصر ہیں کہ اُن کے نام کے ساتھ اسلام کا لیبل لگایا جائے۔

اسلام ایک آفاقی تنظیم، پُرامن تحریک، نفع بخش عزم وارادے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین اُسوہ سے لبریز عمل وجہد کا نام ہے۔ یہ نِرا دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اسلام

مجسم شکل میں کسی چیز کا نام نہیں بلکہ وہ ایک تحریک ہے جو خدا اور رسول اور اسلام کے نام کے پیغام کے تصور سے تشکیل پاتی ہے۔ انسانیت کے وقار اور انسانیت کی محبت میں دلوں کے گداز سے نمو پذیر ہونے والی تنظیم اور لائحہ عمل ہے۔ آج اسلام کے نام کے ساتھ ہی کسی بھی غیر مسلم بلکہ ایک مسلمان کی نظر اور اُس کا خیال بھی مسلمانوں کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لیکن اسلام کو اس قدر پامال اور بدنام کیا گیا ہے کہ اُس کے نام کے ساتھ غیر مسلموں کے دل کراہت سے بھر جاتے ہیں۔ اسلام کی مروجہ موجودہ شکل سے امنِ عالم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کی موجودہ جو صورت ہے یا بنا دی گئی ہے، وہ چنداں خوبصورت بلکہ قبولِ صورت بھی نہیں کہ اُس کی طرف التفات کیا جائے۔ غور کیجئے! ایک خونی مہدی کا انتظار۔ اُس کے ذریعہ سے قتل و غارتگری اور لوٹ مار اور پھر دنیا کو تہس نہس کرنے کے بعد اسلام کا غلبہ۔ کوئی عقلمند انسان اس کو عدل کی کاروائی قرار دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ تمام کاروائی جو یقین کی جاتی ہے، کسی وحشی درندے پر تو چسپاں کی جا سکتی ہے، لیکن خدا کے مامور پر نہیں۔ اِس کی وضاحت اور تفصیل بہت لمبی ہے۔ اور طویل بحث کا تقاضا کرتی ہے، لیکن عمومی نظر سے دیکھا جائے تو ہر تعلیم یافتہ اور عملی آدمی کے لئے اِس بات کا سمجھنا مشکل نہیں۔ یوں سمجھئے کہ نام نہاد اسلام یا موجودہ بدنام اسلام کو ممیز کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے حقیقی اسلام کا نام "جماعتِ احمدیہ" رکھ دیا ہے۔ میل کچیل سے صاف ہو کر جب یہ نکھر جائے گا تو اب اسلام ہی کہلائے گا اور وہ ایک ہی اسلام ہوگا جو اپنے اصل نام کے ساتھ جانا جائے گا مگر ملے گا احمدیت کے ماحول میں۔ ہمارے تصور کی جولان گاہ میں یہ بھی تو دیکھا جا سکتا ہے کہ آنے والا مہدی اپنی تمام تر فطری اور جسمانی ساخت میں اگر مامور من اللہ ہے تو لازماً تمام مامورین کا بلکہ اُن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی بناء پر اُن کے اوصاف و کمالاتِ ظاہری و باطنی کا

پیکر ہے اور دنیا اُس کے شمائل میں ایک ایسے نجات دہندہ کو دیکھ رہی ہے اور محسوس کر رہی ہے جو دنیا سے محض محبت اور اپنے باطنی خلوص کے ذریعہ ظلم وستم کا خاتمہ کر کے، انسانیت کی فلاح وعظمت کے وہ کارنامے انجام دے رہا ہے، جن میں عدل ہے، انصاف ہے، فرمانبرداری ہے، علم کا چرچا ہے، محبت کی خوشبو اور فکر وسوچ کی روشنی ہے، ظلمت اور اندھیرے پامال ہو چکے ہیں، جہالت اور بے علمی گوشہ گمنامی میں دفن ہو چکے ہیں، مُساوات عام ہے اور انسان کی محبتیں محض انسانیت کے عُنوان سے قائم ہیں۔ رنگ ونسل کے امتیازات اور قومی فخر ومباہات کا خاتمہ ہے۔ دنیا میں امن وامان ایک فرحت زا نور اور دِل بستہ روشنی کی شکل میں نمایاں ہے اور ہر فرد بشر اُس کی ٹھنڈک سے سُرور اور لطف حاصل کر رہا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ بہت سے دعوے دنیا کے سامنے پیش کئے گئے۔ اُن میں سے ہر دعوے کی پُرزور مخالفت ہوئی اور آج بھی وہ مخالفت بدستور قائم ہے بلکہ عالمگیر بن گئی ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اُن دعووں میں سے بہت سے دعوے تسلیم بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ وفاتِ مسیح، ہر قوم وملت میں رسولوں کا آنا، یاجوج وماجوج اور دجال وغیرہ ایسے دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کئے گئے تھے کہ ابتداء میں سخت مخالفت، الزام تراشیوں، مختلف تشریحات اور تمسخر سے گزر کر اب اُن کو ویسے ہی تسلیم کیا جا رہا ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش فرمایا تھا۔ کسی بھی مامور کے سچے ہونے کی یہ بھی ایک دلیل ہوتی ہے کہ اُس کی باتوں کی پہلے تو ایک عرصے تک مخالفت ہوتی ہے لیکن پھر وہی باتیں تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ اُن ہی باتوں میں سے ایک بات ''جہاد'' کے متعلق بھی تھی۔ آپ کی تعلیم یہ ہے کہ جہاد اسلام کا ایک اہم رُکن ہے۔ جب اور جہاں حالات جہاد کا تقاضا کریں جہاد کرنا فرض ہے۔ جہاد کے وہ حالات کیا ہیں؟ یہی کہ مسلمانوں کو اُن کے مذہب کے اختیار سے

اور عبادتوں کے بجالانے سے روکا جائے۔لیکن اب جو حالات رونما ہو رہے ہیں وہ جہاد کی تائید میں نہیں بلکہ مخالفت میں ہیں۔

جہاد مستقل منسوخ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ کیونکہ یہ شریعت اسلامیہ کا ایک حصہ ہے اور شریعت مکمل ہو چکی ہے۔ جب بھی ضرورت پیش آئے وہ اُسی طرح فرض ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ جہاد بھی احکامِ اسلام میں سے ایک ایسا حکم ہے جو بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس لئے جب تک وہ شرائط سامنے نہیں آتیں، جہاد بھی فرض نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہوا کہ ذرا ذرا سی بات پر جہاد کا نعرہ لگانا اور جہاد کو ایک کھیل بنالینا، متین اور سمجھدار طبقہ کے لئے اسلام کی ہنسی اڑانے کے سامان بہم پہنچانا، دنیا کے امن کو خطرے میں ڈالنا اور جہاد اسلامی کا جو رعب کفار کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ اُسے زائل کرنا، اسلام نہیں بلکہ اسلام کے منافی ہے، نہ صرف بانئ احمدیت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جہاد کی یہ تعریف کی بلکہ بیسیوں سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگوں نے اور علماء نے بھی جہاد کی وہی تعریف کی۔ آپ کے زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی بلکہ دنیا کا معتدبہ حصہ یا تو اُن کے زیرِ نگیں تھا یا اُن کا طرف دار تھا۔ ہندوستان پر اُن کا قبضہ خواہ کتنا ہی جابرانہ، غاصبانہ، ظالمانہ اور عدل کے خلاف کیوں نہ رہا ہو۔لیکن اُن میں وہ شرائط مفقود تھے جو جہاد کا لازمہ ہیں۔ خصوصاً پنجاب میں انگریزوں سے قبل، سکھوں کی حکومت تھی اور شر پسند عناصر نے اسلام کو مٹانے، اُس کی عبادتوں میں رکاوٹیں ڈالنے اور اسلام کی تبلیغ کو مسخ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔اذان دینے کی اجازت نہیں تھی اور مسجدوں کو گُردوارے اور گھوڑوں کا اصطبل بنادیا گیا تھا۔

ایسے وقت انگریز آئے اور اُنھوں نے مذہبی رواداری کا ایسا خوبصورت نمونہ دکھایا کہ ہر رکاوٹ دور کردی۔عیسائی مذہب کی تبلیغ اور ترویج کے لئے انگریزی حکومت نے سینکڑوں اور

ہزاروں پادریوں کو یورپ سے بلا کر بڑی بڑی سہولتوں کے ساتھ ہندوستان میں پھیلا دیا، لیکن اسلام کی تبلیغ کی مخالفت یا ممانعت نہیں کی اور نہ ہی مسلمانوں کو عبادات سے روکا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہی فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ لازمی شرائط یہاں مفقود ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ’’یادرہے کہ مسئلہ جہاد کو جس طرح پر حال کے اسلامی علماء نے جو مولوی کہلاتے ہیں سمجھ رکھا ہے اور جس طرح وہ عوام کے آگے اِس مسئلہ کی صورت بیان کرتے ہیں، ہرگز وہ صحیح نہیں ہے اور اُس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ لوگ اپنے پُر جوش وعظوں سے عوام وحشی صفات کو ایک درندہ صفت بنادیں اور انسانیت کی تمام پاک خوبیوں سے بے نصیب کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور مَیں یقینا جانتا ہوں کہ جس قدر ایسے ناحق کے خون اِن دنوں نادان اور نفسانی انسانوں سے ہوتے ہیں کہ جو اُس راز سے بے خبر ہیں کہ کیوں اور کس وجہ سے اسلام کو اپنے ابتدائی زمانے میں لڑائیوں کی ضرورت پڑی تھی، اُن سب کا گناہ اِن مولویوں کی گردن پر ہے کہ جو کہ پوشیدہ طور پر ایسے مسئلے سکھاتے رہتے ہیں جن کا نتیجہ دردناک خونریزیاں ہیں..... اے اسلام کے عالمو اور مولویو میری بات سنو! مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اب جہاد کا وقت نہیں ہے۔ خدا کے پاک نبی کے نافرماں مت بنو۔ مسیح موعود جو آنے والا تھا آچکا اور اُس نے حکم بھی دیا کہ آئندہ مذہبی جنگوں سے جو تلوار اور کشت وخون کے ساتھ ہوتی ہیں، باز آجاؤ، تو اب بھی خونریزی سے باز نہ آنا اور ایسے وعظوں سے منہ بند نہ کرنا طریقِ اسلام نہیں ہے۔ جس نے مجھے قبول کیا ہے وہ نہ صرف اِن وعظوں سے منہ بند کرے گا بلکہ اِس طریق کو نہایت بُرا اور موجب غضب الٰہی جانے گا۔‘‘

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۵ تا ۱۲)

’’دیکھو مَیں ایک حکم لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اب سے تلوار

کے جہاد کا خاتمہ ہے، مگر اپنے نفسوں کے پاک کرنے کا جہاد باقی ہے اور یہ بات مَیں نے اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ خدا کا یہی ارادہ ہے۔ صحیح بخاری کی اُس حدیث کو سوچو جہاں مسیح موعود کی تعریف میں لکھا ہے کہ ''یضع الحرب'' یعنی مسیح جب آئے گا تو دینی جنگوں کا خاتمہ کردے گا۔ سو مَیں حکم دیتا ہوں کہ جو میری فوج میں داخل ہیں وہ اِن خیالات کے مقام سے پیچھے ہٹ جائیں دلوں کو پاک کریں اور اپنے انسانی رحم کو ترقی دیں اور دردمندوں کے ہمدرد بنیں، زمین پر صلح پھیلائیں کہ اِس سے اُن کا دین پھیلے گا اور اِس سے تعجب مت کریں کہ ایسا کیونکر ہوگا''۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۱۴ تا ۱۵)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث میں ''یضع الحرب'' کو آنے والے مسیح کی طرف جو منسوب کیا گیا وہ بھی حکمت سے خالی نہیں۔ امتِ محمدیہ کا یہ مسیح موعود، موسوی امت کے مسیح سے مشابہت رکھتا ہے۔ مسیح موسوی کی ساری تعلیم نرمی، خلیقی اور مُروّت پر مبنی تھی، جنگ وجدال اور تیر وتفنگ سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی مشابہت کو قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک اور معصوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری زمانہ کے لئے جو تعلیم دی، وہ جنگ سے بیزاری اور مذہبی جنگوں کے ترک سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے بعد سے جس قدر بھی جنگیں جہاد کے نام پر لڑی گئیں۔ سب کی سب ناکام رہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی ایک نظم میں جو جہاد بالسیف کے خلاف لکھی تھی، یہ شعر بھی رقم فرمائے تھے۔

یہ حکم سُن کر بھی جو لڑائی کو جائے گا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اُٹھائے گا

اک معجزہ کے طور پر یہ پیشگوئی ہے
کافی ہے سوچنے کو اگر اہل کوئی ہے
ہم اپنا فرض دوستو اب کر چکے ادا
اب بھی اگر نہ سمجھو تو سمجھائے گا خدا

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اب زمانے کا تقاضا قلم کے جہاد کا ہے۔قرآن کو ہاتھ میں لے کر جہاد کرنے کا ہے، یعنی تبلیغِ اسلام کا جہاد اِس وقت ضروری اور لازم ہے اور وہی جہادِ اکبر ہے۔خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا (غالباً جنگِ تبوک کے بعد) کہ اب ہم تلوار کے چھوٹے جہاد سے تبلیغ کے بڑے جہاد کی طرف جا رہے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کفر کے فتوے سہے اور دنیا بھر کی مخالفتیں مول لیں، لیکن اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔آج آپ کی یہ تحریک قبولیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔تعلیم یافتہ اور سنجیدہ طبقہ، جاہل مولویوں کی جہاد کی تعریف کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔گزشتہ سو سال میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نظریہ جہاد کی سخت مخالفت ہوئی۔لیکن یہ بھی سوچئے کہ اِن مخالفین نے دنیا میں کس کس موقعہ پر اور کس کس جگہ جہاد کے محاذ کھولے اور اسلام کے لئے فخر کا موجب بنے؟ کہیں بھی نہیں، پھر خالی خونی جہاد جہاد کا نعرہ لگانا اور بھولے بھالے عوام کو گمراہ کرنا، دنیا میں اسلام کو ظلم کا مرقع ثابت کرنے کی کوشش کرنا اور امن کو خطرے میں ڈالنا، کیا اسلامی تعلیم ہے؟ دراصل حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نظریہء جہاد ہی تھا اور ہے جو دنیا میں امن کو فروغ دے سکتا ہے۔قرآن اور قلم کا جہاد ہی وہ طاقت اور قوت ہے جو دجال کا سر پاش پاش کر رہی ہے اور دُعا کا ہتھیار ہے جو دنیا کے دلوں کو فتح کرتا جا رہا ہے۔اسلام پہلے بھی امن کا علمبردار رہا اور آج بھی ہے، بلکہ یہ صرف اور صرف خدائی تحریک میں ہی نظر آ سکتا

ہے جسے آج تحریک احمدیت کہا جاتا ہے۔

''احمدیت اور امنِ عالم'' کے دعویٰ کے ساتھ ہی نظر اور ذہن، احمدیت، احمدیوں کے رویوں، اُن کے پُرامن کاموں اور اُن کے فروغ امنِ عالم کے لئے پاک اور بے لوث جذبوں اور خدمات کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ جہاں نہ دہشت گردی ہے نہ بربریت کے مظاہرے اور نہ ہی غنڈہ گردی اور تخریب کاری کے زہر آلود پیالے۔ وہاں صرف محبتِ عالم کے سیل رواں ہیں۔ فروغِ انسانیت کے جذبے مذہبی رواداری اور ٹھوس ترقی پذیر منصوبوں کے جام لنڈھائے جارہے ہیں اور زمین آہستہ آہستہ احمدیت کے امنِ عالم منصوبوں کے آگے اپنے آپ کو فرش کئے جارہی ہے۔ حالیہ افغانستان جنگ کے موقعہ پر یعنی ۱۱رستمبر۲۰۰۱ کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کے خلاف امریکہ میں جو مظاہرے ہوئے اور مسلمانوں کی مسجدوں پر جو حملے ہوئے، اُن سے امریکہ میں مقیم احمدی اور اُن کی مساجد محفوظ رہیں۔ حق یہ ہے کہ وہ تمام الزامات جو مسئلہ جہاد سے متعلق وارد کئے گئے ہیں۔ محض اسلام کو بدنام کرنے کیلئے ہیں اور تھوڑی سی تحقیق ہی سے غلط ثابت ہوجاتے ہیں، لیکن آج کل کے مولویوں کے جو اعتقادات جہاد سے متعلق ہیں، یا جن کا اظہار کرتے ہیں، گہری تحقیق کے بعد بھی صحیح ثابت نہیں کئے جاسکتے۔ یہ خیالات گمراہ کن اور تخریب کاری سے پُر ہیں اور اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ زندگی جو آپ نے حساس ترین مواقع پر بھی امن اور سلامتی کو عزیز رکھا اور مکہ کے امن کو خطرے سے دوچار نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مجبور کردیا گیا کہ وہ اپنے گھر بار، جائدادیں، رشتہ داریاں اور کاروبار وغیرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ کو خیر باد کہہ دیں۔ پھر اِس پر بھی بس نہیں کی بلکہ اُن مہاجرین کے پیچھے متلاشی دستے لگادئے۔ بڑے بڑے انعامات مہاجرین کی گرفتاریوں پر

مقرر کئے گئے۔ پہلی ہجرت جو حبشہ کی طرف ہوئی، سفارتی دستے حکومت حبشہ کے پاس اس دعویٰ اور مطالبے کے ساتھ بھجوائے گئے کہ یہ مہاجرین ہمارے مجرم ہیں، اِنھیں واپس کیا جائے۔ دوسری ہجرت مدینہ منورہ کے بعد بھی اہلِ مکہ چین سے نہیں بیٹھ سکے۔ ابتدائی تینوں جنگیں یعنی بدر، اُحد اور احزاب، مدینہ کے اندر یا قرب وجوار میں لڑی گئیں۔ مکہ والے تین سو میل کا فاصلہ طے کر کے بڑے کروفر اور تمام فوجی تیاریوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے اور مہاجرین نے اپنی تمام تر بے سروسامانیوں کے باوجود محض اللہ کے حکم سے دفاعی تدابیر اختیار کیں۔ جنھیں آج جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ دنیا میں امن کے نام پر کیا نہیں کیا جاتا۔ امریکہ کا موجودہ قاہرانہ حملہ جو افغانستان پر کیا گیا ہے۔ کیا امن کے نام پر نہیں کیا گیا؟ حالانکہ دنیا جانتی ہے یہ دہشت گردی کی بدترین مثال ہے۔ گوکہ اِس معاملے میں طالبان کی حکومت معصوم نہیں ہے۔ ایک سو پر پاور کے ساتھ پنجہ لڑانے کی کوشش اور پھر یہ امید کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا، دیوانے کی بڑ سے کم نہیں۔ لیکن امریکہ کو بھی لاکھ ثبوت اور دلائل کے باوجود کچھ اور تحقیق اور کچھ صبر سے کام لینا چاہئے تھا۔ صرف ایک آدمی اُسامہ بن لادن کی گرفتاری کے لئے دوسری حکمتِ عملیاں بھی آزمائی جاسکتی تھیں۔ ایک آدمی کے لئے لاکھوں انسانوں کی جانوں کو داؤ پر لگا دینا یقیناً انسانیت کے وقار اور عقلمندی کے خلاف ہے۔ لیکن کیا کیا جاسکتا ہے؟ آج کے دور میں اِسی کا نام سیاست ہے۔ جھوٹا پروپگنڈا، بدظنیاں پیدا کرنا اور پھیلانا، تعصب، تکبر، خود بینی اور رعونت آج کی سیاست کے عملی مظاہر ہیں۔ احمدیت پر ظلم وستم پاکستان میں ڈھایا گیا، انسانیت اور حیا سوز، اور مکر ونفرت انگیز جو تحریک ۱۹۸۴ء کے وھائٹ پیپر قوانین کے ذریعہ حکومت کی طرف سے چلائی گئی اور آج بھی جاری ہے، کیا اسلام سے کوئی علاقہ رکھتی ہے؟ وھائٹ پیپر کا نام تو دراصل بلیک شیٹ ہونا چاہئے تھا۔ کلمہ طیبہ جو اسلام کا سب سے پہلا رکن اور مسلمان

ہونے کا بنیادی پتھر ہے، اُسے حکومت کے حکم سے مسجدوں اور گھروں کی دیواروں سے کھرچ نکالنا کیا مسلمانی ہے؟ اور یہ سب کیا گیا اور کیا جا رہا ہے اِسلام کے نام پر اور دنیا کی وہ ساری حکومتیں جو امن اور سلامتی کی دعوے دار ہیں، بلکہ امنِ عالم کے سب سے زیادہ نعرے لگانے والی حکومتیں بھی مذمت سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ ''اسلام اور امنِ عالم'' محض مسلمانوں کے رویہ اور موجودہ اسلامی سیاست کی گھناؤنی عصبیت اور نفرت انگیز جھوٹ کے باعث ایک کھوکھلا اور ریا کارانہ دعویٰ بن کر رہ گیا ہے۔ پھر کیوں ہم احمدیت کی امنِ عالم کے لئے مثبت سعی وکاوش کو ''احمدیت اور امنِ عالم'' کا نام اور عنوان نہ دیں۔ گزشتہ پانچ چھ سالوں میں دنیا کے مختلف براعظموں سے عوام کی احمدیت کی طرف والہانہ پیش رفت کیا صرف ڈھکوسلا ہے؟ اور کون ہے جو اِسے ڈھکوسلا ثابت کر سکے؟ یہ سب کچھ امنِ عالم کے لئے ایسے دماغ اور قلوب تیار کرنے کی طرف پُرامن اقدام ہے جس کا نتیجہ بہت جلد دنیا کے سامنے آجائے گا اور امن وآشتی کو بجائے سیاست کی گود میں تلاش کرنے کے، احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی آغوش میں ڈھونڈا جائے گا۔ احمدیت کی حالیہ مساعی جس نے انقلابی رنگیں کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ اسلام کے لئے فتح کئے ہیں، ریسرچ کا عنوان بنائی جاسکتی ہے اور اِس پر محققین اپنے مقالے پیش کر سکتے ہیں۔ آج تمام دنیا کی طرف سے مسلمانوں کو دہشت گردی میں ملوث کرنے اور اُنھیں دہشت گرد قرار دلوانے کی کوششیں دنیا کے تمام اسلامی ممالک کے لئے اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت ووقار کے لئے عظیم خطرہ بنی ہوئی ہیں اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مسلمانوں کے جہاد کے اُن نعروں کا جو بے وقت، بے موقعہ اور بے محل لگائے جاتے رہے ہیں، ورنہ حقیقی جہاد ایک ایسی عملی تحریک اور ایک ایسا عادلانہ رویہ ہے جس میں جارحیت کے بجائے صرف دفاع کا عنصر کارفرما رہتا ہے اور اگر معمولی جارحیت نظر بھی

آتی ہے تو صرف امن کے قیام کے لئے، اسلام کا یہ حکم کس قدر عدل واحسان کے قریب ہے کہ تم جارحین سے لڑو اور اُنھیں مارو یہاں تک کہ امن کی صورت پیدا ہوجائے۔ بدامنی اور باطل کا خاتمہ ہوجائے اور ساتھ ہی یہ کہنا کہ تمہاری جارحیت زیادہ سے زیادہ اِس حد تک جاسکتی ہے کہ، مخالفین کی جارحیت کے لگ بھگ یا برابر ہوجائے، ورنہ نرمی، عفو اور اصطلاح کا پہلو ہمیشہ پیش نظر رہے جب اور جہاں دشمن اپنی جارحیت سے باز آجائے، تمہیں اجازت نہیں کہ محض آئندہ احتیاط کے پیشِ نظر دشمن کو نیست ونابود ہی کردو۔ ہاں ایسی پالیسیاں بناؤ اور اختیار کرو، اور قانون اور قوت کے توازن کا ایسا نیٹ ورک تیار کرو کہ حق آجائے اور باطل بھاگ جائے۔ ظلم وزیادتی یعنی تلوار اور تفنگ ہاتھ تو پکڑ سکتی ہیں لیکن دماغوں کو گرفت میں نہیں لے سکتیں اور نہ دلوں پر فتح پاسکتی ہیں۔ دلوں کی فتح صرف اور صرف محبت اور خدمت کے جذبے سے ممکن ہے نفرت، تعصب اور نعرے بازی سے بے امانی بڑھتی ہے اور امنِ عالم ہمیشہ معرضِ خطر میں رہتا ہے۔ احمدیت کا ابتدائی یہ دعویٰ کہ آج زمانہ قلم کے جہاد کا ہے، تلوار کے جہاد کا نہیں، یقیناً امنِ عالم کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف سے اِس زمانے میں جہاد کی منسوخی یا معطلی کا اعلان کوئی نیا اعلان نہیں ہے۔ یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا اور اعلان تھا۔ آپ نے فیصلہ دے دیا تھا کہ جب مسیح موعود آئے گا تو مذہبی جنگوں کا خاتمہ کردے گا۔ آپ نے **یضع الحرب** کے الفاظ استعمال فرمائے تھے۔ آپ کی طرف سے جہاد کی منسوخی کا یہ اعلان آپ کے مسیح موعود ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے اپنی ایک نظم میں جہاد کے متعلق فرمایا تھا۔ ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اِعتقاد
کیوں بھولتے ہو تم **یضع الحرب** کی خبر
کیا یہ نہیں بخاری میں دیکھو تو کھول کر
فرما چکا ہے سید کونین مصطفی
عیسیٰ مسیح کردے گا جنگوں کا اِلتوا
یعنی وہ وقت امن کا ہوگا نہ جنگ کا
بھولیں گے لوگ مشغلہ تیرو تفنگ کا
یہ حُکم سُن کر بھی جو لڑائی کو جائے گا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اُٹھائے گا
اک معجزہ کے طور پر یہ پیشگوئی ہے
کافی ہے سوچنے کو اگر اہل کوئی ہے
اب تم میں کیوں وہ سیف کی طاقت نہیں رہی
بھید اِس میں ہے یہی کہ وہ حاجت نہیں رہی
اب تم پر کوئی جبر نہیں غیر قوم سے
کرتی نہیں ہے منع صلوٰۃ اور صوم سے
ہم اپنا فرض دوستو اب کر چکے ادا
اب بھی اگر نہ سمجھو تو سمجھائے گا خدا

......حضرات کے لئے اِن اشعار میں کھلے کھلے اور روشن نشانات ہیں۔

دوسرا اعلان جو احمدیت کا سرتاج ہے وہ احترام پیشوایانِ مذاہب ہے۔ یہ اعلان دنیا میں امن قائم کرنے کا ایسا مؤثر اور طاقتور ہتھیار ہے کہ کوئی سمجھدار اور تعلیم یافتہ انسان اِس کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ احمدیت نے اپنے اِس اعلان کو عملی شکل دینے کے لئے سال میں ایک دن جلسہ پیشوایانِ مذاہب منانے کا اہتمام کیا ہوا ہے اور آج ساری دنیا میں جہاں جماعت احمدیہ قائم ہے، یہ جلسے بڑی شان سے منعقد کئے جاتے ہیں۔ مختلف مکاتیبِ فکر اور مذہب کے لوگوں سے احمدیت کے اسٹیج پر تقاریر کروائی جاتی ہیں۔ منصوبہ بندیاں کی جاتی ہیں اور اُن منصوبوں پر عمل بھی کیا جاتا ہے، اگر سکھ، عیسائی اور ہندو، اسلام اور رسولِ اسلام پر مقالے پڑھتے ہیں تو مسلمان بھی ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے پیشوایان اور بزرگوں کے کارناموں کو سراہتے ہیں اور اُن کے افادی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ و نیز اُن کی اصلاح کے لئے جو پیشگوئیاں اُن کی مقدس کتابوں میں مذکور ہیں، اُن کی تشریح پیش کرتے ہیں اور ایک آنے والے مصلح کا جو وہ انتظار کر رہے ہیں، اُس کے ورود کی انھیں خبر دیتے ہیں۔ قرآنِ مجید کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول، ہادی اور ڈرانے والے بھیجے ہیں۔ ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' (الرعد:۸)(اور ہر قوم کیلئے خدا کی طرف سے) ایک راہ نما (بھیجا جاچکا) ہے پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ ''یہودیت، عیسائیت اور اسلام صرف تین ہی مذاہب ہیں جو خدا کی طرف سے ہیں اور دیگر تمام مذاہب انسانی ایجاد ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کتابیں لکھیں، ٹھوس دلائل دئے اور ثابت کیا کہ ہندوؤں کے کرشن اور رام، بدھوں کے گوتم بدھ، پارسیوں کے زرتشت وغیرہ سب اللہ کے فرستادہ تھے اور اپنے اپنے وقت میں اپنا کام کر کے جاچکے ہیں اور اُسی طرح عزت اور احترام کے مستحق ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ وغیرہ۔

اِس دعویٰ کی بھی پُرزور مخالفت ہوئی اور آج بھی نام نہاد علماء اِس دعویٰ پر شور مچاتے ہیں لیکن دنیا کا ایک بہت بڑا طبقہ اور بے شمار تعلیم یافتہ مسلمان اب تسلیم کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ تمام وجود جن کا نام احترام اور پاکیزگی کے ساتھ لیا جاتا ہے اور جن کی عزت کی خاطر کروڑوں اُن کے ماننے والے اپنی عزت اور جانوں کی قربانی دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ کبھی جھوٹے نہیں ہوسکتے۔ یقیناوہ اللہ کے بھجوائے ہوئے انبیاء کے زُمرے میں شامل ہیں۔ کوئی مؤمن اور مسلمان، مؤمن نہیں کہلاسکتا جب تک کہ وہ اللہ پر تمام رسولوں اور انبیاء پر، تمام کتب سماویہ پر اور ملائکہ پر ایمان نہ لائے اور تمام رسولوں کو یکساں اللہ کے فرستادہ نہ یقین کرے۔ سورۂ بقرہ رکوع ۴۰ میں اللہ تعالیٰ مؤمنوں کی یہ تعریف فرماتا ہے کہ، کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○ (البقرۃ:۲۸۶) یہ سب (کے سب) اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم اُس کے رسولوں میں سے ایک (دوسرے) کے درمیان (کوئی) فرق نہیں کرتے اور یہ (بھی) کہتے ہیں کہ ہم نے (اللہ کا حکم) سُن لیا اور ہم اُس کے (دِل سے) فرمانبردار ہو چکے ہیں (یہ لوگ دعائیں کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔

بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہی انبیاء، انبیاء ہیں جن کا ذکر قرآنِ مجید میں کیا گیا ہے، حالانکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے دنیا میں آنے کا جو عقیدہ عام ہے، اُن سب کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (النساء:۱۶۵) اور کئی ایسے رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تجھ سے نہیں کیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المؤمن:۷۹) یعنی اور ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول بھیجے تھے بعض کا ذکر ہم نے تیرے سامنے کر دیا ہے اور بعض کا ذکر ہم نے تیرے سامنے نہیں کیا۔

دنیا میں بیشتر مناقشے صرف اس مفروضے کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے پیشوایان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے احمدیت نے پیشوایانِ مذاہب کی عزت اور وقار کو اپنی جماعت میں عام اور مقبول کیا ہے اور تبلیغ کے میدان میں ہمیشہ اِس نظریہ اور عقیدہ کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے رسول نہ آئے ہوں۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر:۲۵) یعنی اور کوئی ایسی قوم نہیں جس میں (خدا کی طرف سے) کوئی ہوشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔ ہر قوم میں مروجہ مشہور ہستیاں جنھیں احترام سے یاد کیا جاتا ہے، یقیناً سچے تھے، کیونکہ جھوٹا کبھی بھی عزت اور احترام کی مسند پر نہیں بیٹھ سکتا اور نہ تقدس کا وہ درجہ پا سکتا ہے جس میں لاکھوں اور کروڑوں اُس کے نام لیوا اُس کی خاطر اپنی جانوں پر کھیلنے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ پیشوایانِ مذاہب کے جلسے دنیا میں صرف احمدیت کے اسٹیج پر ہی منعقد ہوتے ہیں اور دیگر کسی مسلمان کہلانے والے فرقے کو اِس کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"منجملہ اُن اُصولوں کے جن پر مجھے قائم کیا گیا ہے، ایک یہ ہے کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے کہ دنیا میں جس قدر نبیوں کی معرفت مذہب پھیل گئے ہیں اور استحکام پکڑ گئے ہیں اور ایک حصہء دنیا پر محیط ہو گئے ہیں اور ایک عُمر پا گئے ہیں اور ایک زمانہ اُن پر گذر گیا ہے، اُن میں سے کوئی مذہب بھی اپنی اصلیت کے رو سے جھوٹا نہیں اور نہ اُن نبیوں میں سے کوئی جھوٹا ہے۔"

(تحفہ قیصریہ، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۲۵۹)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ۱۸۹۵ء میں ہندوستان کی تمام قوموں اور بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں سے پُر زور اپیل کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندوستان میں امن و عافیت کے ساتھ رہنے کے لئے ٹھوس تجاویز پیش کیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تمام قومیں وائسرائے ہند کی خدمت میں ایک میموریل بھجوائیں اور دو قسم کے قوانین بنانے کی وائسرائے سے درخواست کریں۔

۱) کوئی فریق دوسرے فریق پر ایسا حملہ یا اعتراض کرنے کا مجاز نہ ہو جو خود اُس کے اپنے مذہب پر بھی پڑتا ہو، کیونکہ ایک بڑا ذریعہ فتنہ وفساد کا ہے کہ لوگ اپنے اندر نگاہ ڈالے بغیر دوسرے مذہبوں اور اُن کے پیشواؤں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔

۲) تمام اہلِ مذاہب اپنی اپنی مسلمہ اور مستند مذہبی کتب کی ایک فہرست شائع کریں اور پھر کوئی بھی اعتراض کرنے والا اُن مذہبی کتب سے باہر اُس مذہب پر کوئی اعتراض نہ کرے۔ اُس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ کسی بھی مذہب پر ایسے اعتراض نہ کئے جائیں جو اُس کی مسلمہ مذہبی کتب میں ہی نہیں ہیں۔ آپ کی یہ تجاویز اِس قدر ٹھوس، مؤثر اور مدلل تھیں کہ اگر اُن کے مطابق اُس وقت قانون بن جاتا تو اُس کے نتیجہ میں ہندوستان کی مذہبی دنیا میں امن وامان کی فضاء قائم کی جاسکتی تھی۔ آپ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں جو کتاب ''پیغامِ صلح'' کے نام سے شائع فرمائی اُس میں بھی آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو امن وسلامتی سے رہنے کی تلقین فرمائی۔ آپ نے ہندوؤں کو فرمایا کہ وہ یہ عہد کریں کہ وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں نہیں نکالیں گے اور بُرے ناموں سے آپ کو یاد نہیں کریں گے۔ اُس کے مقابل پر آپ نے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ وہ یہ عہد کرنے کیلئے تیار ہو جائیں تو آپ خود اور آپ کی تمام جماعت آئندہ گائے کی قربانی کو جو مسلمانوں کے لئے حلال ہے، اپنے ہندو بھائیوں کے مذہبی

جذبات کا خیال کرتے ہوئے ترک کریں گے۔آپ نے اپنی جماعت کو یہ تعلیم بھی دی کہ اگر آپ کے مریدوں میں سے کوئی دیکھتا ہے کہ کوئی شخص کسی ہندو کے گھر کو آگ لگاتا ہے اور وہ آگ بجھانے میں مدد دینے کے لئے نہیں اُٹھتا تو وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ آپ کے پیروکاروں میں کوئی دیکھتا ہے کہ کوئی عیسائی کو قتل کرتا ہے۔ اور وہ اُسے بچانے کے لئے نہیں اُٹھتا تو وہ میری جماعت میں سے نہیں۔ مذہبی دنیا میں امن وسلامتی کے قیام کے ان ہی سنہری اصولوں کو آپ کے خلیفہ دوم حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آگے بڑھایا اور اپنے بیشمار اور متعدد اِرشادات اور خطبوں کے ذریعہ اُنھیں عام کر دیا۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام قوموں میں مختلف زمانوں میں ظاہر ہونے والے سب پیغمبروں کی یکساں تعظیم کی جائے کیونکہ وہ سب کے سب خدا کے فرستادہ تھے اور مقصد واحد و مشترک لے کر دنیا میں آئے تھے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قوم کے پیشواؤں یعنی روحانی باپوں کی عزت کے ساتھ اُن مذاہب کے ماننے والوں سے بھی عزت واحترام کا سلوک کیا جائے تا رشتہءمحبت ترقی پذیر ہو اور آپس میں پیار ومحبت اور صلح وآشتی کا دور دورہ ہو اور باہمی اتفاق واتحاد جو انسانی معاشرے کا سب سے قیمتی جوہر ہے، جس کے بغیر دنیا کی مہمات میں انسان کسی طور پر سے کامیاب نہیں ہوسکتا، اُسے حاصل کر کے دنیا سے نفرت وفساد مٹایا جائے اور اُس کی جگہ باہمی محبت ، پیار اور اتفاق واتحاد کو فروغ دے کر ساری دنیا میں حقیقی امن وچین قائم کیا جائے۔ اِن تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جو پہلے اپنے مذاہب کے پیغمبروں کے سوا دوسرے مذاہب کے پیغمبروں کا عزت وتکریم سے نام لینا بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اُنھوں نے جماعتِ احمدیہ کی پیہم تعلیمی اور تبلیغی کوششوں اور خدمات سے روشنی حاصل کی اور تمام پیشوایانِ مذاہب کے تعلق سے اپنا رویہ تبدیل کرتے جارہے ہیں۔

تیسرا حربہ جو احمدیت کے ماتھے کا جھومر ہے، وہ تبلیغِ اسلام ہے، تبلیغ اسلام کی اہمیت اور اُس کی فرضیت ہر مسلمان پر واضح ہے، لیکن اُس میں ایسے تمام اُمور کو شامل کرنا جو راستی کا اثبات اور جھوٹ و باطل کا بُطلان ثابت کرنے کیلئے ضروری ہیں، ایک اہم امر ہے۔ اُن ضروری اُمور میں ایک اہم عقیدہ وفاتِ مسیح کا بھی ہے۔ بانیٔ احمدیت نے فرمایا ''عیسیٰؑ کی موت، اسلام کی زندگی ہے'' آج بھی بعض حلقوں کی طرف سے اِس عقیدہ پر زور دیا جاتا ہے کہ عیسیٰؑ فوت نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

اُترنے والے نہ ابھی تک بام سے اُترے
تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھوآئے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب یہ عقیدہ فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے اور علماء کا ایک طبقہ اِس سے کتراتا اور بحث کرنے کے بجائے اِس سے جان چھڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ عیسیٰؑ کی وفات اور حیات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اُس سے بہت فرق پڑتا ہے۔ اور وہ فرق بھی اِس قدر وسیع منفی اثرات کا موجب ہوا ہے کہ آج دنیا میں موجود بداعمالی، توہین انبیاء ورسل، ہتک پیشوایانِ مذاہب اور گناہوں کی بہتات سب کچھ اِسی عقیدے سے وابستہ ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآنِ مجید کی تیس (۳۰) آیات سے ثابت کر دکھایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دیگر اور انبیاء کی طرح فوت ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے دو آیتیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آلِ عمران:۷۶)

یعنی اور محمدؐ صرف ایک رسول ہے۔ اُس سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔

(۲) وَجَعَلَنِیْ مُبَارَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا

(مریم: ۳۲) یعنی اور مَیں جہاں کہیں بھی ہوں، اُس نے مجھے بابرکت (وجود) بنایا ہے، اور جب تک مَیں زندہ ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے.

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''مسیح ہندوستان میں'' کے ذریعہ وفاتِ عیسیٰؑ پر ایک سورج چڑھا دیا ہے گو یہ دعویٰ عیسائیت کے بنیادی پتھر ''کفارہ'' پر ایک ایسی ضرب ہے جیسی ضرب جنگ احزاب کے موقعہ پر خندق کھودتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رُکاوٹ کے ایک پتھر پر لگائی تھی۔ اُس ضرب نے نہ صرف پتھر کو پاش پاش کر دیا تھا بلکہ اُس ضرب سے نکلنے والے شعلے نے اسلام کو مستقبل قریب میں پیش آنے والی عظیم الشان فتوحات کے دروازے بھی وا کر دئے تھے۔ بالکل اُسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اِس معنوی ضرب نے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ ''کفارہ'' کے پتھر کو نہ صرف پاش پاش کر دیا بلکہ مستقبل قریب میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے دروازے بھی کھول دئے۔ آج دجال کی مصداق عیسائیت کی تحریک ہے جس نے کمزور انسان کو خدا کا درجہ دے کر شرک کا وہ دروازہ کھولا ہے، جس نے امنِ عالم کو خطرے سے دوچار کیا ہوا ہے۔ اِسی کفارہ کے عقیدے نے جس میں گناہ گناہ نہیں رہا بلکہ نیکی بن گیا ہے۔ شریعت کو لعنت قرار دے کر انسانوں کے ایک انبوہِ عظیم کو جو عیسائی کہلاتا ہے، بدعملی، بے اعتقادی اور تمام گناہوں کی چھوٹ کے ذریعہ سارے عالم کے لئے ایک لمحہ فکریہ پیدا کر دیا ہے۔ امنِ عالم کو جو خطرہ اِس فتنے سے لاحق ہے۔ کسی اور تحریک سے نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعویٰ وفاتِ عیسیٰؑ نے اب ایسی طاقت حاصل کر لی ہے کہ کیا عیسائی مشنری اور کیا نام نہاد علمائے اسلام، اِس سے خوف زدہ ہو گئے ہیں اور آگے آگے بھاگتے ہیں جیسا کہ احمدی علماء اُن کا پیچھا کئے ہوئے ہیں۔ آج بیشتر ذہن عیسیٰؑ کی زندگی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ خود عیسائیوں میں ایک گروہ وفاتِ عیسیٰؑ

کا قائل اور حیاتِ عیسیٰؑ کا منکر ہے۔

چوتھا حربہ امنِ عالم کے قیام کے لئے جو احمدیت نے اختیار کیا ہے وہ سیاست میں صحت مندی کے رجحان سے متعلق ہے اور وہ رجحان یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف رکھا جائے اور ہر سیاست دان خود کو قوم کا خادم سمجھے۔ خود بانئ اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما کر کہ ''سید القوم خادمهم'' (قوم میں سرداری کا حقدار وہی ہے جو قوم کا سچا خادم ہے) سیاست میں مضبوط اور صحت مند قیادت کی مکمل تعریف فرمادی تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شرائطِ بیعت میں تحریر فرمایا کہ ''عام خلق اللہ کی ہمدردی میں محض للہ مشغول رہے گا اور جہاں تک بس چل سکتا ہے اپنی خداداد طاقتوں اور نعمتوں سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائے گا'' حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مختلف مواقع پر اِس کی تشریح فرمائی۔ کچھ تشریحات حسبِ ذیل ہیں۔

''مؤمن کی ہمدردی کا دامن تمام بنی نوع انسان پر وسیع ہوتا ہے اور وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ نہ کہ بندوں کی قدر شناسی کو۔ کئی احمدی اس بات سے چڑھ جاتے ہیں کہ جن لوگوں کی ہم مدد کرتے ہیں وہی کچھ عرصہ بعد ہم سے دشمنی کرنے لگ جاتے ہیں، لیکن یہی چیز تو مزہ دیتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جن کی خدمت کی جائے مخالفت کرنے لگ جائیں تو ہمارا دل اِس بات پر خوش ہوگا کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے انسان کی خاطر نہیں کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر کیا ہے۔''

(حضرت مصلح موعودؓ بر موقعہ امداد سیلاب زدگان یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء)

آپ نے ۲/مارچ/۱۹۲۷ء کو بریڈلا ہال لاہور میں جناب سر محمد شفیع کے سی ایس آئی کی صدارت میں منعقد ایک بہت بڑے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

''جب بھی ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات رونما ہوتے ہیں تو کیا یہ جاتا ہے کہ آگے بڑھ کر دونوں میں صلح کروائی جاتی ہے۔ لیکن یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کون سی وجوہ ہیں جن کی بناء پر بے چینی اور فسادات کی جڑیں پھوٹتی ہیں۔ جب تک اُن وجوہات کو سامنے رکھ کر فسادات کی جڑ کو نہیں کاٹا جائے گا، دونوں قوموں میں صرف وقتی صلح ہوگی۔ لیکن جب دونوں میں سے کوئی ایک فریق بھی دوبارہ فسادات کی جڑ کو سیراب کرے گا وہ پھر سے ہری ہو جائے گی اور فساد جنگل کی زہریلی ہوا کی طرح پھیل جائے گا۔ پس ضروری ہے کہ اُن وجوہات کو جڑ سے اُکھیڑا جائے''
آپ نے فرمایا کہ۔ ہندو مسلم فسادات بھڑکنے کی دو وجوہات ہیں۔ اُن میں سے ایک سیاسی رواداری اور مُساوات کا فقدان ہے۔ دوسری وجہ مذہبی رواداری کا فقدان ہے۔ جب تک اِن دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر کام نہیں کیا جاتا اور ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کا خیال نہیں رکھا جاتا، ان دونوں کے درمیان جہالت اور علم کی کمی کی وجہ سے عوام الناس میں یہ کیفیت جاری رہے گی اور فسادات ہوتے رہیں گے۔ پس ضروری ہے کہ سیاستدان اور حکمران فوری طور پر اِس کا نوٹس لیں اور مذہبی لیڈر بھی اپنی اپنی جگہ اس پر سوچ بچار کریں اور ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں، جس سے دونوں قوموں کو سیاسی اور مذہبی دونوں صورتوں میں فائدہ ہو۔ ہر ایک کو اپنے اندر کچھ برداشت کا مادہ پیدا کرنا ہوگا۔ مذہبی اور سیاسی دنیا میں رواداری کے خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔ ہمارے سیاست دان میں اسقدر حوصلہ نہیں ہے کہ وہ اپنے مقابل کی اچھی بات کو بھی اچھا کہہ سکیں بلکہ فوراً یہی سمجھا اور سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ جو بھی بات کرے گا اور جو بھی کام کرے گا وہ غلط ہوگا۔ کیونکہ اگر اُس کے اچھے کام کو اچھا کہا جائے تو اُس کی ساکھ مضبوط ہوگی اور یہ برداشت نہیں اور اگر وہ واقعی کوئی غلط کام کر دے تو پھر اپنے گریبان میں منہ ڈالے بغیر اِس قدر شور مچایا جاتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ اور پھر اپنی اِس گندی ذہنیت کے پیچھے

عوام الناس کو بھی لگا دیا جاتا ہے جس سے آئے دن ملک میں فسادات پھیلتے پھولتے رہتے ہیں۔ اور عوام الناس کے بلاسوچے سمجھے غلط ذہنیت کے مالک لیڈروں کے پیچھے لگ جانے کی وجہ صرف اور صرف جہالت اور علم کی کمی ہے، اور جب تک ہمارے ملک میں جہالت اور علم کی کمی رہے گی عوام الناس ہمیشہ ہی گندی سیاست کا شکار ہو کر گلیوں اور بازاروں میں کچلے جاتے رہیں گے۔ ایک ملک کی مختلف قوموں کی مثال ایک سڑک کی ہے جس پر مختلف لوگ چل رہے ہیں۔ بے شک راستہ میں ہر ایک شخص کو خود ہمت کر کے آگے بڑھنا چاہئے، لیکن جب یہ صورت پیدا ہو جائے کہ کچھ لوگ راستہ میں دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے ہیں تو پچھلوں کے لئے آگے بڑھنا بالکل ناممکن ہوگا۔ اُن کی سب کوششیں اکارت جائیں گی۔ پس اُس وقت اگلی قوم کا فرض ہوگا کہ وہ بے شک آگے کو چلے لیکن سارا راستہ نہ روکے۔ دوسروں کے آگے بڑھنے کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ ورنہ پسماندہ قومیں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں۔ آپ نے ہندو مسلم فسادات کی دوسری بڑی وجہ مذہبی رواداری کا فقدان بتایا۔ جس طرح اِس ملک میں سیاسی رواداری نہیں، اُسی طرح مذہبی رواداری بھی نہیں ہے۔ لوگ برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ دوسرے کے مذہب کو اچھا کہیں، بلکہ الٹا دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ جب تک ایک مذہب دوسرے مذہب کی برائی نہ کرے اُس وقت تک اُس کی برتری ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہر دو قومیں یہ سمجھتی ہیں کہ مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں، برا کرتے ہیں اور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو جو کچھ کر رہے ہیں برا کرتے ہیں۔ دراصل یہ نقص اس لئے پیدا ہوا ہے قوم پرستی کے نتیجے میں یہ خیال ہمارے دل میں راسخ ہو گیا ہے کہ دوسروں کو گرائے بغیر ترقی ہو نہیں سکتی۔''

ہمارے امام سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب نے ۱۹۹۱ء کے بصیرت افروز خطاب برموقعہ جلسہ سالانہ قادیان میں تمام ہندوستانیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

’’خدا تعالیٰ ہندوستان کو امن عطا فرمائے اور ہندوستان کے شمال اور جنوب میں نفرتوں کی جو تحریکات چلائی جارہی ہیں اور ہندوستانی بھائی اپنے ہندوستانی بھائی کے خون کا پیاسا ہورہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ وحشت دور کرے اور سارے ہندوستان کو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے ساتھ وابستہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں اور دیگر مذاہب کے سب لوگوں کو اختلاف مذہب کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کرنے اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور یہ بات بھی سب اہلِ ہند کے دل میں جاگزیں فرمائے کہ کوئی سچا مذہب خدا کے بندوں سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ مذہب کی صداقت کا یہی نشان ہے کہ بزرگان خود سے رحمت وشفقت کی تعلیم دیں۔ یاد رکھیں کہ جو مخلوق سے محبت نہیں کرتا وہ خالق سے بھی محبت نہیں کرتا‘‘

(خطاب جلسہ سالانہ ۱۹۹۱ء)

۲۰۰۱/۱۲/۶ء

(50)

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۸۸۹ء کا سال انسانیت کی خوش بختی اور اُمید و آس کی کامرانی کا سال تھا۔ اُسی سال مسیح موعود علیہ السلام نے بیعت کا آغاز فرمایا اور اُسی سال آپ کے گھر وہ فرزند دلبند پیدا ہوا جس کے بارے میں تین سال قبل یعنی ۱۸۸۶ء میں اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان پیش خبری دی تھی۔ ہر مامور مِن اللہ جب دنیا میں آتا ہے اور اپنے مشن پر فائز ہوتا ہے تو مقدور بھر وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتا اور انسانیت کی فلاح اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو دنیا میں اُجاگر کرنے کے سارے جتن کرتا ہے۔ ہر مامور کے ساتھ یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ اُسے اپنے مفوضہ کام کے لئے اپنی عُمر بہت چھوٹی اور اپنی کوششیں بے حد حقیر محسوس ہوتی ہیں۔ اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش کوئی ایسا وسیلہ مہیا ہو کہ اُس کے اَدھورے کام کو خوش انجام تک پہونچانے کے سامان ہوجائیں۔ اِس بات کے لئے وہ اپنے خالق اور مالک کے حضور گریہ کناں ہوتا ہے اور اپنی تڑپ اور آرزومندی کو دعاؤں اور التجاؤں کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کا مشن اِسی طرح کی ابراہیمی دعاؤں کا نتیجہ تھے۔ یہی اضطراب خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں آپ کے چہرے پر زردی کی شکل میں نمودار تھا۔ گو کہ ہر مامور مِن اللہ یہ جانتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ کا لگایا ہوا درخت ہے جسے مادیت کے جھکڑ اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتے۔ تاہم اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے بعد اُس کے کام کیلئے اللہ تعالیٰ قابل ترین جوہر کو عطا کرے اور یوں اُس کے ذریعہ جاری کیا ہوا مشن اَدھورا یا نامکمل نہ

رہے۔ اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا قدر شناس اور ہمارے دِلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے ،اُن اضطرابی کیفیات کو دیکھتا اور اِس ضمن میں کی گئی آہ وزاریوں کو سنتا اور اپنے مامور کو اُس کی زندگی میں ہی اُس کے مِشن کی تکمیل کے لئے تسکین سے نوازتا ہے۔ حضرت مصلح موعودؓ کی پیدائش آپ کے والد ماجد کی انہیں متضرعانہ دعاؤں کا نتیجہ تھی ،جنھیں اللہ تعالیٰ نے ۱۸۸۶ء میں ہی بتادیا تھا کہ عنقریب تمہارے گھر ایک لڑکا پیدا ہوگا ، جو تمہاری آرزوؤں کی تکمیل کا باعث بنے گا۔ ’’اللہ تعالیٰ اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالے گا۔عُلومِ ظاہری و باطنی سے وہ پُر کیا جائے گا۔لمبی عُمر پائے گا۔ دنیا کے کناروں تک شُہرت اُسے نصیب ہوگی۔ وہ اَسیروں کی رُستگاری کا موجب ہوگا۔ وہ تین کو چار کرنے والا ہوگا۔قومیں اُس سے برکت پائیں گی۔ **مظہر الحق والعلاء**۔ وہ خدا کے حکم سے آئے گا اور اُسی کے اِذن سے اپنے نفسی نقطہ آسمان کی طرف اٹھایا جائے گا‘‘ یہ ایک لمبی پیشگوئی ہے ،جس کی تفصیلات پیش کرنے کیلئے ہمارا یہ وقت ناکافی ہے۔ تاہم اُس پیشگوئی کے بعض خاص خاص پہلو اِس مختصر سے وقت میں آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام ، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز اور حُسن و احسان میں آپ کا مکمل نمونہ تھے۔ آپ کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو زندہ کرنا اور اپنے پیدا کرنے والے کی روحانی حکومت کو دوبارہ دنیا میں رائج کرنے کے لئے بنیاد ڈالنا تھا ۔جیسا کہ خود آپ نے فرمایا کہ میرے ہاتھ سے وہ بیج بویا گیا اور اَب وہ بڑھے گا اور پھولے گا اور پھلے گا اور کوئی نہیں جو اُس کو روک سکے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وِصال کے بعد آپ کے خلیفہ اوّل کی حیثیت سے حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحبؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ سیدنا مولانا ایک بھر پور شخصیت کے مالک تھے۔علم و عمل میں اُن کا کوئی مقابل نہیں تھا۔خود

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اُنھیں صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ سے تشبیہ دی تھی۔ اُن کا کردار اور عمل بھی جو اُنھوں نے اپنے مُرشد کے ساتھ روا رکھا، وہی تھا جو حضرت ابوبکرؓ کا اپنے مُرشد وآقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی قدر شناسی اور احسان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کو حضرت صدیقِ اکبرؓ کے مقام پر فائز فرمایا اور آپ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے اِس سلسلہ کے پہلے خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپ کی عمر کا آخری حصہ تھا۔ آپ ضعیف ہو چکے تھے۔ چھ سال بعد ۱۹۱۴ء میں جب آپ کی رِحلت ہوئی تو آپ کی جگہ حضرت مصلح موعودؓ اِس سلسلہ کے دوسرے خلیفہ مُنتخب ہوئے۔ اُس وقت اُن کی عمر کم وبیش پچیس سال تھی۔ اُن پچیس برسوں میں آپ کی زندگی گو کہ پاک سیرتی اور نیک عملی کا ایک عمدہ نمونہ تھی، تاہم صلاحیتوں کے اظہار، چھا جانے اور ایک اِنقلاب آفریں شخصیت کا ثبوت پیش کرنے کا وقت ابھی کچھ دور تھا۔ وہ تمام پیشگوئیاں جو آپ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کی تھیں، ابھی پردۂ اخفاء میں تھیں۔ جوں ہی آپ خلیفہ مُنتخب ہوئے، وہ پیشگوئیاں عملاً ظہور میں آنی شروع ہو گئیں۔ آپ نے باوجود نوعمری کے ایک پختہ کار مربی اور قابل ترین سربراہ ہونے کا ثبوت دیا۔ اپنوں اور غیروں سے برملا یہ کہلوا لیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا زمانہ دوبارہ آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے۔ ایک عالِم ربانی، ایک مُفسرِ قرآنی، ایک مُدبر، ایک ماہر نباض، ایک تجربہ کار سپہ سالار، قوم کا سچا خادِم، اعلیٰ پایہ کا منتظم، ایک گرانمایہ رہبر اور ایک فتح نصیب جرنیل کے تمام اَوصاف آپ میں بدرجہ اَتم پائے جاتے تھے۔ باون (۵۲) سالہ آپ کا دورِ خلافت گوناگوں انقلاباتِ فِکری وعلمی کا دور رہا۔ قرآنی اسرار ونکات، معرفت کے مواجِ دریا، خدائی حُسن واِحسان کے جلوے اور انسانیت کی تکمیل کے راز آپ کے ذریعہ عیاں ہوئے۔ آپ کی اُنگلیاں جہاں عالَم گیر سیاست کے تاروں پر گرفت رکھتی تھیں،

وہیں فکر وعِلم کے روشن جگنو بھی آپ کی مُٹھیوں میں بند ہوتے تھے۔آپ کی انگلیوں کی حرکت بڑے بڑے سیاست دانوں کو چونکا دیتی تھی۔ جہاں آپ نے مُٹھیاں کھولیں، معرفت وآ گہی کی باریک راہیں روشن ہوتی چلی جاتیں۔ایک چھوٹی سی بستی سے اُٹھنے والی اکیلی آواز آپ کی رہنمائی اور سرپرستی میں دنیا کے کناروں تک جا پہونچی۔علماء میں سے جو حق سے پیار کرنے والے تھے، انھوں نے اپنی قوم کو للکارا، مرزا محمود کے ساتھ اُس کا خدا ہے، تمہارے ساتھ کون ہے؟ ۱۹۵۳ء کے خونریز فسادات کے بعد جن میں احمدیوں کو بے حد نقصان پہونچایا گیا تھا۔ اُس کے فوری بعد ۱۹۵۵ء کے جماعت کے سالانہ بجٹ کو آپ نے پچیس لاکھ تک پہونچا دیا تو مخالف علماء اور عوام وخواص چونک اُٹھے۔اپنی تقریروں اور اِداریوں میں اُنھیں اقرار کرنا پڑا کہ جس قدر ہم اِس جماعت کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اُسی قوت سے اور اُبھرتی اور اپنے زندہ ہونے کا بھرپور ثبوت دیتی ہے۔ملکانوں کو ہندو بنانے کی کوشش کو ناکام بنانے سے لے کر برصغیر کی تقسیم تک دنیا بھر میں مسلمانوں پر وارد ہونے والا کوئی ایسا نازک موقعہ نہیں گزرا، جس میں اپنے تدبر اور عملی کوششوں سے مسلمانوں کو کامیاب کروانے کے آپ نے جتن نہ کئے ہوں۔فلسطین کے معاملے میں، مصر کی رہنمائی کے موقعہ پر، کشمیر کے مسئلہ کے بیچ اور افریقی پسماندہ اسلامی ممالک کی آزادی کے لئے آپ نے جو کوششیں کیں اور جس بالغ نظری سے راہ نمائی کا کام انجام دیا، تاریخ اُس سے روگردانی نہیں کرسکتی۔

پاکستان بننے کے بعد جہاں تمام اسلامی فرقے اور انفرادی رنگ میں تمام مسلمان بھی اپنے کلیم حاصل کرنے، اور جھوٹی عرضیوں اور غرض مندانہ کوششوں میں مصروف تھے، آپ نے اپنے خرچ پر ربوہ جیسا ایک مرکز قائم اور آباد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔جس خوبی اور جانفشانی سے اپنی جماعت اور آپ کی زیرنگرانی آنے والے سینکڑوں غیر احمدی مسلمان

خاندانوں کو بحفاظت پاکستان پہونچانے کا کام آپ نے سرانجام دیا، وہ مخالف علماء اور مشاہیر سیاست دانوں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔ اُنھیں اپنی فکروں سے ہی فرصت نہیں تھی، کہ وہ دوسروں کی طرف نگاہ کرتے۔ قحط دوستی کا وہ زمانہ جہاں ہر شخص اپنے آپ کو مُیسر نہیں تھا، آپ نے قوم اور ملت کی حفاظت اور اُن کے حقوق کی بحالی کے لئے دِن رات ایک کردئے۔ خلافت تحریک کے زمانے میں جہاں یوں لگتا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی خاندان کے دو فرد ہیں، مسلمانوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور انتباہ سے آگاہ کیا اور ہندو مسلمانوں کو انصاف و مساوات کی تحریک کی تا کہ ذاتی مفاد سے ہوشیار رہیں۔ لیکن جوشِ جُنوں کب کسی کے روکے رُکا ہے؟ انتہائی بیدار مغز مسلمان لیڈر بھی ایسے بے وقوف بنے کہ خود اپنے اور اپنی قوم کے لئے آہ وفغاں، حسرتوں اور ناکام آرزؤوں کے سوا کوئی اور سامان بہم نہ پہونچا سکے۔ آپ کی انقلاب آفریں قیادت نے احمدیوں کو عِلم اور فکر وعمل کے میدانوں میں دوڑنا سکھایا۔ زندگی کے رمز سے اُنھیں واقف کروایا۔ دین و دنیا میں اُن کے لئے خدا کی خوشنودی کے سامان کئے اور اللہ کی رضا کی خاطر جہادِ زندگانی میں اخلاق اور کردار کے ہتھیاروں کے ساتھ اُنھیں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ یہ جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مسیح ومہدی کا زمانہ تعلق باللہ کی ارزانی کا زمانہ ہوگا۔ یہاں تک کہ بچے بھی نبوت کریں گے۔ وہ زمانہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بلکہ اب بھی دیکھ رہی ہے۔ یوں تو فکر وعمل کور چشمی کا کوئی علاج نہیں، لیکن اندھوں کو بینائی بخشنے کا جو معجزہ مسیح موسوی کو عطا ہوا تھا، وہی اعجاز مسیح محمدی کے حصے میں بھی آیا۔ آج کروڑوں میں پائی جانے والی مخلصین کی اِس اِکائی میں ہزاروں ایسے افراد بھی ہیں، جنھیں قبولیت احمدیت سے پہلے سخت ترین مخالف اور احمدیوں کے قاتلوں میں شُمار کیا جاتا تھا۔ خالد اور عکرمہؓ کا نمونہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے درختِ وجود میں معرفتِ الٰہی کے ایسے شیریں پھل لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ حضرت مصلح موعودؓ نے اپنے والد اور امام الزماں کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وفا کا ایسا سچا نمونہ دکھایا کہ اُس کی مثال بھی خلفائے راشدین ہی کے نمونوں میں ممکن ہے۔ آپ کی زبان سے معرفتِ الٰہی کے ایسے موتی جھڑتے تھے کہ، جن کی آب و تاب دنیا نے اِس سے قبل نہیں دیکھی تھی اور یوں اللہ تعالیٰ کی آپ کی نسبت وہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ ''مَیں اُس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا'' علومِ ظاہری و باطنی سے پُر آپ کے دوسو پچیس (۲۲۵) تصانیف اور سینکڑوں خطبات گواہ ہیں۔ تفسیرِ کبیر و تفسیرِ صغیر اُن علوم کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ کی لمبی عمر پانے پر آپ کی چھیتر (۷۶) سالہ زندگی دلیل ہے۔ دنیا کے کناروں تک آپ نے اسلامی مِشن اور اسلامی مساجد قائم کر کے شہرت پائی۔ قرآنِ مجید کے مختلف زبانوں میں تراجم آپ کی خدمتِ قرآن کے حوالے کیلئے کافی ہیں۔ ''اسیروں کی رُستگاری کا موجب ہوگا'' آپ کی اُن مساعی سے ثابت ہے جو آپ نے برصغیر کی اور افریقی ممالک کی آزادی کے لئے انجام دیں۔

وہ تین کو چار کرنے والا ہوگا۔ خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس کے آگے لکھ دیا تھا کہ ''اِس کے معنی سمجھ میں نہیں آئے'' آپ کے سوانح نگاروں نے مختلف طریقوں سے اِس پیشگوئی کے پورا ہونے کے ثبوت دئے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ تین بھائی احمدی تھے۔ آپ کے چوتھے اور سب سے بڑے بھائی خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب جو پنجاب میں سِوِل کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور کئی قیمتی کتابوں کے مصنف بھی تھے، اپنے والد کے زمانے میں یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں احمدی نہیں ہوئے تھے، وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پہلی بیوی سے تھے۔ اور اپنی والدہ اور دوسرے

رشتہ داروں کے ساتھ اور زیرِ اثر رہے۔ لیکن مصلح موعودؓ کی خلافت کے دور میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ پر بیعت کر کے احمدیت میں داخل ہوئے اور اِس طرح مصلح موعود تین کو چار کرنے والے ہو گئے۔

مختلف ممالک میں مِشن قائم کر کے اور اسلامی لٹریچر کو مختلف زبانوں میں طبع کروا کے آپ نے دنیا کی بے شمار قوموں کے لئے برکت کا سامان مہیا فرمایا اور اِس طرح قوموں نے آپ سے برکت پائی۔ ''مظھر الحق والعلاء'' حق کا اظہار اور برتری آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مِشن رہا۔ جس میں آپ نہ صرف کامیاب رہے، بلکہ اونچی مسند پر جگہ پائی۔ ''وہ خدا کے حکم سے آئے گا اور اُسی کے حکم سے اپنے نفسی نقطہ آسمان کی طرف اُٹھایا جائے گا'' ۔آپ اپنے خالق کی خصوصی خوشخبری کے نتیجہ میں اس دنیا میں آئے تھے۔ زندگی بھر باوجود اپنی صحت کی کمزوری کے اپنے مفوضہ مِشن پر ڈٹے رہے۔ دشمنوں نے کئی قاتلانہ حملے کئے لیکن خدائی ہاتھ نے ہمیشہ آپ کو پناہ دی اور اپنی عُمر پوری کر کے آپ نے طبعی وفات پائی۔ ''آسمان کی طرف اُٹھایا جائے گا'' سے مُراد آپ کی بلندی درجات ہے جو اللہ کے فضل سے آپ کو نصیب رہی۔

وَآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

❁❁❁

(51)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کا وجود بے شمار برکات اور آسمانی بشارات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ، صداقتِ احمدیت کا ایسا درخشندہ اور تابندہ نشان تھا جس کی ضیاباریاں ایک دنیا کو منور کئے ہیں اور ایک دنیا نے اُس نشانِ صداقت کی عظیم الشان روحانی تاثیرات کو بچشمِ خود مشاہدہ کیا۔ آپ کی خلافت کے ساڑھے سولہ سال کا بابرکت عہد مخالفت کی تیز رو آندھیوں سے پُر رہا، پھر بھی جماعت کے ہر شعبہ عمل میں بے شمار ترقیات رونما ہوئیں اور انقلابی کامرانیوں کا سلسلہ دراز ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ وہ آپ کے روشن اور منور پیکر کے معجزانہ نشان سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جو خصوصی تائیدات آپ کے شاملِ حال رہیں وہ آپ کی بے نظیر قائدانہ صلاحیتوں کی یاد دلاتی رہیں گی۔ استحکامِ احمدیت، استحکامِ خلافت، اشاعتِ اسلام اور اشاعتِ قرآن کے لئے آپ کی خصوصی توجہ، تاریخ عالم میں سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت اور آپ کے بعد قدرتِ ثانیہ کا قیام یعنی خلافت راشدہ کا اجراء وغیرہ سب الٰہی منشاء کے مطابق ہے۔ اِس حقیقت کو نظر انداز کر کے احمدیت کی شکست وریخت کا ارادہ باندھنا اور منصوبہ سازی کرنا، دنیا کی کسی بھی حکومت کے لئے نافع نہیں۔ پاکستان کی دو حکومتیں، ایک جمہوری اور ایک فوجی، دونوں نے اپنی پنجہ آزمائیوں کا انجام دیکھ لیا۔ بھٹو اور ضیاء الحق، دونوں بلندی پر بلی دئے گئے، زمین اُن کو دھتکار رہی تھی، اور آسمان

دسترس سے دور تماشائی بنا بیٹھا تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے راحت یا آرام کو کبھی مقصود بالذات نہیں بنایا۔انہوں نے مُلک اور بیرونِ ملک بہت دورے کئے۔مساجد کی بنیادیں رکھیں، نئے نئے مشن ہاؤسز کھولے، دواخانے اور اسکول کھولے،سپین (Spain) میں ساڑھے سات سو سال بعد پہلی اسلامی مسجد، مسجد بشارت کی بنیاد رکھی ،جو آپ کی زندگی ہی میں مکمل ہوگئی تھی۔نومبر ۱۹۸۲ء میں اُس کا افتتاح مقرر تھا۔آپ کے وصال کی وجہ سے نومبر میں جماعتِ احمدیہ کے چوتھے خلیفہ حضرت مرزا طاہر احمد صاحبؒ نے اُس مسجد کا افتتاح فرمایا۔اسی مذکورہ مسجد کی بنیاد کے موقعہ پر ہمارے خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے وہ نعرہ جماعت کو عطا کیا تھا، جو ضرب المثل بن چکا ہے۔Love for all hatred for none یعنی محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں۔وہ حقیقت جس نے ان کی راہ حیات کو روشنی بخشی اور زندگی کا خندہ پیشانی سے سامنا کرنے کی انہیں طاقت دی، وہ حق، نیکی اور حُسن کی الہامی قوت تھی۔اُن کی دعاؤں میں معجزانہ اثر اور اُن کی گفتگو اور حاضر جوابی میں پنہاں الٰہی تائید اور نُصرت کی وہ بے پناہ جاذبیت تھی جو اُن کے بُشرے سے نور کی شعاعوں کی طرح تڑپتی اور پھڑکتی محسوس ہوتی تھی۔ اور مخاطب کے کاسۂ دل میں کھنک پیدا کر دیتی تھی۔اُن کا ذکر کرتے ہوئے قلم کو جزئیات کی تابِ نگارش نہیں۔اُن کی روبروئی میں اُن کے چہرے کی عظمت، نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی اور دلوں سے جبروت اور استعجاب کا خراج وصول کرتی تھی۔

آئن سٹائن کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ وہ لوگ انسان کو زیادہ پیارے اور محبوب ہونے چاہئیں جنہوں نے انسانی نسل اور زندگی کے اِرتقاع میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔یوں تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دور سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی ابتداء ہوئی ہے۔اور اسلام نے

اُس پر مسلط کردہ قدامت پرستی اور غیر حرکی قوتوں کی آماجگاہی سے نکل کر پھر سے منہاجِ نبوت پر دوڑنے کی سعی کی اور یہ دوڑ برابر جاری ہے۔حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اِس دوڑ کی ایک درمیانی کڑی تھے جنہوں نے پاکستان جیسے متعصب اور مذہبی لحاظ سے ایک انتہائی قدامت پسند اور غیر لچکدار، غلط روایت پسند عوام پر مسلط حکومت سے پہلی ٹکر لی۔ایک طرف طاقتور، نئی نئی اُبھرتی بھٹو کی نام نہاد جمہوری حکومت تو دوسری طرف بظاہر کمزور اور بے بس جماعتِ احمدیہ، جس کی طاقت اور قوت کا محور اپنے قادر وتوانا خدا پر بھر پور ایمان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ ہر طرح سے ہراساں کئے جانے کے باوجود، اور ہر قسم کی سیاسی ،معاشی اور معاشرتی جکڑ بندیوں کے باوصف، احمدیت آج بھی اپنا کام کئے جارہی ہے۔اور بھٹو یا بھٹو حکومت کا نام ونشان سب کچھ ملیا میٹ ہو چکا ہے۔ضیاء الحق اور اُن کی ہاں میں ہاں ملانے والے جانے کس دیس میں جا بسے ہیں۔نام نہاد پاکستان اسمبلی میں منعقدہ مباحثہ کے دوران جماعتِ احمدیہ کی اخلاقی اقدار اور اُن کی خدائی تائید نے ایسا رعب قائم کیا کہ آج تک حکومتِ پاکستان نے اسمبلی کے روئیداد کو منظرِ عام پر آنے سے روکے رکھا ہے۔حالانکہ چار دہائیوں سے پاکستان کی مختلف حکومتوں میں سے ہر حکومت پر عوام نے اپنا پورا زور صرف کرکے دیکھ لیا۔اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں نے کبھی اِس بات پر غور کرنے کی کوشش کی ہے ؟ اس کی صحیح وجہ صرف ایک ہے۔جیسا کہ ۱۹۷۴ء سپیکر اسمبلی جناب پیرزادہ صاحب نے عوام کے مسلسل مطالبہ سے تنگ آکر جواب دیا تھا کہ اگر حکومتِ پاکستان اسمبلی کے روئیداد کو من وعن شائع کردے تو ڈر ہے کہ آدھا پاکستان احمدی نہ ہوجائے۔ یہ سب کچھ محض اُن پُرزور خطابات، پُر ہیبت دلائل اور پُر اثر شخصیت کے رعب کا کرشمہ تھا جو خدائی تائید اور خدائی تصرّف سے سربراہِ احمدیت حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ

اللہ تعالیٰ کے شاملِ حال تھا۔اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران آپ کا ہر انداز، ہر اظہار، ہر دلیل، ہر چوٹ اور حرکت وسکون لگتا تھا خدائی معجزات سے آنکھ ملا رہے ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ دو بشارتوں کا مجموعہ تھے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اطلاع دی تھی کہ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ نَّافِلَةً لَّكَ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۵/تذکرہ صفحہ ۶۴۶) یعنی ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں، جو تیرا پوتا ہوگا۔

دوسری خوشخبری آپ کے والد بزرگوار حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دی تھی۔آپ فرماتے ہیں کہ ''مجھے بھی خدا تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ مَیں تجھے ایک ایسا لڑکا دوں گا جو دین کا ناصر ہوگا اور اسلام کی خدمت پر کمر بستہ ہوگا''

(تاریخِ احمدیت جلد چہارم صفحہ ۳۲۱)

دونوں پیشگوئیوں سے آپ کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آراستہ و پیراستہ وارد ہونے اور برکت ورحمت سے معمور موعود خلیفہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔آپ ۱۶/نومبر/۱۹۰۹ء کو بوقتِ شب عالَمِ وجود میں آئے۔بچپن ہی سے حضرت اماں جان ام المؤمنینؓ کی گود اور تربیت میں رہے۔۱۷/اپریل/۱۹۲۲ء کو جبکہ آپ کی عمر ۱۳ سال تھی، حفظِ قرآن کی تکمیل کی توفیق پائی۔ جولائی ۱۹۲۹ء میں آپنے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔اُس کے بعد میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔بی۔اے کی ڈگری لی۔اُسی سال اگست ۱۹۳۴ء میں آپ کی شادی ہوئی۔آپ کی اہلیہ سیدہ منصورہ بیگم صاحبہ، حضرت نواب محمد علی خان صاحب مالیرکوٹلہ اور سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی صاحبزادی تھیں۔۶/ستمبر ۱۹۳۴ء کو آپ بغرض اعلیٰ تعلیم لندن بھجوائے گئے۔اِس موقعہ پر آپ کے والد حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے جو نصیحت فرمائی وہ یہ تھی۔ ’’میں تم کو انگلستان اس لئے بھجوا رہا ہوں کہ تم مغرب کے نقطہ نگاہ کو سمجھو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کے لئے دجالی فتنہ کی پامالی کے سامان جمع کرو‘‘۔

آپ نے آکسفورڈ سے ایم۔اے کی ڈگری لی اور نومبر ۱۹۳۸ء میں قادیان واپس تشریف لائے۔ جون ۱۹۳۹ء سے اپریل ۱۹۴۴ء تک جامعہ احمدیہ قادیان کے پرنسپل رہے۔ فروری ۱۹۳۹ء میں مجلس خدام الاحمدیہ کے صدر بنائے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں جب حضرت مصلح موعودؓ نے بنفسِ نفیس خدام الاحمدیہ کی صدارت اپنے ذمہ لے لی تو آپ بحیثیت نائب صدر مجلس خدام الاحمدیہ ۱۹۵۴ء تک کارگزار رہے۔ مئی ۱۹۴۴ء سے نومبر ۱۹۶۵ء تک جب تک آپ جماعتِ احمدیہ کے امام اور خلیفہ نہیں منتخب ہوئے، تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ادارہ کی عمدہ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۴ء میں مجلس انصاراللہ کی قیادت آپ کے سُپرد ہوئی۔ مئی ۱۹۵۵ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے آپ کو صدر انجمن احمدیہ کے پریذیڈنٹ کی ذمہ داریاں سونپیں۔ کالج کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ صدر انجمن احمدیہ کے پریذیڈنٹ کی ذمہ داریاں، ۱۹۶۵ء تک جب آپ جماعت کے خلیفہ سوئم منتخب ہوئے۔ آپ نے نباہیں۔ تقسیم سے قبل باؤنڈری کمیشن کے لئے مواد فراہم کرنے میں بھی آپ نے نمایاں کردار ادا کیا اور حفاظتِ مرکز قادیان کی براہِ راست نگرانی بھی سپرد رہی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے اپنی حیات میں ہی آئندہ انتخابِ خلافت کے لئے ایک کمیٹی ’’**مجلس انتخاب**‘‘ کے نام سے تشکیل دیدی تھی۔ ۸ر نومبر ۱۹۶۵ء کو اس مجلس کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت مرزا عزیز احمد صاحب ناظرِ اعلیٰ ربوہ نے فرمائی۔ اس انتخاب میں حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو جماعتِ احمدیہ کا خلیفہ سوئم منتخب کیا گیا اور اُسی وقت پانچ ہزار

افراد نے آپ کی بیعت کر لی۔ مسندِ خلافت پر مُتمکن ہوتے ہی آپ نے مختلف تحریکات کا اجراء فرمایا۔

۱) آپ نے اُمراء اور صاحب مقدرت لوگوں میں تحریک کی کہ وہ غرباء، مساکین اور یتامیٰ کے لئے اناج اور غلے کی فراہمی کا ایسا انتظام کریں کہ جماعت کا کوئی فرد بھوکا نہ سوئے۔

۲) فضلِ عمر فاؤنڈیشن قائم فرمایا۔ ۲۵ لاکھ روپیوں کا مطالبہ کیا۔ جماعت نے والہانہ لبیک کہتے ہوئے ۳۶ لاکھ کی رقم فراہم کر دی۔ اُس رقم سے فضلِ عمر لائبریری کا قیام عمل میں آیا اور گراں قدر وظائف کا اعلان کیا گیا تا کہ لوگوں میں تحریر اور مقالہ نگاری کا شوق پیدا ہو۔ ایک ایک ہزار کے پانچ انعامات کا اعلان ہوا۔

۳) تعلیم القرآن تحریک کا اعلان ہوا کہ جماعت کا کوئی فرد ایسا نہ رہے کہ قرآنِ کریم ناظرہ پڑھنا نہ جانتا ہو۔ پھر ناظرہ جاننے والے ترجمہ سیکھیں اور ترجمہ جاننے والے تفسیر کا درس لیں اور مہارت حاصل کریں اور قرآنی معارف سے آگاہ ہوں۔

۴) وقفِ عارضی کی تحریک شروع ہوئی۔ جس میں جماعت کے مختلف افراد دو سے چھ ہفتوں تک اپنے شہر سے باہر اپنے ذاتی خرچ پر جائیں اور تربیت اور قرآنِ کریم پڑھانے اور تبلیغ کا کام کرنے کی سعی کریں۔

۵) پانچویں نمبر پر مجلس موصیان کا قیام ہے۔ موصیوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں میں تعلیم القرآن کا نظم اور نگرانی کریں۔ اُن کے گھر میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہے جو قرآنِ کریم پڑھنا نہ جانتا ہو۔

۶) چھٹے نمبر پر بدرسوم کو ترک کرنے کی تحریک ہے۔ آج غیر احمدی مسلمانوں کا حال جو بد رسوم کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں، سب کے سامنے ہے۔ تعلیم میں پیچھے، دین اور دنیا میں

پیچھے، مختلف لعنتوں میں گرفتار، اور رسومات کا اُن پر اتنا غلبہ ہے کہ گویا اُن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں کہ ذلت کے باعث لوگوں کے سامنے گردنیں ہمیشہ جھکی رہتی ہیں کیونکہ قرض کی مغلوبیت نے گردن اٹھا کر چلنے کی عادت اُن سے چھین لی ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں یعنی رسومات سے فرار چاہتے ہیں لیکن فرار ممکن نہیں کیونکہ بیوی بچے مجبور کرتے ہیں کہ وہ سب رسومات جو رائج ہیں، بجالائیں ورنہ معاشرے میں بے عزتی کا خیال جینے نہیں دیتا۔

۷) ساتویں تحریک چندہ وقفِ جدید اطفال کی ہے۔ ہر احمدی طفل کے لئے لازم ہے کہ وہ پچاس پیسے ماہانہ وقفِ جدید کا چندہ ادا کر کے رسید حاصل کرے اور اپنے ماں باپ کو وہ رسید لا کر دکھائے اور بچپن ہی سے جماعت کے مالی نظام میں شامل رہنے کی اُسے عادت پڑ جائے۔

۸) آٹھواں کام تسبیح وتحمید اور درود شریف کا بالِالتزام وِرد کرنا ہے۔ ہر بالغ شخص روزانہ دو سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم ۔اللّٰھم صل علیٰ محمد وّاٰل محمد کا وِرد کرے اور کم از کم سو مرتبہ استغفار پڑھنا عادت بنالے۔ ۱۵ تا ۲۵ سال کی عمر والے لوگ ایک سو بار تسبیح اور ۳۳ مرتبہ استغفار کا وِرد کریں۔ اسی طرح ۷ سے ۱۵ سال کی عمر والے ۳۳ مرتبہ تسبیح اور گیارہ بار استغفار پڑھیں۔ اور سات سال سے کم عمر بچوں کو مائیں ۳ بار تسبیح اور ۳ مرتبہ استغفار پڑھائیں۔

۹) نُصرت جہاں ریزروفنڈ اسکیم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۶۷ء میں حضور نے بہت سے یوروپین ممالک کا دورہ کیا۔ ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں نُصرت جہاں مسجد کا افتتاح کیا ۔یورپ والوں کو آنے والی تباہیوں کے متعلق اِنذار فرمایا۔ پھر مغربی افریقہ کے سات ملکوں کا دورہ کیا اور وہیں الٰہی منشاء کے مطابق آپ نے ایک خصوصی پروگرام کا اجراء فرمایا اور اُس کا نام

رکھا ''**لیپ فارورڈ پروگرام**'' اِس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک لاکھ پاؤنڈ کا نُصرت جہاں ریزروفنڈ اسکیم کا اعلان کیا۔ اِس پروگرام کا مقصد افریقہ میں اسلام اور احمدیت کی تحریک کا قیام اور استحکام ہے۔ اِس فنڈ سے بہت سے تعلیمی مراکز کھولے گئے۔طبی امدادی ادارے قائم کئے گئے۔ایک بڑا پریس قائم کیا گیا۔میڈیکل سنٹرز کھولے گئے تھے اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔نئے اعداد و شمار ہمیں دستیاب نہیں ہو سکے اس لئے پرانی تفصیلات یہاں دی جارہی ہیں۔

غانا میں چار میڈیکل سنٹر اور چھ سیکنڈری اسکول۔لائبیریا میں ایک میڈیکل سنٹر اور ایک سیکنڈری اسکول۔گیمبیا میں پانچ نئے میڈیکل سنٹر اور سیرالیون میں چار میڈیکل سنٹر اور چھ سکنڈری اسکول۔

۱۰) دسویں اسکیم سوسالہ جوبلی فنڈ اسکیم کی بنیاد تھی۔جماعتِ احمدیہ کا قیام ۱۸۸۹ء میں عمل میں آیا تھا۔اِس پر پورے سو سال ۱۹۸۹ء میں ہونے والے تھے۔بہت ہی شاندار پیمانے پر یہ جشنِ تشکر منانے کا پروگرام رکھا گیا تھا، جو ۱۹۸۹ میں منایا گیا۔ساری دنیا میں اِس کی دھوم مچی۔

آپ کا دورِ خلافت اندرونی اصلاحات، بیرونی فتوحات اور دشمنوں ہی سے نہیں بلکہ حکومتِ پاکستان سے پنجہ آزمائی کا دور تھا۔جس میں فتح و نصرت نے آپ کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ رکھا تھا۔لیکن واقعات اکثر و بیشتر انسانی اِرادوں سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔لیکن اور تعصب کا زہر مخالفوں پر ہی مؤثر ہوا۔ہم تو ہر طرف آواز دیتے رہے اور نیک فطرت آتے اور جمع ہوتے گئے۔لوگ آتے رہے اور کارواں بنتا رہا۔دشمنوں کے پاؤں تلے زمین کھسکتی اور کم ہوتی اور ہمارے قدموں تلے پھیلتی اور وسیع ہوتی ہوتی آج احمدیوں کی تعداد کروڑوں میں

ہوچکی ہے۔اُس وقت احمدیت کا نفوذ اور دخل دنیا کے ۵۴ ممالک میں تھا اور آج بڑھکر ۲۱۰ ممالک کو اپنے حلقے میں لے چکا ہے۔ بظاہر حکومتِ پاکستان نے احمدیوں کو اپنی اسمبلی میں کافر قرار دلوا کر اور دنیا بھر میں پروپگنڈہ اور جھوٹ کے ذریعہ احمدیوں کو کافی زک پہونچائی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ ثالث کی اندرونی اصلاحات، نظامِ جماعت کے استحکام کی صورت گری کا نقطہ آغاز تھی۔ یہ تصویر وقت اور ماحول کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہی، لیکن اُسی فریم میں قید رہی جو قرآن نے روحانی وتمدنی زندگی کے لئے بنایا تھا۔ جماعت کی وحدت اور اپنے پیدا کرنے والے پر مضبوط ایقان جماعت کے پیشِ منظر میں نمایاں اور کھلا کھلا نظر آنے لگا تھا۔

اسمبلی میں کئی دنوں تک آپ کا آنا جانا اور اپنے دلائل کے جھنڈے گاڑنا، مخالف علماء کے سوالات اور طنزیات کا اُصولی اور پُروقار انداز میں فاتحانہ جوابات دینا، اُن شانوں کو مضبوط بنا رہا تھا۔جنہوں نے آئندہ جماعت کا بوجھ سہارنا تھا۔

بعض لوگ عہدِ خلافتِ ثالثہ اور عہدِ خلافتِ رابعہ کا موازنہ کرنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں الٰہی سلسلوں میں اِس قسم کے موازنہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ خلافتِ احمدیہ رابعہ، خلافتِ احمدیہ ثالثہ کی تتمہ تھی۔ جس طرح خلافتِ ثالثہ، خلافتِ ثانیہ کی تکملہ تھی۔ الٰہی سلسلوں میں ایک دور کو دوسرے دور سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ خلیفہ ثالث ابتداء ہی سے خلیق وکریم اور عوام الناس کے لئے نہایت ہمدرد اور اُن کے غموں اور دکھوں پر بے چین ہوجانے والوں میں سے تھے۔ لیکن شریعت کی حدود کے بارہ میں سخت نگران اور کسی بھی قسم کی رُورعایت کے قائل نہیں تھے۔ سراپا نور، ہر حرکت اور سکوت باوقار، لہجہ بردباری سے مملو، شخصیت سحر انگیز، جماعت کے لئے کامیابیوں کے نقیب اور ساری دنیا کے لئے خوشگوار اُمیدوں اور آرزوؤں کو اپنے جلو

میں لئے ہوئے۔ ہزاروں لوگوں نے آپ کی دعاؤں سے فیض پایا۔آپ دنیا کے امن کے لئے ایک تعویذ تھے۔

آپ کا دورِ جُود ورحمت اس لحاظ سے بھی یادگار رہے گا کہ سویڈن کی شاندار مسجد واقع گوٹن برگ کا افتتاح آپ ہی کا مرہونِ منت تھا۔ جون ۱۹۷۸ء میں صلیبیوں کے شہر لندن میں آپ نے کسرِ صلیب کانفرنس منعقد کروائی جس میں خود آپ نے ایک معرکۃ الآراء لیکچر دیا۔ دنیا بھر سے مختلف محققین نے اپنے قیمتی ترین مقالے پڑھے جن سے ثابت ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب صلیب سے اُتارے گئے تو زندہ تھے۔اوسلو کی مسجدِ نور آپ ہی کے دور کا کارنامہ ہے۔مسجد نور ناروے کی پہلی اور بلحاظِ ترتیب یورپ کی آٹھویں مسجد ہے جس کا افتتاح آپ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جون تا اکتوبر ۱۹۸۰ء کے دورۂ یورپ کے دوران آپ نے اِسپین پیدروآباد میں عظیم الشان مسجد ''مسجد بشارت'' کا سنگِ بنیاد رکھا جو آپ کی زندگی ہی میں تکمیل ہوگئی۔ یہ شاندار مسجد قرطبہ سے ۲۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۷۴۴ سال بعد تعمیر ہونے والی یہ پہلی مسجد ہے۔ جو یورپ میں تعمیر ہوئی۔ برطانیہ میں پانچ نئے تبلیغی مراکز قائم ہوئے۔مسجد بشارت کے سنگِ بنیاد کے موقعہ پر خطاب فرماتے ہوئے آپ نے وہ عظیم نعرہ جماعتِ احمدیہ کو دیا جو اَب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔'' Love for all, Hatred for none'' یعنی محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں۔

چودھویں صدی نے ہمیں بے شمار تحفے بخشے۔ایک تو ہمیں خدا سے ملادیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسن و اِحسان کے جلوے ہم نے دیکھے اور قرآنِ مجید کی عظمت ہم پر واضح ہوئی۔ چودھویں صدی نے اسلام کا تنزل دیکھا تو وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی نے زندہ خدا کے ساتھ زندہ تعلق ہمیں نصیب فرمایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

ہمارے دلوں میں گاڑ دی۔ پندرھویں صدی کے آغاز پر اِس صدی کو غلبہ اسلام کی صدی بنانے کے لئے بے حساب دعائیں کیں اور بہت صدقات دئے گئے۔ یکم محرم الحرام ۱۴۰۱ ہجری سے ۷رمحرم تک ۱۰۱ بکرے صدقہ دئے گئے۔

غلبہ اسلام کی بے شمار دعائیں مانگی گئیں جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ تعلیمی منصوبے بنائے گئے اور اُن کی کامیابی کے لئے تگ و دَو جاری ہے۔ قرآنِ مجید کی عالمی اشاعت اور مختلف زبانوں میں ترجموں پر بہت مفید کام ہوئے اور یورپ و امریکہ کے تمام بڑے شہروں کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں قرآنِ مجید کے نسخے رکھوائے گئے۔

ربوہ میں آخری خطبہ جمعہ آپ نے ۲۱رمئی ر ۱۹۸۲ء کو دیا۔ ۲۳رمئی ر ۱۹۸۲ء کو آپ اسلام آباد تشریف لے گئے۔ ۲۶رمئی کو آپ علیل ہوئے۔ بروقت علاج سے طبیعت سنبھل گئی۔ لیکن ۳۱رمئی ر ۱۹۸۲ء کو آپ پھر علیل ہو گئے۔ دل کا شدید حملہ ہوا۔ طبیعت علیل ہی رہی ۸ اور ۹رجون ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب قلب پر دوبارہ حملہ ہوا جو نہایت شدید تھا۔ قضائے الٰہی پوری ہوئی۔ رات پون بجے بیت الفضل اسلام آباد میں آپ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ۹رجون ر ۱۹۸۲ء کو جنازہ اسلام آباد سے ربوہ لایا گیا اور ۱۰رجون بعد نمازِ عصر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ افراد کی موجودگی میں آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپ کا جسمِ اطہر حضرت مصلح موعودؓ کے پہلو میں جانبِ مشرق بہشتی مقبرہ میں سپردِ خاک ہوا۔ آپ کی عمر ۷۳ سال تھی۔

۲۲راکتوبر ر ۲۰۰۵

(52)

علم دولت ہے

''علم مؤمن کی گم شدہ متاع ہے، جہاں پڑی ملے اُٹھالے''

چودہ سو سال قبل کہے گئے یہ الفاظ ایک نبیءاُمّی کی زبان سے ادا ہوئے تھے، کتنے معنی آفریں اور صداقت سے لبریز ہیں۔ یہ الفاظ کہ بے اختیار دل سے اُس معصوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے درود وسلام کے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔ آج اُس نبی معصوم کے ماننے والے مسلمان اپنی کم فہمیوں اور کوتاہ نصیبیوں کے سبب دہشت گرد اور جہل و گمراہی کے نقیب کہلوایا جانا باعثِ فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ''علم حاصل کرو خواہ چین جا کر حاصل ہو'' ایک اور موقعہ پر فرمایا ''اگر کسی کے دو یا تین بیٹیاں ہوں اور وہ اُنھیں علم کے زیور سے آراستہ کر کے اُن کے گھر بسادے تو مَیں اُسے اِسی دنیا میں جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ اِس سے عورتوں جیسے کمزور طبقہ کے لئے بھی علم کی قدر و قیمت اور فیض نصیبی کی اہمیت واضح ہے۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کی شومیٔ قسمت پر جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ قرآنِ کریم کی پہلی وحی ہی تعلیم اور تعلّم سے معنون ہے اور آگے سارا قرآن ہی انسان کی تعلیم و تربیت اور اُس کے جسمانی و روحانی فروغ سے پُر ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمان قرآن کے عُلوم سے اپنے سینے اور ذہن و فہم بھر کر ساری دنیا میں پھیل گئے تھے اور ہر محروم کو اِن خزانوں سے جھولیاں بھر بھر کر لُٹا رہے تھے، لیکن جیسے ہی اِس نعمتِ عظمٰی اور کارِ خیر سے انھوں نے اپنے ہاتھ کھینچے، اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کو، جنھوں نے اسلام کی طرفداری نہ کرتے ہوئے بھی اسلام کے اُصولوں اور اُس

کی صداقتوں کا عملی رنگ میں خیر مقدم کیا اور اُن دائمی صداقتوں سے اپنی زندگیوں میں تمدن کے رنگ بھرے، تو اسلامی رہنما اُصولوں کے مُشکِ ختن سے اُن کے گھروں اور ماحول کو ان دیکھی اور ان محسوس خوشبوؤں سے بھر دیا اور اُن کے روشن چہرے اُن خوشبوؤں سے تروتازہ اور مالا مال ہیں۔ انسانوں کی بلاتفریق قوم ورنگ ونسل اُنھوں نے خدمت کی اور حقوق العباد کی فرض شناسی کے نتیجے میں اپنے دامن عطائے خداوندی سے بھر لئے۔

جس علم پر آج مغربی دنیا نازاں ہے، وہ سترھویں صدی کے آخر کی دین ہے، ورنہ جہل اور تاریکی میں اُن کا سفر بہت لمبا تھا، اِس کی مثالیں اُس وقت کے تاریخی واقعات میں صاف نظر آتی ہیں۔ ۲۲ / جون / ۱۶۳۲ء کو روم کے بڑے گرجا گھر میں گلیلیو کو اِس جرم میں پیش کیا گیا تھا کہ وہ انجیل مقدس کی تعلیمات کے خلاف یہ نظریہ پیش کرتا تھا کہ زمین گول ہے اور سورج کے اطراف گردش لگاتی ہے۔ اُسے اِس شرط پر معافی دی گئی تھی کہ وہ آئندہ اِس قسم کے نظریات کے پرچار سے احتراز کرے۔ اُس نے گھٹنوں کے بل جھک کر اقرار کیا تھا کہ آئندہ وہ اپنی تعلیمات کو عام نہیں کرے گا۔ گلیلیو دوربین کا موجد ہے۔ اُسی کے ذریعہ اُس نے تجربہ کیا تھا کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے۔ یہ وہی نظریہ تھا جسے پولینڈ کے سائنسدان کوپر نیکس COPERNICUS نے پیش کیا تھا لیکن اہلِ کلیساء کی سخت مخالفت کے پیشِ نظر اپنی سرگرمیاں مخفی رکھنی پڑی تھیں۔ اور جب اُس کے ایک شاگرد بُرونو نے علانیہ اِس نظریہ کو پیش کرنا شروع کر دیا تو اہلِ کلیساء نے اُسے زندہ آگ میں جلا دیا۔ اٹلی کے اِس پروانہ علم علامہ بُرونو کو اِس جرم میں پکڑا گیا تھا کہ تعدّدِ عوالم کا قائل ہے اور عدالت نے فیصلہ کر دیا کہ اِس شخص کو نہایت نرم سزا سنائی جائے اور خیال رکھا جائے کہ خون کی ایک بوند بھی زمین پر نہ گرنے پائے۔ چنانچہ بے گناہ علامہ کو جیتے جی آگ میں جھونک دیا گیا۔ علامہ نے جب یہ سفا کانہ حکم

سنا تو عدالت کو مخاطب کر کے کہا ''یقین کرو تمہارا حکم سُن کر میرے دل پر اُس خوف کا عُشر عشیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دلوں میں اِسے صادر کرتے وقت ہوگا'' ۱۶ رفبروری ر ۱۶۰۰ء کو اِس لائق ترین عالم کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ کلیساء کے ایسے ہی مسلسل اور متواتر مظالم پر بگلیار عیسائی چیخ اُٹھا تھا اور اُس کی چیخ کو تاریخ نے محفوظ کر لیا تھا کیونکہ اَن گنت دلوں کی آہ تھی۔ ممکن نہیں کوئی شخص مسیحی ہو اور اطمینان سے اپنی موت مرے''۔ اسکندریہ (مصر) میں علم کا دِیا جلے ہی جا رہا تھا، علم کی دھندلی سی یہ شمع ایک عورت ہائی پیشیا کے دَم سے فروزاں تھی۔ ہائی پیشیا اپنے وقت کی علاّمہ تھی۔ اُس کے بیت الحکمت (ڈیوڑھی) پر اُمراء اور اعیان کی رتھوں کا ہجوم رہتا تھا اور اسکندریہ کے ادنیٰ و اعلیٰ سبھی اُس کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ مسیحیت اِس عورت کا وجود بھی برداشت نہ کر سکی۔ ایک دن ہائی پیشیا اپنے مدرسے جا رہی تھی کہ پادریوں اور اُن کے پیرو غوغائیوں نے اُس کا پیچھا کیا اور بیچ بازار میں اُس کے کپڑے پھاڑ کر اُسے بالکل برہنہ کر دیا۔ پھر گھسیٹتے ہوئے ایک گرجا میں لے گئے اور وہاں مُقدس عصائے پطرس کی مُسلسل ضربوں سے اُس کا سر پاش پاش کر دیا۔ اُس کی لاش کے ٹکڑے کر دئے۔ اُس کے گوشت اور پوست کو سیپّیوں سے چھیلا گیا اور ہڈیاں آگ میں جھونک کر بھسم کر دی گئیں۔

اِس واقعہ کے ساتھ ہی اسکندریہ سے یونانی فلسفہ کا چرچا بھی اُٹھ گیا۔ جب عیسائی عربی عُلوم کی یلغار کو جو اسپین اور سسلی سے پھیلی تھی، روک نہ سکے تو یورپ نے ۱۴۷۸ء میں مجالس تفتیش و احتساب (ENQUISITION) قائم کر دیں۔ جس آدمی پر بھی شبہ ہو جاتا کہ دل میں نورِ علم رکھتا ہے فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ جُرمانے، عمر قید اور قتل سے لے کر زندہ جلا ڈالنے تک کی سزائیں اُسے دی جاتیں۔ پوپ نے فرمان جاری کیا کہ ہر مسیحی اپنے حلقہ کے

پادری کے سامنے روزانہ اپنے گناہوں، برے خیالات اور خلافِ مذہب معلومات کا اعتراف کرے، نتیجہ یہ نکلا کہ بیوی اپنے شوہر کی اور شوہر اپنی بیوی کا، باپ بیٹے کا، اور بیٹا اپنے باپ کا اور بھائی بھائی کا جاسوس بن گیا۔ جو کوئی کسی بات کو خلافِ مذہب سمجھتا، پادری کے پاس مخبری کر دیتا اور وہ شخص بغیر کسی تحقیق کے محکمہ اِحتساب کے چُنگل میں پھنس جاتا۔

ظُلم کی بنسی ہمیشہ نہیں بجتی اور کبھی نہ کبھی ٹوٹ جاتی ہے۔ علم کے دیوانے پادری بھی اِس کفر کے الزام میں گرفتاریوں سے بچ نہیں سکے۔ وہ کیتھولک عقائد سے بیزار اور پروٹسٹنٹ ہونے کا اعلان کرنے لگے۔ پروٹسٹنٹ ہونا اُس زمانے میں صریح کفر تھا۔ کریمرمُر کو دو بہت بڑے پادریوں لٹیمر اور ریڈلے کے ساتھ اِسی کفر کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ آزمائش کے پہلے مرحلے میں کرین مُر کمزور ثابت ہوا اور توبہ کر کے جان بچالے گیا۔ لیکن ضمیر کی زَجر وتوبیخ نے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ آخر توبہ توڑ کر اعلان کر دیا کہ مَیں پروٹسٹنٹ ہوں اور پروٹسٹنٹ ہی مروں گا۔ دوبارہ پکڑا گیا اور آگ میں جھونک دیا گیا۔ جب اُسے جلانے لگے تو اُس نے اپنا دایاں ہاتھ یہ کہتے ہوئے آگ کے سپرد کیا کہ یہی وہ گناہ گار ہاتھ ہے جس سے مَیں نے غلط اور بزدلانہ توبہ نامہ لکھا تھا۔ اُسی موقعہ پر لیٹمر نے اپنے ساتھی ریڈلے سے کہ، ریڈلے! ہمیں یہ کام مردانہ وار کرنا چاہئے۔ آج ہم خدا کے فضل سے انگلستان میں وہ شمع روشن کر کے جا رہے ہیں جو ہمیشہ فروزاں رہے گی اور کبھی نہیں بجھے گی۔

گلیلیو نے کوپرنکس کے کام کو آگے بڑھایا، دوربین کی مدد سے اُس نے پہلی بار چاند پر پہاڑ اور غار دریافت کئے۔ یہی نہیں بلکہ اُس نے مشتری کے چار چاند بھی دیکھ لئے جو مُشتری کے گرد اِسی طرح گھومتے ہیں۔ جیسے چاند زمین کے گرد۔ مزید برآں اُس نے زُحل کے محل وقوع کا پتہ چلایا اور اُس کے حلقوں کا اپنی آنکھ سے مُشاہدہ کیا اور اِس طرح گلیلیو نے

کو پرنکس COPERNICUS کے نظریہ کی اپنے تجربے اور مُشاہدے سے توثیق کردی۔ گو کہ مقدمہ چلا کر اُس کی زبان بند کردی گئی مگر یہ نظریہ اِس تیزی سے پھیلا کہ تسلیم کرلیا گیا اور پاپائے اعظم نے اُسے مسیحی عقائد میں شامل کرلیا۔

آج مغربی اقوام کی ترقی میں اِسلام کی تحریکات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جس دوراورزمانے میں یہ خوابِ غفلت سے دوچار تھیں۔ اسلام اپنی روشنی اور روشن خیالی و نیز انسانیت نوازی کے جھنڈے گاڑ چکا تھا۔ اِن قوموں نے اسلام سے وہ کچھ سیکھا ہے جسے اہلِ اسلام فراموش کرچکے ہیں۔قومِ اسلام کا دبدبہ اور اُن کی سلطانی اُن کے قرآن وسنت پر عمل آوری سے معنون تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ سورۂ جمعہ میں وعدہ کیا تھا کہ وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورۃ الجمعۃ:۴) کہ آخرین میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگی جن کی تربیت انھیں اُصولوں پر ہوگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی تربیت کے لئے برتے تھے۔وہ جماعت تیار ہوچکی ہے۔اُن کی تربیت اور نگرانی روز افزوں ہے۔ جو اُن سے مُنسلک ہوتے ہیں۔اپنی گم شدہ میراث سے حصہ لے رہے ہیں۔علم ہفکر وفہم اور دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا اُن کا عہد صحابہ اوّلون سے انھیں ملا چکا ہے۔ایک ذہنی اور فکری وعملی انقلاب جو اُن کا مقدر تھا وہ اپنے نشانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔خدا تعالیٰ کی نصرتیں اُن کے شاملِ حال ہیں۔وہ ایک جماعت سے وابستہ ہیں۔اُن کا ایک واجب الاحترام خلیفہ اُن کی نگرانی اور راہنمائی کے لئے اُن میں موجود ہے اور وہ دن دور نہیں بلکہ قریب ہیں کہ اسلام اور احمدیت کا پھریرا پھر سے دنیا میں لہرانے لگے اور تمام اقوام عالم اُسے بنظرِ استحسان دیکھنے لگیں۔اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا تھا کہ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ہر چیز پر غالب اور حکمت والا ہے۔یعنی جس انقلاب کا وعدہ کیا جارہا ہے۔بظاہر بہت دور دھندلکوں میں نہاں ہے۔بظاہر

ناممکن نظر آتا ہے تو فرمایا تھا کہ تمہارے خدا کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ غالب اور حکیم بھی ہے جب اُسکا وقت آئے گا اور اُس کی حکمت چاہے گی وہ نظام برپا ہوجائے گا اور دنیا حیران رہ جائے گی۔

۳۰/اگست/۲۰۰۶

(53)

تبلیغ

تبلیغ کے معنیٰ ہیں، دوسروں کو پہنچانا۔ مذہبی اصطلاح میں جو الٰہی پیغام اور انسانیت کی بقا اور ترقی کے لئے جو روح پرور اور جانفزا اُصول ہمیں عطا ہوئے ہیں، اُنھیں دوسروں کے فائدہ کے لئے اور دوسروں کو نقصان سے بچانے کے لئے، اُن تک پہونچانا۔ دنیا میں کوئی بھی مذہب اور کوئی بھی دینی جماعت جب تک تبلیغ کو اپنا مشعلِ راہ بنائے رکھتی ہے، ترقی کرتی ہے۔ گزشتہ گیارہ سو سال جو مسلمانوں پر تنزل اور ادبار کے گزرے ہیں، وہ محض تبلیغ کا سبق بھلا دینے کا نتیجہ تھے۔ آج حضرت مسیح موعود اور مہدی معہود علیہ السلام کے ذریعہ سے جو نیا علمِ کلام ہمیں نصیب ہوا ہے، اُس کو دوسروں تک پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ وہ نیا علمِ کلام کیا ہے؟ وہ ہے ایک منظم اور تبلیغی جماعت کا قیام۔ اِس جماعت کے قیام کے لئے کیا ضروری ہے؟ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یقین کرلیں کہ دنیا اسلام کی ترقی خواہ اب ہو، یا آئندہ، ہمیشہ مامور من اللہ کی محتاج ہے۔ آج بھی اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کے لئے بہت سی جماعتیں کام کر رہی ہیں اور پہلے بھی کرتی رہیں۔ اُن میں سے بعض اپنی نیتوں اور اسلام کی محبت کے لحاظ سے مخلص بھی تھیں، مگر اُن کا قیام محض اپنے علماء کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر عمل میں لایا گیا تھا، یا پھر روپیہ اور دولت کے بھروسے پر۔ اُن کے لیڈروں میں کوئی بھی اللہ سے راست یا بالواسطہ تربیت یافتہ نہیں تھا، اس لئے اُن کی کوششیں بارآور نہیں ہوسکیں اور انجام اُن کا ناکامی رہا۔ گزشتہ تیرہ صدیوں میں جو مجدد دین اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق آتے رہے ہیں،

انھوں نے یقینا کام کیا اور اپنے وقتوں میں کامیاب بھی رہے۔ چودھویں صدی جب قریب آئی اور زمانہ پھر اللہ والوں سے خالی ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی غیرت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جوش میں آئی اور اسلام کی راہ نمائی کے لئے اُس نے ایک شخص کو مسیح ومہدی کے نام سے مامور بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے مقابلے پر ساری دنیا کے مسلمانوں نے زور لگایا کہ اُسے مٹا دیں، لیکن بڑے بڑے دعویدار تباہ و برباد ہوئے اور آج گمنامی اُن کا نصیب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا لگایا ہوا وہ پودا آج ایک تناور درخت بن چکا ہے اور اُس کی شاخیں آج دنیا کے دوسو چار (204) ملکوں پر اپنا سایہ کئے ہوئے ہیں۔

تبلیغ کے کام کا دوسرا پہلو جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علمِ کلام سے جو ہمیں نصیب ہوا ہے، وہ اُس ھوّا اور افواہ سے لوگوں کو باہر لانا ہے، جو انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ اور آسمان پر بیٹھا ہوا سمجھ کر گھڑا ہوا ہے۔ یہی غلط فہمی ہے جس نے ایک صدی قبل لاکھوں مسلمانوں کو عیسائیت کے دروازے پر سجدہ ریز کر دیا۔ اِسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ابتداء میں ہی یہ نعرۂ تمہیں دیا کہ ''عیسیٰ کو مرنے دو، اِسی میں اسلام کی زندگی ہے''

تیسرا پہلو نبوت کے اجراء سے تعلق رکھتا ہے نبوت اللہ تعالیٰ کا فضل اور ایک بہت بڑا اِنعام ہے۔ جو مسلمانوں کو خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہمیں عطا ہوا، یہاں نبوت کے خاتمے سے مراد شریعت والی نبوت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی ہے اور قیامت تک آنے والے زمانوں کے لئے قرآنِ مجید کی صورت میں محفوظ ہے اور اِس میں ایک شعشہ یا ایک زیر وزبر کی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ چودہ سو سالوں سے وہ مسلمانوں کی تمام ضرورتوں کی کفیل ہے اور ہر زمانے میں ضرورت کے مطابق نئے نئے نکات اور معرفت

کے نئے نئے خزانے اُس میں سے ابلتے رہتے ہیں اور تشنہ کام اُن سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ رہا مقامِ نبوت جو شریعت سے عاری ہے، اُس پر بھی یہ شرط کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں ہو اور آپ کی تصدیق کے بغیر نہ ہو، اور آپ کے عظیم روحانی فیضان کا مظہر ہو، وہ اب بھی جاری ہے اور اُس کا بند کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان اور افاضہ کو بند کرنا ہے۔ اگر آپ کا یہ فیضان بند سمجھا جائے تو آپ کی فضیلت اور تمام نبیوں کی سرداری اور انسانوں میں سے آپ کا انسانِ کامل ہونا وغیرہ باتیں محض دعویٰ اور ڈھکوسلہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اسلام کے زندہ مذہب ہونے کا ثبوت ہی حضور کے فیضان کے اِس دروازے کے کھلا رہنے میں مضمر ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام پہلے شخص ہیں، جنھوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام کا خدا زندہ ہے، اسلام کا رسول محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ رسول ہے جو زندہ ہے، اور اسلام کی کتاب قرآنِ کریم ہی وہ بزرگ کتاب ہے جو اپنی زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ زندہ خدا سے مراد خدا تعالیٰ کا وہ رابطہ ہے جو انسانوں سے وحی اور الہام کے ذریعہ آج بھی قائم ہے۔ مگر اب وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کے ساتھ مشروط ہے اور پھر رسول اللہؐ کے ماننے والوں میں بھی صرف افرادِ جماعت احمدیہ کے ساتھ۔ وہ اس لئے کہ عام مسلمانوں نے جو رسول اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، آپ کے صریح اور ضروری حکم کا جو مسیح و مہدی کے قبول کرنے سے تعلق رکھتا تھا، انکار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کر چکے ہیں اور اُس ہتک کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام جسے وحی والہام کہا جاتا ہے، اُن سے چھن چکا ہے۔ وہ اپنے خدا کے زندہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتے، مگر جماعتِ احمدیہ آج بھی اس انعام سے فیضیاب ہے اور خدا کے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کیلئے ہر وقت تیار ہے۔ زندہ رسول کا

دعویٰ بھی نِرا دعویٰ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، آپ کے توسط سے اور آپ کی امت میں ہوکر اور آپ کی غلامی کا ثبوت دے کر آج بھی آپ کے فیضان نبوت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور وہ فائدہ اِس وقت صرف جماعتِ احمدیہ کو حاصل ہے اور وہ اپنے اِس دعوے میں کہ اسلام کا رسول ایک زندہ رسول ہے، بالکل سچی ہے اور دعویٰ کے ساتھ ثبوت اور دلیل بھی رکھتی ہے۔ اسی طرح اور اُنھیں کے لئے زیبا ہے کیونکہ یہی ایک جماعت جس نے فی زمانہ قرآنِ کریم کے ایسے نکات اور معرفت کے ایسے ذرائع اور اُس کی تفسیر کے ایسے پیارے پیارے موتی دنیا کے سامنے بکھیر دئے ہیں، جن کی نظیر ملنی مشکل ہے اور جن کے پیش کرنے سے آج دنیا کے سارے علماء جو اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، عاجز اور بے بس ہیں، اس مختصر مضمون میں اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں، ورنہ تبلیغ کا مضمون بڑا ہی وقیع اور وسیع ہے اور تبلیغ کا سب سے مؤثر اور طاقتور ذریعہ اپنے آپ میں کردار واخلاق کی ایسی پاک تبدیلی چاہتا ہے جو ساری دنیا کی آنکھیں چکا چوند کردے۔ (والسلام)

۱۹۹۶/۱۱/۲۶ء

(54)

تربیتِ اولاد

تربیت، اولاد کی ہو یا کسی اور شخص کی، دراصل کارِنبوت سے ہے۔ نبی کا کام یہی تو ہے کہ لوگوں کو جو فطری طور پر بہیمیت سے یعنی حیوانوں کی صفات اور عادات سے مملو ہوتے ہیں، حیوانی حالتوں سے علیحدہ کر کے انسانیت کے قریب لایا جائے۔ جب وہ انسانی صفات کے مظہر بن جائیں تو پھر اُن میں روحانیت کی روح پھونکیں جو ''مناجات'' دعاؤں اور الٰہی توجہ کے مطلوبہ کام کے بغیر ممکن نہیں۔ جب آہستہ یا بہ دیر یہ عادت پختہ ہو جائے تو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ خدائی قُرب کی تڑپ یقینی ہوتی جاتی ہے اور آخر خدانمائی کا درجہ آ جاتا ہے۔ اسی کا نام یقین کامل ہے اور ترقی کر کے یہی مقام نفسِ مطمئنہ تک پہونچاتا ہے۔

احمدیت کی تعلیم یہ ہے کہ بچوں کو بچپن سے محنت کی عادت ڈالی جائے، اپنے ہاتھ سے کام کرنا فطرت بن جائے۔ دوسری تعلیم سچ بولنے کی عادت ڈالی جائے، جھوٹ کسی صورت بھی جائز نہ سمجھیں۔ تیسری تعلیم، نمازوں کی عادت اور پابندی ہے۔ یہ تین ابتدائی گُر ہیں جو آگے چل کر بہت سی حسین عادتوں کو پیدا ہونے میں مدد کرتے ہیں۔ بچوں کو غلطی پر سزا دینا بلا اور عذاب نہیں بلکہ سراسر رحمت کا خزانہ ہے، بچوں کو ابتداء سے یہ تعلیم دی جانی چاہئے کہ غلطی کریں تو سزا کو بھی جھیلنے کے لئے تیار رہیں۔ سزا کو بلا اور عذاب نہ سمجھا جائے۔ اگر یہ چیز بے فائدہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ صرف رحیم و کریم ہوتا۔ قہار و جبار نہ ہوتا۔ شدید العقاب اور شدید البطش نہ کہلاتا۔ ذہانت کے لئے جہاں محبت ضروری ہے، وہاں بروقت سزا بھی لازم ہے۔ ذہانت کے

لئے خوف بھی ضروری ہے۔ دعا کرتے وقت صفاتِ الٰہیہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ اسی سے خدا کی مزاج دانی پیدا ہوتی ہے۔ بعض لوگ دعا کرتے ہیں کہ اے رحیم و کریم خدا میرے فلاں دشمن کو تباہ کردے۔ ہلاک کردے تو خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ تم میری صفات رحیم و کریم سے مجھے یاد کررہے ہو، اُس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مَیں تمہارے دشمن پر رحم و کرم فرماؤں اور اُسے معاف کردوں۔ جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ۔ اللہ اکبر کہتے ہیں۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نہیں کہتے۔ احمدی بچوں کو سمجھانا چاہئے کہ جب تم سے غلطی سرزد ہو تو سزا بھگتنے کے لئے بھی تیار رہو۔ اِس سے ذہانت بڑھتی ہے اور جب ذہانت زیادہ ہوتی ہے تو علم لدنّی بھی ترقی پذیر ہوتا ہے۔ ذہانت کے نتیجے میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔ بچپن میں سبق آموز کہانیاں سنانا اور بیان کرنا بھی تربیت کا ذریعہ ہیں۔

بچے میں جب وقتِ تمیز کے آثار پیدا ہوں، اُس کی دیکھ بھال شروع ہوجانی چاہئے۔ سب سے پہلے اُس میں غذا کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ شروع میں سکھانا چاہئے کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ دسترخوان پر جو کھانا سامنے اور قریب ہو، اُس طرف ہاتھ بڑھائے۔ جو لوگ ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، اُن پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ کھانے کی طرف یا کھانے والوں کی طرف نظر نہ جمائے۔ جلد جلد کھائے۔ نوالہ اچھی طرح چبائے۔ ہاتھ اور کپڑے کھانے سے آلودہ نہ کرے۔ زیادہ خوری کو معیوب ثابت کیا جائے۔ کھانا کم کھائے اور معمولی سے معمولی چیز بھی ہو تو شوق سے کھائے۔ دوسروں کو کھانا کھلانا یا اپنی پسندیدہ چیز تحفۃً دے دینا وغیرہ اس وصف کی خوبی بچہ کے دل میں بٹھائی جائے۔ سفید کپڑے پہننے کا شوق دلایا جائے۔ اُس کو سمجھایا جائے کہ رنگین، ریشمی اور زرتار کپڑے پہننا عورتوں اور مخنثوں کا کام ہے۔ جو لڑکے ایسے کپڑوں کے عادی ہوں، اُن کی صحبت سے بچایا جائے۔ آرام

پرستی اور ناز ونعمت سے نفرت دلائی جائے۔ جب بچہ کوئی پسندیدہ کام کرے تو اُس کی تعریف کی جائے، اُس کا دِل بڑھایا جائے اور انعام دیا جائے۔ اِس کے خلاف کوئی بات ظہور میں آئے تو اغماض سے کام لیا جائے تا کہ بُرے کام کرنے پر دلیر نہ ہوجائے۔ اگر دوبارہ کوئی ایسا فعل سرزد ہوتو تنہائی میں نصیحت کی جائے کہ یہ بات بُری ہے، لیکن بار بار اُس کو ملامت نہیں کرنی چاہیئے۔ والدین اِس بات کا خیال رکھیں کہ ہر وقت ٹوکتے نہ رہا کریں۔ کیونکہ بار بار کے زجر وتوبیخ سے بات کا اثر کم ہوجاتا ہے۔ اور بچہ زجر وتوبیخ اور ہر وقت ٹوکنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ دِن میں سونے سے بچوں کو بچائیں۔ بستر پُرتکلف اور زیادہ نرم نہ ہونا چاہیئے۔ اِس بات کی تاکید رکھنی چاہیئے کہ بچہ کوئی کام چُھپا کر نہ کرے۔ کیونکہ بچہ اُس کام کو چھپا کر کرتا ہے جسے وہ بُرا سمجھتا ہے، اس لئے جب چھپا کر کام کرنے کی عادت چھوٹے گی، تو تمام بُرائیاں خود بخود چھوٹ جائیں گی۔ ہر روز کچھ پیادہ چلنے کی عادت ہونی چاہیئے اور کچھ ورزش بھی کروانی چاہیئے۔ تا کہ فسردگی اور سستی سے بچا جائے۔ بچوں کے پاؤں کھلے نہ رکھیں بلکہ موزے پہنائے رکھیں۔

چلنے میں بچہ جلد جلد اور تیز تیز نہ چلے۔ اگر بچہ امیر گھر کا ہے تو اُس کے ساتھی یا اُن کے والدین وغیرہ بچوں کو نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ بچے کو سمجھانا چاہیئے کہ یہ بات حوصلہ مندی کے خلاف ہے بلکہ کمینہ پن ہے۔ مجلس میں تھوکنا، جماہی لینا، انگڑائی لینا، لوگوں کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھنا، پاؤں پر پاؤں رکھنا، تھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھ کر بیٹھنا وغیرہ لغو اور ممنوع افعال ہیں۔ اسی طرح قسم کھانے سے بچہ کو روکنا چاہیئے، گو قسم سچی ہو۔ بات کرنے میں خود ابتداء نہ کرے۔ بلکہ پوچھنے پر جواب دے۔ مخاطب کی بات کو غور اور توجہ سے سنے، فضول گوئی، فُحش، دُشنام اور سخت کلامی سے بچوں کو منع کیا جائے، اور جو لوگ ایسی باتوں کے عادی ہوں، اُن کی صحبت سے بچایا جائے۔

❁❁❁

(55)

الفاظ کا صحیح استعمال

۱) ''نکتہ آفرینی'' ایک عمومی لفظ ہے۔ یعنی بہت سے لوگ نکتہ آفرینی کر لیتے ہیں۔ خصوصی رنگ کو میرے خیال میں ''نکتہ پیمائی'' کہنا چاہیئے۔ یعنی نپا تلا، مناسب اور بہت ہی موزوں اور درست۔

۲) جھوٹا پانی، جھوٹا کھانا عام طور مستعمل ہے۔ بعض لوگ اِسے جُوٹھا پانی لکھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح لفظ ''چھوٹا پانی یا چھوٹا کھانا'' ہونا چاہیئے۔

۳) قصہ نیند کا چل رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ نیند تو کاٹھ (سولی) پر بھی آجاتی ہے۔ ایک صاحب بولے شاعر تو یہ کہتے ہیں کہ نیند آگ پر لیٹنے سے بھی آجاتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے ؟ ایک اور صاحب نے تھوڑی دیر غور کیا اور فرمایا۔ جی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تو ممکن نہیں۔ دوسرے صاحب نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

رکھ کے منہ سوگیا اُن آتشیں رخساروں پر
تھا سکوں دل کو تو نیند آگئی انگاروں پر

۴)

سبھی ہم کو یہ کہتے ہیں کہ رکھ نیچی نظر اپنی
کوئی اُن سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہوکر

(اکبرالہ آبادی)

اِس شعر کا مطلب ظاہر و باہر ہے۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی اُن سے کہے ہی کیوں ؟ اعتراض کرنا ہی ہے تو صرف یہ کہہ کر بھی خاموش ہوا جا سکتا ہے کہ۔ ؎

خود سنبھلتا نہیں شباب اُن کا
تہمت ہم پہ لگائی جاتی ہے

اِس کا جواب معشوق دے ہی نہیں سکتا، ورنہ اُس کی بے لگامی اور منہ پھٹ ہونے کا تو یہ عالم ہوتا ہے کہ۔

وہ چلتے ہیں اُبھر کر مستی میں تو کہتے ہیں
نہیں کچھ مال چوری کا، چھپاؤں کیوں مَیں جوبن کو

۲۲/ ۱۲/ ۱۹۷۵ء

(56)

مکرم سید جہانگیر علی صاحب، فلک نما

ہماری جماعت کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی نسبت یہ شکایت عام ہے کہ وہ علمی مذاق سے محروم ہے، اور بُرا ہو انگلش میڈیم کا کہ یہ طبقہ اُردو لکھنے پڑھنے سے بالکل ہی نابلد ہے۔ جماعت احمدیہ کے بانی اور اِس زمانے کے مامور امام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیشتر کتب اور آپ کی تعلیمات اردو میں ہیں، پھر آپ کے خلفاء کے ارشادات، اُن کی تالیفات، اُن کے خطباتِ جمعہ، عیدین اور نکاح وغیرہ سب اُردو میں ہیں، اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اُردو مُستقبل میں ایک بڑی زبان کی شکل اختیار کر جائے گی۔ اور ہماری نسلوں کے لئے مذاہب اور مذاہب کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا بہتر اور احسن رنگ میں، صرف اُردو ہی میں ممکن ہو سکے گا، آج تمام متمدن قومیں اِس بات کو سمجھ چکی ہیں کہ ہمارے تمدن، اور ہمارے شعور و وجدان کی ترقی اور ترویج کا دارومدار ہماری اپنی مادری زبان میں تعلیم کی ابتداء کرنے اور اپنی زبان پر دسترس حاصل کرنے میں مُضمر ہے۔ یہ جو چند اربابِ قلم اُردو کا درک رکھتے ہیں اور جماعت میں لکھنے کے کام کو فروغ دینے میں مُنہمک ہیں، اُن میں ایک شخصیت سید جہانگیر علی صاحب آف فلک نما کی بھی ہے، گو زیرِ نظر یہ تالیف یعنی تاریخ احمدیت حیدرآباد دکن اُن کی پہلی سعی اور کاوش ہے، لیکن اِس کے شائع ہونے سے اس بات کا بھی ثبوت مل جائے گا کہ احمدی قوم کا علمی مذاق، کس حد تک اپنے گزرے ہوئے بزرگوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے اور علمی تصنیفات کے خیر مقدم کے لئے کوشاں اور تیار ہے۔ محترم سید جہانگیر علی صاحب جو اِس کتاب کے مؤلف

اور ناشر ہیں، موجودہ دوستوں میں ایک منتخب انسان ہیں، جنھوں نے اُن مزاحمتوں اور دشواریوں کا جو اِس تحصیل میں انھیں پیش آئیں، دلیرانہ مقابلہ کیا، اورتقریباً چارسالہ اُن کی سعی و جستجو، منصّہ شہود پر آئی، اوراب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

2006ء کی ابتداء میں جب سید جہانگیر علی صاحب میرے گھر تشریف لائے، تو ہم دونوں دیر تک زندگی کے تانے بانے، اُس کی پیچیدگی، اور تیز تر رفتار پر، اوراردوادب کے ذوق اورگرتے ہوئے مذاق پر ''کفِ الفاظ'' ملتے رہے۔ مَیں نے جب اِس کتاب کا مسودہ دیکھا، جو پروف ریڈنگ کے لئے میرے سپرد کیا گیا تھا، یونہی گمان کیا تھا کہ اُنھوں نے زندگی میں اپنے لئے اپنے سے بڑے کام کومنتخب کیا ہے، مگر ذہن میں یہ بھی تھا کہ ؎

وہ جس کے چاک گریباں پہ تہمتیں ہیں سب اُسی کے ہاتھ میں شاید ہنر رفو کا بھی ہو

اِس کتاب کے سلسلے میں محترم محمد انعام غوری صاحب، ناظرِ اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ قادیان کا ذکر نہ کرنا، ناانصافی بلکہ احسان ناشناسی ہوگی، جس غور اور دلچسپی سے اُنھوں نے مسودہ کا مطالعہ کیا اوراُس پراپنے مشورہ سے کوتاہیوں کی نشان دہی کی، ان ہی کی قامت کے نابغۂ روزگار کے قلم کا حصہ تھا۔ جواُن کے لئے کچھ بھی دشوار نہ تھا، جوکام اُنھوں نے کیا، اُس میں کسی فنی جھول کورہنے نہ دیا۔ اُن کے مشوروں کی ایک ایک سطر میں ایک ایک عہد بند ہے۔

ہمارے قدیم ساتھی اور دوست غمگسار محترم احمد عبدالحمید صاحب (واشنگٹن ڈی سی) کی ترغیب بھی اِس کام کے اُکسانے اور ہمت بندھانے میں بہت نمایاں بلکہ اول نمبر پر رہی۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ ❁❁❁

۳/نومبر/۲۰۰۷ء

تمت بالخیر